ماہنامہ

تمثیلِ نو

دربھنگہ

ہندوستانی فلمیں اور اُردو

کیسے کیسے روپ دکھاتی ہندوستانی فلم
دنیا بھر میں دھوم مچاتی ہندوستانی فلم
تصویروں میں جان عطا کر دیتے ہیں فنکار
روز نئی تاریخ بناتی ہندوستانی فلم
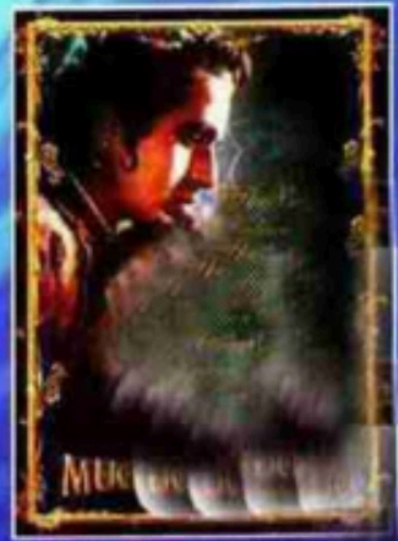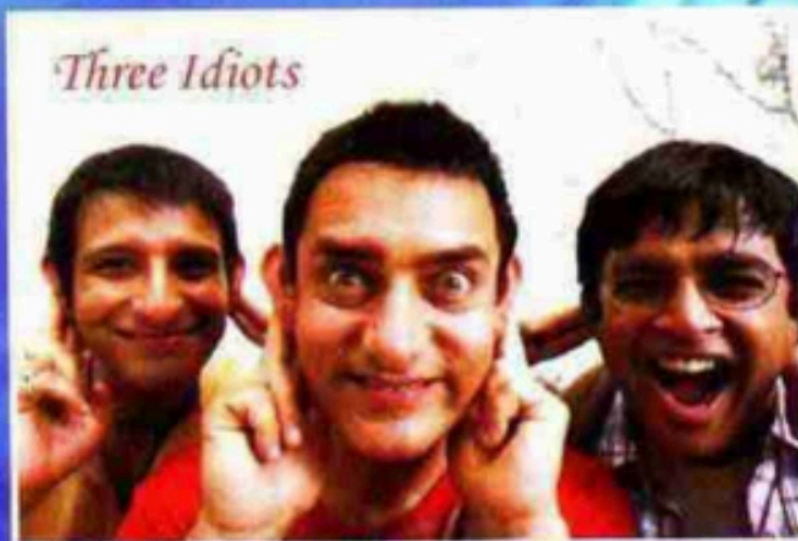
______ ڈاکٹر امام اعظم (مدیر اعزازی)

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ

جلد: ۱۰	جنوری تا ستمبر ۲۰۱۰ء	شمارہ: ۹-۱۰

زرتعاون

فی شمارہ: ۵۰ روپے، سالانہ ۱۵۰ روپے، خصوصی تعاون: ۲۰۰ روپے، تاحیات (بھارت) ۲۰۰۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۴۰۰ روپے، دیگر ممالک (سالانہ) ۳۰/امریکی ڈالر ۲۰/ پونڈ

رابطہ: ''تمثیل نو'' قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔۴، موبائل 09431085816 فون: 06272-258755
email-imamazam@webdunia.com

''تمثیل نو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حق سماعت صرف دربھنگہ کی عدلیہ میں ہوگا۔

پرنٹر، پبلشر و اونر ڈاکٹر امام اعظم نے دربھنگہ آفسیٹ پریس، دربھنگہ سے چھپوا کر
دفتر ''تمثیل نو'' اردو ادبی سرکل، محلہ: گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ۔ 846007 سے شائع کیا

ترتیب

مجھے کچھ کہنا ہے!

ہندوستان میں فلمی صنعت کی شروعات مووی فلموں سے ۱۹۱۳ء میں ہوئی اور ۱۹۳۱ء میں پہلی ناطقی فلم ''عالم آرا'' پردۂ سیمیں پر آئی۔ ہر صنعت کا فروغ بازار کی مانگ کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اس وقت ملک کے طول وعرض میں اردو زبان وثقافت کے آمیزہ سے تیار ناٹکوں اور تھیٹروں کو کافی مقبولیت حاصل تھی۔ لہٰذا پہلی ناطقی فلم کی تیاری میں عوامی مقبولیت کے اسی گراف کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ اس کی مقبولیت کے سبب فلمی صنعت پر عرصہ تک اردو کا سحر طاری رہا۔ اردو کے لب لہجہ کی چاشنی اور جذبات کی ہو بہو ادائیگی کی کیفیت سے جہاں فلموں کا جادو سر چڑھنے لگا وہیں فلموں کی بدولت برصغیر کے طول وعرض میں اردو بھی زبان زدِ عام ہوئی۔ فلموں میں کوشش کی گئی کہ زبان کو ایسے سلیس عام فہم انداز میں پیش کیا جائے جس سے کشمیر سے کنیا کماری تک اور راجستھان سے ارونا چل پردیس تک ہر شخص اس دلکش ہندوستانی زبان کو اپنانے میں کوئی دشواری محسوس نہ کرے۔ یہ بغیر کسی ادبی ملکہ کے ممکن نہیں تھا۔ فلموں میں آ کر زبان اور نکھری۔ ایسا ممکن اس لئے ہوا کہ فلموں سے جڑے افراد اور شخصیتیں ادبی پس منظر سے آئے تھے اور جتنے ممکن تجربے تھے اپنی صلاحیتوں کے حساب سے فلموں کے باصلاحیت لوگوں نے ایک طرف ادبی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف اردو کو وقت اور ضرورت کے مطابق ڈھالنے اور مزید فروغ دینے میں مدد دی کیونکہ پورے ہندوستان کے طول وعرض میں بغیر سرکاری سطح کی کوشش کے اردو نے خود کو رابطہ کی زبان کی حیثیت سے Established کیا۔

فلموں میں گیت کاروں نے طرح طرح کے تجربے کئے۔ حالانکہ سب کا Base اردو شاعری کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ اچھی شاعری کی بہتات ہے۔

اردو غزل کی روح فلمی گیتوں میں پروئی ہوئی ہے لیکن کچھ انتہا پسند ادیبوں نے ادبی شاعری اور فلمی شاعری کو الگ الگ انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے مگر ایسی بات نہیں ہے۔ ہر دور میں فلمی شاعری وقت کے تقاضوں کے عین مطابق بامِ عروج تک پہنچی جو شاعری زبان زدِ عام ہو جائے اس شاعری کو اعلیٰ شاعری مانا جاتا ہے۔ فلمی شاعری کے بہت سارے مصرعے اور شعر زبان زدِ عام ہیں۔ اس لئے ان میں ادبی عناصر موجود ہیں۔ جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری وغیرہ نے بھی فلم میں اپنے تجربے کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ فلمی شاعری کو نظر انداز کر دیا جائے اور محض Ego satisfaction کے لئے فلمی گیتوں کو کمتر درجہ میں رکھا جائے اور اس پر اعتراضات کئے جائیں، صحیح نہیں ہے۔ قیصر عثمانی نے فلمی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اعتراض کھڑا کیا ہے۔ کہتے ہیں:

شاعرِ فلم ہیں جتنے وہ ہیں تک بند فقط ۔۔۔ جوڑتے رہتے ہیں مصرعوں کے ہی پیوند فقط
اصل میں شاعر ہیں جتنے وہ تو ہیں چند فقط ۔۔۔ اچھے اچھوں کا یہاں قافیہ پیسہ دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشہ دیکھا

ان کے اعتراضات اپنی جگہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں لیکن انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

اصل میں شاعر ہیں جتنے وہ تو ہیں چند فقط

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ چند شاعروں کو ہی شاعر مان رہے ہیں۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا یہ جو چند شعرا ہیں ان کی نگاہ میں جو معتبر ہیں کیا ان کا قافیہ بھی بیسہ نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ فلمی شاعری میں موسیقی پہلے تیار کی جاتی ہے اور شعر بعد میں لکھا جاتا ہے جو غیر فطری اور روحِ شاعری کو مجروح کرنے کا عمل ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلم کے مناظر اور situation کے مطابق طرزِ موسیقی کی تعیین اور پھر موسیقی کی لے، فلم کے مناظر اور situation کے تقاضوں کے عین مطابق خوبصورت سا شعر کہنا جس میں ادبی چاشنی اور شعری لوازمات بھی موجود ہوں، فنی و ادبی ہنر مندی کا بھرپور مظاہرہ ہے۔ فلمی شاعری کی تاریخ شاہد ہے کہ جن گیتوں میں ادبی عناصر اور غزلیہ لہجہ کارفرما رہے ہیں وہ ہمیشہ ہٹ ہوتے رہے ہیں اور ان کا جادو برسوں سر چڑھ کر بولتا رہا ہے اور آج بھی جب کہ مغربی طرزِ موسیقی کا سکہ چل پڑا ہے ایسے ہی گیتوں کو مقبولیت مل رہی ہے۔ ایسا شاعرانہ کمال کے بغیر ممکن نہیں۔

چند مجبوریوں اور تقاضوں کا ذکر میں کرتا چل رہا ہوں کہ فلمی شاعری کے کینوس کو اداریہ میں سمونا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن پھر بھی اشارتاً کچھ چیزوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ شکیل بدایونی نے فلم ''چودھویں کا چاند'' میں ایک گیت لکھا جس کا مطلع تھا ''تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو، جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو'' موسیقار نے پہلے مصرعے سے ''تم'' غائب کر دیا لیکن اس کی معنویت میں کوئی فرق نہیں آیا نہ غنائیت کو ضرر پہنچا اور یہ گیت ہرذہن و زبان پر چڑھ گیا تو محض لکیر کا فقیر ہو کر سوچنے سے کسی زبان کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلی اور تغیر لانا تو غیر ادبی عمل نہیں ہے۔ ساحر کی مثال دیتا ہوں کہ لیلیٰ مجنوں فلم میں انہوں نے ایک مطلع لکھا: اس نقرئی پازیب کی جھنکار کے صدقے۔ اب پروڈیوسر نے ساحر صاحب سے کہا کہ حضور نقرئی لفظ ہٹا دیا جائے کیونکہ پروڈیوسر کی دلیل یہ تھی کہ عوام ''نقرئی'' لفظ کو سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے ساحر نے اس مصرع کو اس طرح لکھا۔ اس ریشمی پازیب کی جھنکار کے صدقے۔ اس طرح کے Compromise کرنے پڑتے ہیں اور کرنا چاہئے کیونکہ اس سے زبان کے فروغ میں مدد ملتی ہے اور ادب کے نام پر محض ثقیل، بھاری بھرکم الفاظ کو شاعری میں پرو لینا زبان کے ساتھ دشمنی ہے۔ کیونکہ عوام جس طرح الفاظ کو سمجھ کر استعمال کرتی ہے اسے بہت ہی قبل اردو والے اپناتے رہے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ غلط العوام، فصیح البیان۔ شاعری کا سب سے اہم پہلو اس کا جمال ہوتا ہے اور لفظوں میں موجود حسیت جمالیاتی ہوتی ہے اس لئے فلمی شاعری میں یہ جمال موجود ہے اور بھرپور موجود ہے۔ کسی فلمی شاعر نے لکھا ہے کہ: ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو۔ ہاتھ سے چھو کے اسے رشتوں کا الزام نہ دو۔ پیار کو پیار ہی رہنے دو کوئی نام نہ دو۔ آنند بخشی نے اپنے گیت میں لکھا ہے: چاند کے پاس جو اک ستارا ہے۔ وہ ستارا حسین لگتا ہے۔ گلزار نے لکھا ہے کہ: جو آپ تنہا مسکرا رہے ہیں۔ وہ کون سا غم ہے جسے چھپا رہے ہیں۔ انہوں نے ایک گیت میں لکھا ہے۔ تجھ سے ناراض نہیں زندگی حیران ہوں میں، تیرے معصوم سوالوں سے پریشان ہوں میں۔ مجروح نے ایک گیت میں لکھا ہے جو غزلوں پر بھاری ہے اور بھرپور غزل ہے۔ فلم ''دستک'' میں ان کا یہ گانا:

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح۔ اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

ساحر نے ایک گیت میں لکھا ہے: یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا ہے   اس رات کی تقدیر بدل جائے تو اچھا ہے   ایسے تو تم ہی نے مجھے برباد کیا ہے   الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا ہے   جس طرح سے تھوڑی سی تیرے ساتھ کٹی ہے   باقی بھی اسی طرح گزر جائے تو اچھا ہے۔

فلمی دنیا میں اردو کا بول بالا رہا ہے۔ بیشتر کہانی کار اسکرپٹ رائٹر اور اسکرین پلے رائٹر اردو کے بڑے ہی جانکار رہے ہیں۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ، گلزار، اختر الایمان، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، قادر خان، سلیم جاوید، ابراہیم اشک، مراق مرزا وغیرہ ایسے مکالمہ نگار رہے ہیں جن پر فلمی دنیا کو ناز ہے۔ مکالمہ نگاری میں ابتدائی انداز میں تھیٹر کے انداز کے مکالمے لکھے جاتے تھے اور اس میں شاعرانہ حسن و جمال ہوا کرتے تھے۔ لیکن بعد کے عرصوں میں سامنے کے ڈائلاگس لکھے جانے لگے۔ قادر خان نے اس کے بیشتر کامیاب تجربے کئے۔ پھر ڈائلاگس کا نیا Trend سلیم صاحب لائے اور وہ ایسے بولتے ڈائلاگس لائے جو کہانی کو آگے بھی بڑھاتے ہیں۔ ''شعلے'' کے ڈائلاگس اس نئے ٹرینڈ کی زندہ مثال ہے، جتنی کلاسیکی فلمیں بنیں اس میں اردو کا بول بالا رہا اور فنکاروں نے بڑی محنت کی۔ مغل اعظم کے ڈائلاگس آج بھی مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ کے ۔آصف نے مغل اعظم بنانے کے سلسلہ میں جب آخری مرحلہ پر پہنچے تو ذہنی طور پر اس کشمکش سے گذرنے لگے کہ مغل اعظم اور بادشاہ کو ویلین کی حیثیت سے پیش کرنا انہیں پسند نہیں آیا اور کچھ دنوں تک فلم کی شوٹنگ روک دی گئی۔ اور بڑی کدو کاوش کے بعد آپسی مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس کا اینٹی کلائمکس اکبر اعظم کی فراخ دلی اور عدل کی مثال بن جائے اس لئے آخری حصہ کی کہانی کا اضافہ کیا گیا۔ ''پاکیزہ'' کمال امروہی کی ایک ایسی فلم ہے جس میں نوابوں کی تہذیب کی جھلک ہی نہیں دکھائی دیتی ہے بلکہ اردو تہذیب کے وہ گوشے بھی نمایاں ہو جاتے ہیں جس پر Dialogue Delivery روانی سے پیش کیا جاتا ہے اور یہ ذمہ داری راج کمار نے ادا کی ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' مظفر علی کی تیار کردہ فلم جو مرزا ہادی رسوا کی کہانی پر بنائی گئی ہے اس میں بھی اردو کی تہذیبی لطافت، نزاکت اور شعری لوازمات کی ملاحت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور جتنی بھی کامیاب فلمیں ہوئی ہیں جیسے شطرنج کے کھلاڑی جس میں جاوید اشرف نے ڈائلاگ لکھا ہے۔ یہ ان کے فلمی کیریر کی پہلی کاوش تھی۔ یہ فلم پریم چند کی کہانی پر مبنی تھی۔ وہ بھی اردو کے جانکاروں کے لئے کافی دلچسپی کا باعث رہا ہے اتنا ہی نہیں فلموں کی کہانیاں ہوں کہ ڈائلاگس ہوں سب اردو کے سہارے زندہ ہیں۔ حالیہ فلمیں ''تھری ایڈیٹس''، ''مائی نیم از خان''، ''فنا'' وغیرہ بھی اردو کے وسیع القلبی کے شاندار نمونے ہیں۔ آج بھی جب کہ فلموں میں تحریروں کی کمیوں کا احساس پروڈیوسروں اور اداکاروں کو ہے اس خلیج کو بھرنے کی ضرورت ہے۔ اردو والوں کو مزید اس شعبہ میں اپنی تقدیر آزمائی کرنی چاہئے ورنہ ایک بڑا خلاء پیدا ہو جائے گا۔ بی آر چوپڑہ نے بہت ساری فلمیں بنائیں اور چھوٹے پردہ کے لئے مہابھارت جیسا طویل سیریل بنایا لیکن جب مکالمہ لکھنے کی بات آئی تو اس کے لئے اردو کے مشہور فنکار ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا انتخاب کیا گیا اور جیتے جاگتے ڈائلاگس جو دیکھنے میں سنسکرت نما ہیں لیکن اردو کی گہری چھاپ اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حالات کی تبدیلی کے تحت کاسٹنگ میں فلم کی زبان کا ذکر کرتے ہوئے ہندی لکھا جاتا ہے لیکن اصل میں جو زبان مقبول عام اور ذہنوں پر گہرے نقش مرتسم کرتے ہیں وہ اردو کے الفاظ سے مزین ہوتے ہیں۔ اردو کا بانکپن

ان میں دیکھا جاسکتا ہے اور اردو کے ادبی عناصر کو فلموں میں رچائے بسائے بغیر اچھی فلم، مقبول فلم اور دلچسپ فلمیں نہیں بنائی جاسکتیں۔ ''استری'' نام کی فلم میں سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے۔ زبان کی ثقالت کی وجہ سے یہ فلم ناکام ہوگئی۔

آج بھی اردو ہندوستان کے طول وعرض میں اپنی نزاکت ولطافت کی وجہ سے پسند کی جاتی ہے۔ فلم ایک تجارتی مشغلہ بھی ہے اس کی مقبولیت بہت کم نہ ہو اس لئے آج بھی فلموں میں اردو کے ادبی عناصر کی بہتات ہے۔

اسی شمارہ میں پروفیسر وہاب قیصر پر بھی چند مضامین ہیں۔ ان کی ہر دل عزیز شخصیت، تخلیقی اپج اور ناقدانہ ذہن کو محسوس کرنے میں یہ مضامین شعور اور تحت الشعور کے افق کی آغوش میں اترتے ہیں اور اچھے فنکار اور سچے انسان کو سامنے لاتے ہیں۔

تنوع اور فکری توانائی سے بھرپور یہ شمارہ ایک الگ پہچان بنائے گا۔ اس کا یقین ہے۔ آپ کے اظہار خیال سے ''تمثیل نو'' کو نئی روشنی ملتی ہے۔ اس لئے الفاظ کی اداشناسی اور انفرادی محسوسات کا انتظار ہے۔

تمثیل نو کے اگلے شمارے میں ''۱۹۸۵ء کے بعد اردو کا ہم عصر ادب'' پر گوشہ رہے گا۔ اس میں تنقید، افسانہ، ناول، نظم، غزل اور دیگر اصناف کا احاطہ کیا جائے گا۔

ادبی وثقافتی خبریں:

☆ جواں سال شاعر، ادیب اور صحافی ڈاکٹر مشتاق صدف کا تقرر ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی میں بطور پروگرام افسر ستمبر ۲۰۰۹ء میں ہوا ہے۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ اپنا کام انتہائی محنت اور دلسوزی سے کرتے ہیں۔

☆ ۲۴ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں بشیر بدر اور بھارت بھوشن کے اعزاز میں ایک باوقار تقریب منعقد کی گئی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، مہمان اعزازی ڈاکٹر فاروق بخشی اور صدر شعبۂ ہندی میرٹھ کالج ڈاکٹر ورمانے بشیر بدر اور بھارت بھوشن دونوں کے شاعرانہ کمال پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ اس موقع پر وائس چانسلر پروفیسر ایس۔ کے۔ کاک نے دونوں شاعروں کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مجوزہ کنووکیشن میں انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازنے کا اعلان کیا۔ شریک مجلس ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شارب علیم، ڈاکٹر اے۔ کے۔ چوبے، حاجی اقبال خلیل (رانچی) ڈاکٹر ارشد اقبال، ڈاکٹر گمبھیر، آفاق احمد خاں، آفتاب خاں، صالح سبزواری، انجینئر رفعت جمال، پربھات رائے۔ اروند شکلا، مسعود اختر، لکشمی نرائن سرسوتی کے علاوہ کثیر تعداد میں موجود طلباء وطالبات نے پرزور خیر مقدم کیا۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر معین شاداب نے انجام دئے اور کلمات تشکر ڈاکٹر ظفر گلزار نے ادا کئے۔

☆ ۲۵ر جنوری ۲۰۱۰ء (یوم جمہوریہ کی شام) کو 'الحاج محمد الیاس اشرف میموریل ٹرسٹ' کے زیر اہتمام 'مانو کمپلکس' الیاس اشرف نگر چندن پٹی، لہریا سرائے، دربھنگہ میں شاندار مشاعرہ ہوا جس میں پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، شمیم فاروقی، ذکی احمد، ڈاکٹر منصور عمر، عطا عابدی، منظر صدیقی، حیدر وارثی، فاروق اعظم انصاری، انام الحق بیدار، خون چندن پٹوی، منور عالم راہی، قاصر مکرپوری اور ناظم مشاعرہ ڈاکٹر امام اعظم نے شاعرانہ تعلی کی پھلجھڑیوں سے مجلس کو منور کیا۔ اس مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر اجیر الحق (آرتھو سرجن) نے کی اور

اپنے خطبہ میں محمد علی اشرف فاطمی سابق وزیر کے ذریعہ کئے گئے کاموں کی ستائش کی اور مشاعرہ کی افادیت پر روشنی ڈالی اور اپنی یاداشت سے مختلف شعراء کے اشعار پیش کئے۔ اس موقع پر علی اشرف فاطمی نے مشاعرہ کی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے مجاز و دیگر شعراء کے اشعار پیش کئے۔ انہوں نے کہا کہ ہر سال یوم جمہوریہ کے موقع پر مشاعرہ کا اہتمام کیا جائے گا اور ڈاکٹر فراز فاطمی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے میں ڈاکٹر یونس اشرف (لندن)، محمد انیس حیدر، پروفیسر اشفاق انجم، محمد مظفر حسن، ایم ریاض الرحمٰن، ڈاکٹر عمران احمد، محمد ضیاء حیدر، وکیل احمد ایڈوکیٹ، سید منظر علی، جاوید انور، شبیر احمد، ہارون رشید وغیرہ کے علاوہ چندن پٹی، جیور، باقی پور، پورکھوپٹی و دیگر گاؤں کے لوگ کثیر تعداد میں موجود تھے۔

☆ ۴ر۵رفروری ۲۰۱۰ء کو یو۔ جی۔ سی کے تعاون سے شعبۂ اردو، مہاراشٹرا اودگیر کالج میں ''مولانا ابوالکلام آزاد: حیات و خدمات'' کے عنوان سے دوروزہ قومی سیمینار اور مشاعرہ ہوا۔ صبح کے افتتاحی اجلاس سے پروفیسر شیو راج ناکاڑے صدر مہاراشٹرا ایجوکیشن سوسائٹی، پروفیسر بیگ احساس صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، ڈاکٹر یوسف اعظمی سابق ایڈ جنکٹ پروفیسر ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو، سید شان الحق بخاری نائب ضلع کانگریس کمیٹی، ڈاکٹر شرف النہار صدر شعبۂ اردو اورنگ آباد کالج آف گرلس نے پرنسپل ایم۔ یو۔ کالج کی خیر مقدمی تقریر کے بعد اجلاس سے خطاب کیا۔ دوپہر دو بجے سے سیمینار کا پہلا اجلاس شروع ہوا جس میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس (حیدرآباد)، ڈاکٹر قطب سرشار (محبوب نگر)، ڈاکٹر شرف النہار (اورنگ آباد)، ڈاکٹر خلیل مجاہد (گلبرگہ)، پروفیسر انیس الحق قمر (ناندیڑ) اور فرید احمد نہری (بیڑ) نے مقالات پیش کئے اور ساڑھے تین بجے سے شروع دوسرے اجلاس میں استاد عبدالرب (گلبرگہ)، ڈاکٹر سیدہ نسیم النساء، ڈاکٹر اشرف جاوید (اورنگ آباد)، ڈاکٹر رئیس النساء صدیقی (ناندیڑ)، ڈاکٹر اسماء تبسم (گلبرگہ) نے مقالات پیش کئے۔

اسی شب ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی کے زیر صدارت عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ پہلے مہمانان اعزازی ایڈوکیٹ گوتم بھالے راؤ، ڈاکٹر محمد عظیم الدین بخشی مینیجنگ پارٹنر ہماری ہیچرز اینڈ بریڈنگ فارمس حیدرآباد، پروفیسر منوہر راؤ پٹواری سکریٹری مہاراشٹرا ایجوکیشن سوسائٹی اودے گیر نے اردو کی دلکشی، اردو شاعری کی اثر پذیری اور اس سے اپنی دلچسپی کا تذکرہ کیا بعد ازاں ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کی نظامت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی، پروفیسر یوسف کمال، ڈاکٹر یوسف اعظمی (حیدرآباد)، ڈاکٹر قطب سرشار، مسعود عابد، (ظہیر آباد)، جمیل نظام آبادی، ڈاکٹر قمر سرور (گلبرگہ)، ڈاکٹر غلام دستگیر شیخ (شولاپور)، تمیز احمد پرواز (ناندیڑ)، ڈاکٹر حامد اشرف (اودگیر)، ڈاکٹر حشمت علی، نثار احمد کلیم، میر بیداری ابوالمختار کاتب (بیدر)، صدیق حیرت (ہمن آباد)، ڈاکٹر خلیل مجاہد (اودگیر)، ڈاکٹر زبیر احمد (وینگلور) اور ناظم مشاعرہ ڈاکٹر مقبول احمد نے اپنے کلام سے کالج کے وسیع و عریض میدان میں امڈے شائقین و سامعین کو محظوظ کیا۔

سیمینار کا تیسرا سیشن دوسرے دن ۵رفروری کو گیارہ بجے شروع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (ایوت محل)، ڈاکٹر سید شجاعت علی (ناندیڑ)، ڈاکٹر منظور احمد دکنی و ڈاکٹر شمیم سلطانہ (گلبرگہ) اور ڈاکٹر علیم اللہ حسینی (بیجاپور) نے مقالے پڑھے۔ اجلاس چہارم دوپہر کے وقت منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر مقبول احمد مقبول (اودگیر)، ڈاکٹر عبدالباری

(پونہ)، محمدی بیگم وڈاکٹر زرینہ ناہید (گلبرگہ)، سیدہ پٹیل شبینہ (عثمان آباد) اور پٹھان عطیہ خانم (اودگیر) نے مقالات پڑھے۔ شام چار بجے وجئے کمار پنسلوار سکریٹری مہاراشٹرا ایجوکیشن سوسائٹی اودگیر کی صدارت میں اختتامی اجلاس منعقد ہوا جس میں پروفیسر عبدالحمید اکبر، پروفیسر یوسف کمال، ڈاکٹر عظیم الدین بخش اور ڈاکٹر سید شجاعت علی چیرمین اردو بورڈ آف اسٹڈیز ایس۔ آر۔ ٹی۔ ایم یونیورسیٹی ناندیڑ نے جلسہ سے خطاب کیا۔

☆ سابق ڈین فیکلٹی آف ہومنٹیز ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ پروفیسر شاہ طلحہ رضوی برق کو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ویزیٹنگ پروفیسر نامزد کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنا نیا عہدہ فروری ۲۰۱۰ء میں جوائن کرلیا۔

☆ اردو کے معروف شاعر، طنز و مزاح نگار پروفیسر خالد محمود کو شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہیں ساہتیہ اکیڈمی برائے ترجمہ ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ وہ کئی علمی و ادبی اداروں سے وابستہ ہیں۔ امید ہے کہ ان کی سربراہی میں شعبہ اردو ترقی کرے گا۔

☆ ۱۱ر فروری ۲۰۱۰ء کی شام کو ساہتیہ اکادمی دہلی میں منعقد ایک پروقار تقریب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ساہتیہ اکادمی کے اعلیٰ ترین ''فیلوشپ'' سے سرفراز کیا گیا۔ اس فیلوشپ کا اعلیٰ اعزاز قبل ازیں فراق گورکھپوری، قرۃ العین حیدر، کیفی اعظمی، تاراشنکر بندھوپادھیائے، اماشنکر جوشی، امریتا پریتم، آر۔ کے۔ نارائن، راجا راؤ، نگڑی شیوشنکر پلئے، شیورام کارنتھ، سمترا نندن پنت، مہادیوی ورما، رام ولاس شرما، ودیا نواس مصر، نرمل ورما جیسی جید شخصیات کو مل چکا ہے۔ اس لئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ارباب ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ اعزاز بہت خاص ہے جب کہ میری تو کچھ حیثیت ہی نہیں۔ تنقید ویسے ہی حاشیائی سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ بغیر تنقید و تحقیق کے نہ تو تاریخ ادب کا کوئی تصور ممکن ہے نہ شعریات و درسیات کا۔ سنسکرت کا قول ہے کہ شاعری کا حسن نثر کھولتی ہے اور فارسی میں ہے کہ وشعر فہمیدن بہ از سفتن بود، یعنی شعر فہمی موتی پرونے (شعر گوئی) سے بھی بہتر ہے۔ ادب کی کوئی تصویر سخن فہمی یا تحسین شناسی کے بغیر مکمل نہیں۔ خود میرا ذہنی سفر اردو ادب کی حسن کاری اور اس کے جمالیاتی و تہذیبی ابعاد کے رازوں کو جاننے کی حقیر سی کوشش ہے۔'' لیکن صدر ساہتیہ اکادمی سنیل گنگوپادھیائے نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی باتوں کو ان کی انکساری قرار دیتے ہوئے کہا کہ: ''ساہتیہ اکادمی آج ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کو اپنے اعلیٰ ترین اعزاز سے نواز رہی ہے، جس پر جتنا ناز کیا جائے، کم ہے کہ انہوں نے نہ صرف اردو، ہندی، انگریزی بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کو فروغ دینے کے لئے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور ہندوستانی ادب کو وقار بخشا ہے۔ ان کی تحریروں سے نئی گزرگاہیں، روشن ہوتی ہیں۔'' واضح رہے کہ پروفیسر نارنگ خود بھی ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر اور صدر رہ چکے ہیں۔ یہ اعزاز ان کی ہمہ جہت خدمات کا صلہ ہے۔ سکریٹری ساہتیہ اکیڈمی کرشنا مورتی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر شافع قدوائی و دیگر نے بھی اظہار خیال کیا۔ کنوینر اردو مشاورتی بورڈ عنبر بہرائچی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر جے این یو، دہلی یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی اور دہلی کی معزز ہستیوں کے ساتھ اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کی کثیر تعداد موجود تھی۔ جن میں پروفیسر مشیرالحسن، جی کے چڈھا، سید محمد اشرف، سید شاہد مہدی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر شہریار، منورما نارنگ، ترون نارنگ، پروفیسر بیگ احساس، شمیم طارق، جینت پرمار، پروفیسر ارتضیٰ کریم، توقیر احمد

خاں، غضنفر، مخمور سعیدی، اطہر فاروقی، مولا بخش، بلراج کومل، نصرت ظہیر، پرویز شہریار، شہزاد انجم، مشتاق صدف، وسیم بیگم، موسیٰ رضا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

☆ ۱۷ر فروری ۲۰۱۰ء کو گلبرگہ یونیورسیٹی (کرناٹک) کے ۲۸ویں کنووکیشن کے موقع پر چانسلر اور گورنر کرناٹک ایچ۔ آر۔ بھاردواج نے اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ان کے علاوہ مشہور سائنسداں پروفیسر یسپال، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ یافتہ سنیما فوٹوگرافر دی۔ کے۔ مورتی، ممتاز مصور وی۔ جی اندنی، مشہور مورخ ڈاکٹر سری نواس دتی، مہاتماشری بسوالنگا پنا دیوڈا اور تھیٹر اداکار ملکھیہ منتری چندرو بھی اعزازی ڈگری سے نوازے گئے۔ بعد ازاں پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی سابق گورنر بہار، ہریانہ، نے کلیدی خطبہ دیا۔

☆ ''بزم وامق'' کولکاتا کی تجدید نو کے ایک سال مکمل ہونے پر ارباب بزم نے طے کیا کہ ہر سال ایک شاعر یا ادیب کو بزم کی جانب سے ''شاہ ادب ایوارڈ'' دیا جائے۔ لہٰذا ۱۳ر فروری ۲۰۱۰ء کی شام سات بجے سکریٹری بزم شاہد نور کی رہائش گاہ 8A/1 کنیا روڈ، کولکاتا ۳۹ پر حبیب ہاشمی کے زیر صدارت مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ آغاز مشاعرہ سے قبل صدر بزم نم اعظمی نے بزم کے پہلے ''شاہ ادب ایوارڈ'' سے مشتاق دربھنگوی کو نوازے جانے کا اعلان کرتے ہوئے مشتاق دربھنگوی کو شال پیش کیا اور حبیب ہاشمی کے ہاتھوں معینہ ایوارڈ سے نوازا۔ صدر بزم وامق نے صاحب اعزاز کی صحافتی وادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مشتاق صاحب متعدد کتابوں کے مرتب ہیں لیکن ان کی دو کتابیں ''لاالہ الا اللہ'' اور صلی علیٰ محمدؐ'' قوم وملت کے لئے سرمایۂ عظیم ہے۔ ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے لئے یقیناً موصوف بزم وامق کے ''شاہ ادب ایوارڈ'' کے مستحق ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد ممتاز شخصیتوں نے مشتاق دربھنگوی کی خدمات کا اعتراف کیا بعد ازاں شاندار مشاعرہ ہوا۔

☆ ۲۲ر فروری ۲۰۱۰ء کو قومی اردو کونسل نئی دہلی کے اشتراک سے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ''اردو فکشن میں بہار کے سماجی مسائل'' کے موضوع پر ایک قومی سیمینار منعقد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر اسرائیل رضا کے خیر مقدمی کلمات کے بعد کنوینر سیمینار ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پروفیسر امتیاز احمد ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، رکن قانون سازیہ پروفیسر اسلم آزاد، صدر اجلاس پروفیسر اعجاز علی ارشد نے خطاب کیا۔ سابق وزیر بہار پروفیسر لطف الرحمٰن نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو میں عظیم ناول نگاروں کی روایت ابھی شروع نہیں ہوئی ہے مگر جدید فکشن کا آغاز جن ناول نگاروں نے کیا ہے وہ سب بہار ہی کے تھے اور ان سب نے کسی نہ کسی سطح پر بہار کے مسائل کو ہی پیش کیا ہے۔''

سیمینار کا پہلا سیشن ۱۲ر بجے دن میں شروع ہوا جس میں اظہار خضر نے (فائر ایریا کا سماجی منظر نامہ)، ڈاکٹر حسین احمد نے (بولو مت چپ رہو، میں بہار کے تعلیمی مسائل)، ڈاکٹر حامد علی خاں نے (شوکت حیات کا افسانہ ''بانگ'' سماج کا آئینہ)، ڈاکٹر محبوب اقبال نے (انور عظیم کے افسانوں میں سماجی مسائل)، ڈاکٹر عظیم اللہ نے (بہار کے ابتدائی ناولوں میں معاشرتی حقائق) زرنگار یاسمین نے (بے جڑ کے پودے اور سماجی مسائل) اور مستفیض احمد نے (میرے ناولوں کی گمشدہ آواز) کے موضوعات پر مقالے پیش کئے۔ ۳ بجے سہ پہر کے دوسرے سیشن میں ڈاکٹر اشرف علی نے (بہار کا سماجی منظر نامہ اور دھمک)، ڈاکٹر ابوبکر رضوی نے (شکیلہ اختر کے افسانوں

میں بہار کے سماجی مسائل)، محسن رضا رضوی نے (اردو فکشن میں بہار کے سماجی مسائل)، نسیم احمد نسیم نے (اردو افسانے کا نیا مزاج اور معاشرتی مسائل)، ڈاکٹر اسرائیل رضا نے (آشا پربھات کے ناول اور بہار)، مسرت جہاں نے (مہاتما اور بہار کا تعلیمی منظر نامہ)، رضوانہ پروین نے (الیاس احمد گدی اور سماجی عکاسی)، عبدالباسط حمیدی نے (غضنفر کا ناول شوراب اور بہار کے مسائل) پر مقالات پیش کیے گئے۔ اس طرح تینوں اجلاس میں ''اردو فکشن میں بہار کے سماجی مسائل'' کو آئینہ کرتے ہوئے بہار میں ہو رہی تبدیلیوں سے شعلہ بکف مسائل و موضوعات کی طرف فکشن نگاروں اور دانشوروں کی توجہ ملتفت کی گئی کہ اس سیمینار میں طلبا و طالبات کے علاوہ اساتذہ، ادبا، شعرا، دانشواران شہر اور عمائدین شہر کی خاصی تعداد شریک رہے اور دلچسپی لی۔

☆ فروری ۲۰۱۰ء کے آخری ہفتہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی آف تھیالوجی کے زیر اہتمام ائمہ مساجد کے لئے ''امام بحیثیت سماجی رہنما'' کے عنوان سے پانچ روزہ ریفریشر کورس کا انعقاد کیا گیا۔ اس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کورس ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ڈین فیکلٹی دینیات نے افتتاحی خطاب میں کہا کہ ''عہد نبوی میں مسجد نبوی صرف عبادت کا مرکز نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے تمام سیاسی، سماجی اور دیگر مسائل کو حل کرنے کا بھی مرکز تھی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آج مساجد کا وہی کردار ہو جو صدر اسلام میں تھا اور ائمہ حضرات دینی اور سماجی رہنما کی حیثیت سے عوام کی فلاح و بہبود کے اپنے فرائض انجام دیں۔ اس پروگرام کا پہلا مقصد یہی ہے کہ ائمہ حضرات کے علم، تقویٰ اور قرأت میں اضافہ ہو اور وہ رول ماڈل بنیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملکی قوانین کو سمجھیں اور انسانی حقوق سے واقف ہوں۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ زمانے کی ترقیوں کو سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ان میں بصیرت پیدا ہو۔'' اس پانچ روزہ ریفریشر کورس میں چوبیس موضوعات پر ماہرین کے خطبات اور ائمہ کے عملی و تجرباتی پروگرام ہوئے۔ اس پروگرام سے استفادہ کے لئے مدھیہ پردیش، راجستھان اور اتر پردیش کے ائمہ مساجد کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ان حضرات نے پوری دلجمعی و دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیا۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا تربیتی پروگرام تھا جس سے ائمہ حضرات خاصے متاثر ہوئے اور کہا کہ نئی فکر و نئی روشنی لے کر ہم جا رہے ہیں۔

انشاء اللہ اس پر عمل بھی کریں گے مگر اس نوعیت کا تربیتی پروگرام تسلسل کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ میں کیے جانے کی ضرورت وقت کا متقاضی ہے۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی نے کہا کہ اس تحریک پر زعمائے ملت کو لبیک کہنا چاہیے اور توانائی عطا کرنا چاہیے۔

☆ ۱۴؍ مارچ ۲۰۱۰ء کو سہارا سوشل گروپ بھیونڈی کے زیر اہتمام مینا تائی ٹھاکرے آڈیٹوریم میں فلم و ادب کے عظیم موسیقار مرحوم نوشاد علی اور دیگر گلوکاروں اور نغمہ نگاروں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ''گاتا جائے بنجارہ'' کے عنوان سے نغمہ و موسیقی کا دلکش و شاندار پروگرام منعقد ہوا۔ اس یادگار تاریخی محفل میں جہاں ممتاز تعلیمی، علمی، سماجی و سیاسی شخصیات نے کثیر تعداد میں شرکت کی وہیں موسیقار اعظم نوشاد علی کے فرزند راجو نوشاد، عظیم گلوکار محمد رفیع کے فرزند شاہد رفیع، مجروح سلطان پوری کے فرزند عندلیب مجروح، گلوکار مہندر کپور کے فرزند روہن کپور مع اہل و عیال موجود تھے اس محفل کو گلوکار و گلوکارہ اور موسیقار یسین سید، شاہد رفیع، روہن کپور، رادھیکا اترے، سونل چھری، جے۔ پی کاکا اور سہیل اختر انصاری نے اپنے ساز و آواز سے پرکیف بنا کر سامعین کا دل لوٹا اور سہارا سوشل گروپ نے ذہنی و جسمانی طور پر معذور بچوں کے اسکول، پارس ویر

وی۔جی۔ناگنڈ اسکول کو ۲۱ ہزار روپے کا چیک دے کر مالی سہارا دیا۔

☆ ساہتیہ اکادمی دہلی نے ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے موضوع پر سہ روزہ قومی سیمینار (۱۹ تا ۲۱ر مارچ ۲۰۱۰ء) کا انعقاد کیا اس کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے نصرت ظہیر نے کہا کہ ''اردو طنز و مزاح نگار، تنقید نگاروں کو خواہ کتنا ہی تضحیک کا نشانہ بنائیں لیکن بغیر تنقید کے طنز و مزاح اپنے مرتبے کو نہیں پہنچ پائے گا۔ اردو میں طنز و مزاح پر ابھی تک تنقید نگاروں کی نگاہ نہیں پہنچ سکی ہے خصوصاً ''ہم عصر طنز و مزاح'' پر۔ صدارتی خطبہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ''معاشرے کی اصلاح کے لئے کوئی دوسرا ادبی حربہ اتنا کارگر نہیں جتنا طنز و مزاح۔ سماجی بے انصافی کے خلاف ہمیشہ طنز و مزاح کو ہتھیار بنایا گیا ہے جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ دنیا کے عظیم ادیبوں اور شاعروں کے یہاں یہ عنصر فطری طور پر ان کے اعلیٰ ادب کا حصہ ہے شیکسپیر، غالب اور کالی داس سامنے کی مثالیں ہیں لیکن وہ شاعر اور ادیب جو فقط طنزیہ و مزاحیہ ادب کے لئے خود کو وقف کر دیتے ہیں اکثر و بیشتر ان کی درجہ بندی الگ کی جاتی ہے تاہم طنز و مزاح کے ادیب ادب میں تیسرے درجے کے شہری نہیں، اگر انہوں نے اعلیٰ ادبی معیار کی پاسداری کی ہے تو وہ اسی ادبی مقام کے مستحق قرار پاتے ہیں جو شعر و ادب کی دوسری اصناف کے اعلیٰ ادیبوں کے لئے مقرر ہے۔'' افتتاحی اجلاس کے بعد تنقید و تجزیہ کا اجلاس شروع ہوا جس میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''کلاسیکی اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت'' سید مصطفیٰ کمال نے طنز و مزاح اور انشائیہ'' ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے ''اردو طنز و مزاح: اکبر الہ آبادی سے دلاور فگار تک'' کے عنوانات سے مقالے پیش کئے تو فیاض احمد فیضی نے 'ماہر تعلیم' اور عظیم اختر نے ''عزت اسے ملی جو'' اور معین اعجاز نے ''اصلی سیکولرزم بمقابلہ نقلی سیکولرزم'' کے عنوانات سے طنزیہ مضامین پیش کئے۔ آخر میں شعری نشست ہوئی جسے پاپولر میرٹھی، غوث خواہ مخواہ، ظفر کمالی، مختار ٹونکی، مصطفیٰ علی بیگ، مسرور شاہ جہاں پوری وغیرہ نے اپنے مزاحیہ کلام سے محفل کو زعفران زار بنایا۔ شعری نشست کی صدارت عنبر بہرائچی نے کی۔

دوسرے دن سیمینار کے پہلے اجلاس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے خطاب کیا جب کہ فیاض رفعت نے ''اردو میں طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری: اودھ پنچ سے تقسیم ہند تک'' الیاس شوقی نے ''اردو نثر میں طنز و مزاح کا بنیاد گزار غالب'' اور ڈاکٹر امام اعظم نے ''اردو میں طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری: تقسیم ہند کے بعد کا منظر نامہ'' کے عنوانات سے مقالے پیش کئے۔ دوسرے اجلاس میں منظور عثمانی نے ''اردو طنز و مزاح کے شمس و قمر کو ایک ناچیز کا سلام اور ساجد رشید نے ''اردو افسانہ میں طنز و مزاح'' کے عنوان سے مقالے پیش کئے جب کہ پورن سرین نے ٹیلی ویژن اور طنزیہ مزاحیہ ادب پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور مجتبیٰ حسین نے ''ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ'' پروفیسر خالد محمود نے ''سٹی بس کا سفر'' اسد رضا نے ''گھریلو شوہر'' اور ڈاکٹر حلیمہ فردوس نے ''چچا چھکن کے ''فون کی تلاش'' کے عنوان سے مضامین پیش کئے۔ شعری نشست پر مبنی آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی جس میں سید طالب خوندمیری، متین امروہوی، اسرار جامعی، امیر احمد ممکن اور اقبال فردوسی نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ کلام سے محفل کو باغ و بہار بنایا۔

تیسرے دن متعدد نشستوں میں پروفیسر بیگ احساس نے ''اردو طنز و مزاح اور فکشن: کرشن چندر اور عصمت کے حوالے سے ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اردو میں مزاح نگاری: پطرس اور شفیق الرحمن کے حوالے سے'' حقانی القاسمی نے ''طنز و مزاح میں تنوع'' ڈاکٹر مولا بخش نے ''اردو کی طنزیہ و مزاحیہ نثر معاصر منظر نامہ'' اور سیفی سرونجی نے ''اردو طنز و مزاح اور کنہیا لال کپور کے عنوانات سے مقالے پیش کئے جب کہ منظور عثمانی نے ''اب عناصر میں اعتدال کہاں اور عباس متقی نے ''کچرا'' کے عنوانات سے اپنی تخلیقات پیش کیں اور نصرت ظہیر کے نثر پارے ''جوتے کی

صحافت'' پڑھے گئے۔ پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر ارتضی کریم، نظام صدیقی، عنبر بہرائچی، اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری رینو موہن بھان، پروگرام افسر ڈاکٹر مشتاق صدف وغیرہ نے سیمینار کے انعقاد اور اس کے موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ پر ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام بنائی گئی دستاویزی فلم دکھائی گئی۔

☆ ۲۹ر۳۰ر مارچ ۲۰۱۰ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی کے تعاون سے جے۔ آر۔ ایس کالج جمالپور (مونگیر) میں ''پہلی جنگ آزادی میں اردو اب کی خدمات'' پر دو روزہ قومی سیمینار منعقد کیا گیا۔ مہمانان سیمینار کو پر کیف و مسرور کرنے کے لئے سیمینار سے قبل کی شام ان کی رہائش گاہ ہوٹل وہائٹ ہاؤس جمالپور میں ''شام غزل'' منعقد کی گئی۔ ماسٹر شالین کے ساز اور اجیت کانٹو کی طبلہ نوازی میں سریش مدھوکر، منوہر مینٹک، راکیش کمار اور محترمہ شکنتلا امرت نے غالب، فیض اور احمد فراز کی غزلوں کو آواز دی اور مہمانان ذی وقار، عمائدین، عہدیداران شہر کو مسرور و محسور کیا۔ اگلے دن ۹ر مارچ کی صبح دس بجے کالج کے نوتعمیر شدہ آڈیٹوریم میں سیمینار کا افتتاحی اجلاس ہوا جسے ڈاکٹر ڈی۔ پی یادو سابق نائب وزیر تعلیم حکومت ہند دہلی، پروفیسر لطف الرحمٰن سابق وزیر حکومت بہار، ڈاکٹر سید سراج اجملی علیگڑھ، کالج مذکور کے پرنسپل ڈاکٹر پرمود بھارتیہ اور کنوینر سیمینار ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے خطاب کیا۔ ظہر کے بعد سیمینار کا اجلاس شروع ہوا جس میں ڈاکٹر شبیر حسن نے ''پہلی جنگ آزادی میں اردو ادب کی خدمات'' ڈاکٹر سید سراج اجملی نے ۱۸۵۷ء اور حالی، ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے ۱۸۵۷ء کے چند واقعات ''خدنگ غدر'' کی روشنی میں ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے ''جنگ آزادی اور اردو صحافت''، خورشید اکرم نے ''قومی خدمات کی تاریخ اور اردو شاعری''، ڈاکٹر رضی الرحمان نے ''پہلی جنگ آزادی کا سپہ سالار: بہادر شاہ ظفر'' کے عنوانات پر مقالے پڑھے اور شام سات بجے مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر سید سراج اجملی، ڈاکٹر شیریں زبان خانم، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر پرمود بھارتیہ، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، پرویز اقبال، مرزا شکور بیگ، طارق متین، فیاض اشک نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

دوسرے دن سیمینار کے دو اجلاس ہوئے جس میں ڈاکٹر مظہر احمد نے ''امام بخش صہبائی: ۱۸۵۷ء کے ایک معصوم شہید''، ڈاکٹر منظر اعجاز نے ''تحریک آزادی میں اردو شاعری کا کردار'' ڈاکٹر ندیم احمد نے ''اردو شاعری اور ۱۸۵۷ء'' ڈاکٹر اجے مالویہ نے ''انقلاب ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفر کی شاعرانہ عظمت'' ڈاکٹر ریاض احمد نے ''تحریک آزادی اور اردو شاعری''، ڈاکٹر حسین احمد نے ''۱۸۵۷ء کی ایک ویڈیوگرافی''، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے ''پہلی جنگ آزادی اور مجاہد اردو: بہادر شاہ ظفر''، ڈاکٹر قیصر رضا نے ''پہلی جنگ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ'' ڈاکٹر شاہد رزمی نے ۱۸۵۷ء اور مرزا غالب، ڈاکٹر شریں زبان خانم نے ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور فضل حق خیر آبادی''، ڈاکٹر قمر جہاں نے ''اردو غزل: جنگ آزادی کے پس منظر میں'' ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے ''اسباب بغاوت ہند کا جائزہ اور ڈاکٹر شوکمار منڈل نے ''بھارتیہ ساہتیہ پر پرتھم سوتنتر اسنگرام کا پربھاؤ'' کے عنوانات پر مقالات پیش کئے۔ اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر لطف الرحمٰن نے کہا کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی تو ناکام ہوگئی لیکن وہ ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک ایسی آگ جلا گئی جس سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آندھی چل پڑی۔ ملک تو آزاد ہو گیا لیکن اقتدار کے بھوکے رہنماؤں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے پھر سے ذہنی غلامی کی طرف ڈھکیل دیا ہے۔ اس پر دانشوروں کو خاموش رہنا چاہیے۔

☆ ۱۸ر فروری ۲۰۱۰ کو پروفیسر وہاب قیصر انچارج رجسٹرار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کی در بھنگہ

آمد پر اردو ادبی سرکل دربھنگہ کے زیر اہتمام ایک ادبی مجلس منعقد کی گئی جس کی صدارت معروف شاعر شمیم فاروقی نے کی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے نظامت کرتے ہوئے موصوف کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ بالخصوص غالب اور سائنس، مولانا آزاد اور سائنس کے حوالے جو ان کی تصنیفات ہیں انہیں فوکس کیا۔ بعد ازاں شکیل احمد سلفی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر منصور عمر، ڈاکٹر ارشد جمیل، حیدر وارثی، پروفیسر شاکر خلیق نے علم سائنس کے حوالے سے اردو کے دو عظیم شاعر و ادیب کے فکر و فن پر کی گئی پروفیسر موصوف کی کاوشوں کو مختلف تناظر میں موضوع گفتگو بنا کر خراج تحسین پیش کیا۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا مرسلہ مضمون ڈاکٹر امام اعظم نے پڑھا جس میں پروفیسر ہرگانوی نے وہاب قیصر کی سائنٹیفک تنقید نگاری کو ایک نئی وسعت سے تعبیر کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر امام اعظم نے وہاب قیصر پر ایک نظم پیش کی اور پروفیسر عبدالمنان طرزی نے غالب کے بیکراں اور مولانا آزاد کے تبحر علمی سے سائنسی گوہر و صدف چننے کی گرانقدر کاوشوں پر منظوم جائزہ پیش کر کے محفل کو وجد آفریں بنایا۔ پروفیسر وہاب قیصر نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کا فن یقیناً ایسا ہے جو بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ اس کی معنوی تہہ داریاں بڑی عرق ریزی چاہتی ہیں۔ مجھے بھی اس منزل تک پہنچنے میں تقریباً تیس سال لگ گئے اور مولانا آزاد کے تبحر علمی کی بابت کہا کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے لگتا کہ وہ اسی کے ماہر تھے۔ دربھنگہ کا ذکر کرتے ہوئے اوراق پارینہ کے حوالے سے اردو کے تئیں اس کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ صدارتی کلمات شمیم فاروقی نے ادا کرتے ہوئے آرزو کی کہ جس طرح پروفیسر وہاب قیصر نے غالب اور مولانا آزاد کے مطالعے کو ایک ابعاد سے روشناس کرایا ہے اسی طرح مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو بھی مولانا آزاد کے تعمیری و تحریکی جذبے اور جدت پسند رجحان کا رول ماڈل بنانے کی سعی کر کے اردو کی ترقی و بقا کو ایک نئی سمت عطا کریں۔

☆ ۳ر جنوری ۲۰۱۰ء کو بھونیشور کے کلنگا اشوکا ہوٹل میں منعقد ایک ادبی تقریب میں اڑیسہ کے نامور شاعر خالد رحیم کے پانچویں شعری مجموعہ ''جمال ہم نشیں'' کا رسم اجرا ممتاز شاعر پروفیسر شہریار کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ شہریار نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''جمال ہم نشیں'' اردو کے نامور شعراء کی غزلوں کی شکل میں خالد رحیم کی شاعرانہ ہنر مندیوں کے ارتکاز کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ شہر کی معزز ادبی شخصیتوں سے بھری پڑی مجلس کے صدارتی خطاب میں پروفیسر کرامت علی کرامت نے کہا کہ ''خالد رحیم تقریباً نصف صدی سے تخلیقی ادب سے جڑے ہیں اور اڑیسہ کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مشاہیر شعرا کی غزلوں پر بے ساختہ تضمین کی اور انہیں کتابی شکل میں دیدہ وران ادب کی نذر کیا۔

☆ ۱۵ر فروری ۲۰۱۰ء کو علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام بہار اردو اکادمی نے ہال میں پروفیسر وہاب اشرفی کی صدارت میں تقریب اجراء منعقد ہوئی۔ ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کی ڈین ڈاکٹر ایس۔ کے۔ جبیں کی تصنیف ''اردو کی خواتین ناول نگار'' کی رسم اجرا سابق وزیر اعلیٰ بہار ڈاکٹر جگناتھ مشرا نے ادا کی۔ تقریب کی رسمیات پوری کرنے کے بعد ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے تصنیف مذکورہ کا تعارف و مختصر جائزہ پیش کیا، ڈاکٹر منظر اعجاز نے فرمایا کہ خواتین ناول نگاروں کی اکثر حق تلفی ہوتی رہی ہے لیکن ڈاکٹر جبیں نے اس کا ازالہ کر دیا ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ محترمہ جبیں نے ہندوستان و پاکستان کی ناول نگاری اور اہم خواتین ناول نگاروں کا عمدہ مطالعہ پیش کیا ہے اور اردو ناول نگاروں کی ارتقا کی تاریخ کا ایک باب پیش کیا ہے۔ پروفیسر طلحہ رضوی برق نے بھی محترمہ جبیں کی کاوش کو سراہا۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے ناول کو سماج کا حقیقی آئینہ قرار دیتے ہوئے ناول نگاری میں خواتین کی حصہ داری کو اجاگر کرنے کی ڈاکٹر جبیں کی کاوش کو سراہا اور کہا اس طرح کے کام سے خواتین قلمکاروں کو حوصلہ ملے گا۔ ڈاکٹر مشرا

نے کہا کہ اردو میٹھی، مہذب اور سیکولر کردار کی حامل زبان ہے۔ اسے ہر سطح پر فروغ ملنا چاہئے۔ اور سرکاری سطح پر بھی اس کا حق ملنا چاہئے۔ بہار میں حق دلانے کی کوشش میں نے کی مگر اس کی رفتار دھیمی رہی کہ یہاں کے اردو والے بھی مہاراشٹر کے اردو والوں کا سا رویہ ظاہر نہ کر سکے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے تصنیف مذکورہ کو کئی جہتوں سے مفید قرار دیا اور ڈاکٹر جبیں کو تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج اردو میں کتابیں تو بہت چھپ رہی ہیں مگر پڑھنے والے معدوم ہو رہے ہیں۔ اردو زبان وادب سے اہل زبان کی بڑھتی بے توجہی پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔

☆ ۲۱ر فروری ۲۰۱۰ء کی شام اردو بھون کے وسیع ہال میں ''اکیسویں صدی کی نرملا'' کا اجرا پروفیسر اعجاز علی ارشد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام اس تقریب اجراء کی صدارت پروفیسر شمشاد حسین نے فرمائی۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر جاوید حیات، ڈاکٹر منظر اعجاز، پروفیسر اعجاز علی ارشد اور پروفیسر شمشاد حسین نے اس افسانوی مجموعہ کی مصنفہ ڈاکٹر اشرف جہاں کے فکر وفن پر سیر حاصل گفتگو کی اور خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ محترمہ اشرف جہاں نے آج کی عورتوں کے دکھ درد کو جس طرح اجاگر کیا ہے اور مردوں کے ذریعہ استحصال کے خلاف آواز اٹھائی ہے قابل تحسین ہے۔

☆ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی میں ۱۰ر مارچ ۲۰۱۰ء کو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں ''لٹریری پینل'' کی پہلی میٹنگ ہوئی جس میں پروفیسر سیدہ جعفر (حیدرآباد)، ڈاکٹر صاحب علی (ممبئی)، پروفیسر خالد محمود (نئی دہلی)، پروفیسر قاضی افضال حسین (علی گڑھ)، ڈاکٹر امام اعظم (دربھنگہ) ممبران، جناب چندر بھان خیال (وائس چیرمین)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ (ڈائرکٹر) کے علاوہ محترمہ مسرت جہاں (ریسرچ افسر) اور ڈاکٹر محمد ٹی اے راہی نے شرکت کی۔ ڈائرکٹر این سی پی یو ایل ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اپنے یہاں چیرمین اور موجود ممبران کا استقبال کیا اور اس پینل کے تحت آنے والے مسائل پر گفتگو کی۔

☆ ۲۱ر مارچ ۲۰۱۰ء کو ہوٹل ایشین ان، جمشید پور میں سابق پرنسپل کریم سیٹی کالج، پروفیسر منظر شہاب کے زیر صدارت منعقدہ ایک شاندار تقریب میں ڈاکٹر شیریں حسنین کی تصنیف ''تعیین وتدریس'' کا اجرا سید صفدر رضی رجسٹرار کولہان یونیورسٹی کے ہاتھوں ہوا۔ پروفیسر احمد بدر نے ''تعیین وتدریس'' کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر شیریں حسنین نے اس میں پریم چند کے دور سے موجودہ دور تک کے افسانہ نگاروں اور قلمکاروں کے اسلوب وفن پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے علاوہ سید صفدر رضی اور ڈاکٹر زکریا (پرنسپل کریم سٹی کالج) نے بھی تحسینی کلمات ادا کئے۔ صدارتی خطبہ میں پروفیسر منظر شہاب نے کہا کہ تعیین وتدریس دل کے ترازو میں تولنے کے قابل ہے۔ یہ آٹھویں درجہ سے لیکر ایم۔ اے تک کے طالب علموں کی بنیاد مضبوط کرنے اور ان کی علمی لیاقت میں اضافہ کے لئے بے حد معاون ہے۔ تھوڑی کمی ہے تو بس یہ کہ اس میں مولانا آزد کی شہرۂ آفاق تحریر وتصنیف اور اقبال کے کلام زیر بحث نہیں لائے جاسکے ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر شیریں حسنین نے داستان، تنقید، غزل اور مرثیہ کے علاوہ ادب کے مختلف اصناف پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مجملہ یہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ معلومات افزا ہے۔

☆ ۲۹ر مارچ ۲۰۱۰ء کو اتکل یونیورسٹی، بھونیشور (اڑیسہ) میں محترمہ نسیمہ آرا نکہت (لکچرار، ویمنس کالج، بھدرک، اڑیسہ) کے پی ایچ۔ ڈی وائیوا کی تاریخ طے تھی۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''نذیر احمد کے اردو ترجمہ قرآن کا تجزیاتی مطالعہ'' اور اس کے گائڈ ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری اور کو گائڈ پروفیسر کرامت علی کرامت تھے۔ راقم الحروف (ڈاکٹر امام اعظم، ریجنل

ڈائرکٹر، مانو، دربھنگہ) کی حیثیت بیرونی ممتحن کی تھی۔ مذکورہ تاریخ پر وائیوا ہوا۔ اس میں ڈاکٹر سلمان راغب بھی شریک تھے۔ وائیوا سے ایک روز قبل (۲۸؍ مارچ) کو کٹک جانا ہوا جہاں ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری اپنی اہلیہ کی علالت کو لے کر ایک نرسنگ ہوم میں تھے (جن کا انتقال ۳۰؍ مارچ کو ہو گیا)۔ پھر جناب خالد رحیم کے یہاں دن کے کھانے پر شریک ہوا جہاں ایک مختصری ادبی نشست ہوئی جس میں پروفیسر کرامت علی کرامت، خالد رحیم، نور الٰہی ناطق، عبد المتین جامی، ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے اپنے کلام سنائے۔ سامعین میں سلیم اختر، رضی الرحمٰن وغیرہ تھے جنہوں نے خوب داد دی۔

☆ ۴؍ اپریل ۲۰۱۰ء کو رسم رونمائی کی ایک شام: نوشابہ اور منظر اعجاز کے نام'' کے عنوان سے ''انعکاس'' کے زیر اہتمام ڈاکٹر منظر اعجاز کی رہائش گاہ کنکر باغ پٹنہ میں ایک تقریب زیر صدارت پروفیسر وہاب اشرفی منعقد ہوئی۔ محترمہ نوشابہ خاتون کے افسانوی مجموعہ ''بالا دست'' کی رسم رونمائی ڈاکٹر عبد الصمد اور ڈاکٹر منظر اعجاز کے غزلیہ مجموعہ ''ورق ورق اجالا'' کی رسم رونمائی پروفیسر علیم اللہ حالی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے شرکاء اور مہمانوں کا استقبال کیا اور محترمہ نوشابہ خاتون کا تعارف کراتے ہوئے کہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''نقار خانہ'' ۲۰۰۶ء میں، دوسرا ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس طرح موصوف نے بہت کم عرصہ میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اکابرین کے ہاتھوں اجراء کا شرف حاصل ہونا، ان کی کامیابی اور خوش نصیبی کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، ڈاکٹر عبد الصمد اور ڈاکٹر سید احمد سہیل نے نوشابہ خاتون کی افسانہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی۔ بعد ازاں ڈاکٹر منظر اعجاز کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کا سلسلہ ڈاکٹر سید احمد سہیل کے تاثرات سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر سہیل نے اپنے پینتیس سالہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے مظفر پور کے طالب علمی سے ڈاکٹر اعجاز کے تخلیقی و تنقیدی رجحان پر روشنی ڈالی اور کہا منظر اعجاز نے آگے چل کر تنقید کی راہ اختیار کر لی مگر شاعری کو پس پشت نہیں ڈالا۔ صفدر امام قادری نے ایم۔ اے کی تعلیم کے زمانے سے اپنی رفاقت کا سلسلہ جوڑتے ہوئے ان کی شخصیت کے چند گوشے ابھارے اور کہا کہ کئی لوگ تنقید کی راہ سے چل پڑے تو شاعری پیچھے چھوٹ گئی۔ لیکن منظر اعجاز نے شاعری میں بھی اپنے لئے ایک الگ راہ نکال لی۔ ان کی غزلوں پر اقبال اور غالب کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے اختر الایمان کا حوالہ دیا کہ نثریہ فقروں میں شاعرانہ سوز و گداز پیدا کر دینا اختر الایمان کا طرۂ امتیاز تھا، منظر اعجاز کے اشعار میں بھی نثر جیسی خشکی کے باوجود سوز و ساز اور دل گداز کی کیفیت موجود ہے اور پروفیسر علیم اللہ حالی نے تو ''ورق ورق اجالا'' کے حوالے سے باقاعدہ تنقیدی مضمون نذر سامعین کیا۔ صدارتی خطبہ میں پروفیسر وہاب اشرفی نے دونوں کتابوں پر بھرپور گفتگو کی اور ''بالا دست'' کی سادگی زبان و بیان کی طرف خصوصی توجہ دلائی تو منظر اعجاز کے سلسلہ میں صفدر امام قادری کے بعض خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ منظر اعجاز کے تنقیدی اور شعری افکار و اسلوب پر پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی اور پروفیسر مرتضیٰ اظہر رضوی کی صحبتوں کا بھی اثر ہے جن سے منظر اعجاز کے گہرے مراسم تھے۔ مقامی اہل قلم اور اہل ذوق کے ساتھ ساتھ جھارکھنڈ کے ڈاکٹر سرور ساجد (رانچی) اور ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ) بھی اس تقریب میں شامل تھے۔

☆ ۵؍ اپریل ۲۰۱۰ء کو مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے وسیع ہال میں معروف شاعر و ماہر نفسیات پروفیسر شمشاد حسین نے ظفر مجیبی کے تحقیقی تذکرہ ''عندلیبان غزل'' کا اجرا کیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی۔ پروفیسر شمشاد حسین نے فرمایا کہ ''عندلیبان غزل'' بہار اور جھارکھنڈ کے منتخب غزل گو شعراء پر مشتمل ایک عمدہ تذکرہ ہے۔ اس کی افادیت آج بھی مسلم ہے اور آنے والی نسلوں اور طالب علموں کے لئے ضروری حوالے کے طور پر بھی اس کی اہمیت مستحکم رہے گی۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے کہا کہ ظفر مجیبی نے ''عندلیبان غزل'' میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۸۱ء تک کے قدیم بہار کے

منتخب غزل گو کو یکجا کر کے ایک ایسا دستاویز تیار کر دیا ہے جس سے طلبا و طالبات کے علاوہ تمام اہل ذوق ہمیشہ استفادہ کریں گے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری کے مختلف ادوار کو واضح طور پر نشان زد کرنا چاہئے تھا تا کہ عہد بہ عہد اردو غزل کے ارتقا اور مزاج کی جانکاری ہوتی۔ اسی طرح اختر الایمان ایم ایل۔ اے کشن گنج اس تذکرہ پر انہیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس میں سیمانچل کے شعراء کی نمائندگی ہوتی تو بہتر ہوتا۔ اور صدارتی خطبہ میں پروفیسر وہاب اشرفی نے فرمایا کہ "عندلیبان غزل" نہایت اہم اور مفید کتاب ہے اگر ایسی کتابیں پہلے سے موجود ہوتیں تو "تاریخ ادب اردو" لکھنے کے دوران میں کئی پریشانیوں سے بچ جاتا۔ تقریب اجرا کے بعد پروفیسر علیم اللہ حالی کی صدارت اور ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی نظامت میں مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں شان بھارتی، نہال آتش، فاروق راہب، ذکی ہاشمی، فردوس گیاوی، تفضیل احمد، منظر اعجاز، اقبال حسن آزاد، تبسم ناز، میر سجاد، شمیم قاسمی، م۔ اشرف، ناز قادری، سہیل فاروقی، چونچ گیاوی، ظفر صہبی، خورشید اکبر، صفدر امام قادری، ڈاکٹر ریحان غنی، حسن نواب حسن، خورشید کاکوی، ابوالکلام قاسمی شمسی، نظیر حیدر، اکبر رضا جمشید، شکیل حسن، آفتاب احمد، ڈاکٹر بی۔ ایچ خاں، معین کوثر، تمنا مظفر پوری، جمال رندولوی، آر۔ پی۔ گھائل اور ڈاکٹر عبدالاحد وغیرہ شریک ہوئے۔

☆ ماہر اسلامیات اور دانشور پروفیسر اختر الواسع کو دہلی اردو اکادمی کا وائس چیرمین کا عہدہ دیا گیا ہے۔ انہوں نے ۹؍اپریل ۲۰۱۰ء سے ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ موصوف اسلامک اسکالر کے ساتھ ساتھ اچھے خطیب بھی ہیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ، ڈین ہونے کے ساتھ ساتھ کئی علمی ادارہ سے وابستہ ہیں ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

☆ ۲۶؍تا ۲۷؍اپریل ۲۰۱۰ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت ملک کے تمام اسٹڈی سنٹرس کے کوآرڈینیٹرس کی میٹنگ ہوئی۔ پروفیسر خالد سعید (نگراں وائس چانسلر)، پروفیسر وہاب قیصر (نگراں ڈائرکٹر)، پروفیسر ایس۔ محمد رحمت اللہ (نگراں رجسٹرار)، اور جناب ایشوریا (افسر مالیات) مختلف شعبہ جات کے صدور، تدریسی و غیر تدریسی عملے نیز ملک کے مختلف گوشوں سے تشریف لائے ہوئے ریجنل ڈائرکٹرز ڈاکٹر شاہد پرویز (نئی دہلی)، ڈاکٹر قاضی ضیا اللہ (بنگلور)، ڈاکٹر امام اعظم (دربھنگہ)، ڈاکٹر محمد احسن (بھوپال)، ڈاکٹر حسن الدین حیدر (پٹنہ)، ڈاکٹر شیخ ابوالبرکات (ممبئی)، ڈاکٹر ارشد اقبال (حیدر آباد)، ڈاکٹر محمد فاروق اعظم اے آر ڈی (لکھنو)، ڈاکٹر صاحب سنگھ اے آر ڈی (کولکاتہ)، ڈاکٹر طارق امام، اے آر ڈی (رانچی)، ڈاکٹر عبدالغنی اے۔ آر۔ ڈی (جموں)، ڈاکٹر محمد اعجاز اشرف، اے آر ڈی (سری نگر)، مبشر احمد اے۔ آر۔ ڈی (امراوتی)، ڈاکٹر رحیل صدیقی اے آر ڈی (حیدر آباد) نے شرکت کی۔ پروفیسر وہاب قیصر کوآرڈینیٹرس کے مسائل سے روبرو ہوئے اور انہیں یقین دہانی کرائی۔ پروفیسر کے آر اقبال احمد اپنی علالت کے سبب اس میٹنگ میں نہیں آسکے ان کا پیغام آیا جسے محترمہ ڈاکٹر نکہت جہاں جو اس پروگرام کی نظامت بھی کر رہی تھیں نے پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر خالد سعید نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے جامع انداز میں کرتے ہوئے کہا کہ "...ہمارے لئے فخر کی بات ہے کہ مانو کی سرگرمیاں ملک کے گوشے گوشے تک پھیل گئیں جو ریجنل سنٹرس کے علاوہ اسٹڈی سنٹرس کے ذریعہ روبہ عمل لائی جاتی ہیں...." اسی طرح ۲۸؍اپریل ۲۰۱۰ء کو یونیورسٹی کے تمام ریجنل ڈائرکٹرس کی میٹنگ ہوئی جس میں نظامت فاصلاتی اور شعبۂ امتحانات کے افراد نے شرکت کی۔ پروفیسر خالد سعید، پروفیسر ایس۔ محمد رحمت اللہ، جناب ایشوریا، پروفیسر وہاب قیصر نے ریجنل ڈائرکٹرس کے ذریعہ پیش کئے گئے مسائل کو بغور سنا اور اس کے حل کے لئے حامی بھری۔

☆ شعبہ اردو دہلی یونیورسیٹی کے زیر اہتمام سہ روزہ جشن زریں تقریبات (۲۷ تا ۲۹ / اپریل ۲۰۱۰ء) میں مرکزی وزیر برائے صحت غلام نبی آزاد نے ''میں اردو ہوں'' کے عنوان سے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''میں اردو ہوں میں نے ملک کی جنگ آزادی میں قربانیاں پیش کیں لیکن جب ملک آزاد ہوا تو میں غلام ہوگئی۔ میں موت اور زندگی کے درمیان معلق ہوں۔ حالات کے بھنور میں گرفتار ہوں لیکن مجھے میرا کھویا ہوا مقام ضرور ملے گا۔ مجھے اکیسویں صدی انصاف ضرور دلائے گی اور اگر مجھے انصاف نہیں ملا تو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی''۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر دیپک پنٹل نے استقبالیہ پیش کیا جبکہ پروگرام کی نظامت پروفیسر ارتضیٰ کریم (صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے کی۔ وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشیت نے کہا کہ ''اردو پورے ہندوستان میں بولی جاتی ہے لیکن اس زبان کی ادائیگی جتنی خوبصورتی سے دہلی میں کی جاتی ہے نہ حیدر آباد میں کی جاتی ہے اور نہ کشمیر میں''۔ راجیہ سبھا میں ڈپٹی چیرمین کے رحمان خاں نے کہا کہ ''اردو زبان کو سرکاری سطح پر روزی روٹی سے جوڑنے کی ضرورت ہے''۔ وزیر خوراک ورسد ہارون یوسف نے کہا کہ ''دہلی حکومت نے وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت کی قیادت میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اس کے فروغ کے لئے وہ مسلسل جدوجہد کر رہی ہیں''۔ وزیر صحت پروفیسر کرن والیا نے کہا کہ اردو زبان مشترکہ زبان کی علامت ہے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شعبہ اردو کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا تفصیل سے ذکر کیا۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے دہلی یونیورسٹی کی منظوم تاریخ پیش کی۔ اس موقع پر شعبہ اردو کی جانب سے شال اور میمنٹو پیش کئے گئے۔ اس تقریب میں پروفیسر شارب ردولوی، ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر عبدالحق، ندا فاضلی، ڈاکٹر قاسم خورشید، خورشید اکبر، پروفیسر ناز قادری، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر انور پاشا، ڈاکٹر منظر حسین، ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر شاہ حسین احمد، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، پروفیسر شاہ طلحہ رضوی برق، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر قاسم فریدی، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، پروفیسر انوار الدین، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر زین رامش، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر مشتاق احمد، نند کشور وکرم، ڈاکٹر شریف احمد وغیرہ کے علاوہ شعبہ کے اساتذہ وتدریسی عملے نے شرکت کی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہ روزہ جشن زریں تقریب کے اختتام پر اظہار تشکر کے کلمات پیش کئے۔

☆ صدر جمہوریہ ہند محترمہ پرتیبھا پاٹل (وزیٹر یونی ورسٹی) نے ماہر تعلیم پروفیسر محمد میاں کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد، کا وائس چانسلر مقرر کیا ہے۔ موصوف اس یونیورسیٹی کے تیسرے وائس چانسلر ہوں گے۔ انہوں نے ۱۴ مئی ۲۰۱۰ء کو وائس چانسلر کا عہدہ سنبھال لیا۔ پروفیسر محمد میاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں بی ایس سی اور ۱۹۷۰ء میں ایم ایس سی کیا۔ ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم ایڈ کیا اور وہیں سے ۱۹۸۲ء میں پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل کی۔ وہ ۲۰۰۲ء سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تعلیمات میں پروفیسر رہے ہیں انہیں فاصلاتی تعلیم بنیادی تعلیم اور تعلیمی نظم ونسق کے شعبوں میں مہارت حاصل ہے۔ وہ تعلیم کے شعبہ میں پیش کردہ ۲۶ پی ایچ۔ ڈی مقالوں کے گائڈ رہے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ موصوف کناڈا، جاپان، ترکی، سعودی عربیہ اور انگلینڈ کے بشمول کئی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے رسالہ کتاب نما کے مینیجنگ اڈیٹر بھی ہیں۔

☆ بزم ادب، دربھنگہ کے زیر اہتمام ۲۶ مئی ۱۰ء کو سمستی پور کے ایس ڈی او اور معتبر شاعر خورشید اکبر کے ساتھ ایک شام کا انعقاد مقامی اینجل ہائی اسکول شیر محمد بھیگو کے احاطہ میں زیر صدارت پروفیسر رئیس انور کیا گیا۔ اس موقع پر دربھنگہ کے اس ڈی او سنجے کمار سنگھ، ڈپٹی کلکٹر سعد الحسن خاں، ڈی ایس سی اسپیش رنجن، اے ڈی ایم گوپال گنج

صلاح الدین خاں، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر رئیس انور وغیرہ نے مشاعرہ کی افادیت اور خورشید اکبر کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔ اس کے سکریٹری فردوس علی نے اپنی انجمن کا تعارف کرایا اور تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ نظامت ڈاکٹر و۔ قاسمی نے کی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے نئے ڈکشن کا شاعر خورشید اکبر کے عنوان سے مختصر مگر جامع مضمون پڑھا۔ اس میں جن شعراء نے اپنے کلام پیش کئے ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: ندا عارفی، احسان مکرم پوری، جنید عالم آروی، عرفان احمد بیدل، حسن انور، احمد حسن کاجل، منور عالم راہی، منظر صدیقی، انام الحق بیدار، حیدر وارثی، فاروق اعظم انصاری وغیرہ۔ مہمان شاعر خورشید اکبر نے کہا کہ جس محبت سے آپ نے ہمارا استقبال کیا اور ہماری شاعری پر اپنے خیالات پیش کئے اس کے لئے میں شکر گزار ہوں۔ انہوں نے کئی خوبصورت غزلیں پیش کیں۔ اسکول کے ڈائرکٹر عمر علی خاں نے تمام مہمانان کو شال اور گلدستے پیش کئے۔

☆ ''انڈیا لاگ'' فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک حیدر آبادی وفد نے ۲۴ر تا ۳۱ر مئی ۲۰۱۰ء ترکی کا دورہ کیا۔ ''بین مذہبی و بین تہذیبی سفر مذاکرات: ترکی ۲۰۱۰ء'' کے زیر عنوان اس دورے میں آندھرا پردیش اسمبلی کے سابق اسپیکر جناب سریش ریڈی، جناب نریندر لوتھر (سابق چیف سکریٹری، آندھرا پردیش)، سابق آئی اے ایس افسر جناب تراب الحسن، پروفیسر خالد سعید (صدر شعبہ اردو، مانو)، ڈاکٹر اے گوپال کرشنن، ڈاکٹر ستیہ پرکاش، ڈاکٹر سنجے سو بودھ، جناب وٹھل راؤ، محترمہ سنگامترا ملک، محترمہ بندی لوتھر، ڈاکٹر قرۃ العین حسن، ڈاکٹر دلنواز بر جو بھالا ڈوالا، جناب عابد عبد الواسع (پبلک ریلیشنز افسر، مانو) شامل تھے۔ وفد نے اس دوران ترکی کے تین بڑے شہروں استنبول، کونیا اور انقرہ کا دورہ کیا۔ اس دوران مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملاقات اور تبادلہ خیال کیا۔ فتح یونیورسٹی (استنبول) اور مولانا رومی یونیورسٹی (کونیا) کے اعلیٰ عہدہ داران سے ملاقات بھی کی۔ ترک پارلیامنٹ کے ڈپٹی اسپیکر جناب سوزادیکدیل سے انقرہ میں خصوصی ملاقات کا اہتمام کیا گیا تھا اور ترکی کے قابل دید مقامات جیسے حضرت ابو ایوب انصاریؓ، اور مولانا جلال الدین رومی کے مزاروں کی زیارت کے علاوہ توپ کاپی سرائے (محل جو اب میوزیم ہے) آیا صوفیا میوزیم آبنائے باسفورس کی سیر کی۔ یہ وفد یکم جون ۲۰۱۰ء کو حیدر آباد واپس آیا۔

☆ غلام مجتبیٰ رہنما نے ''عبد العلیم آسی: ایک فراموش شدہ ادبی شخصیت'' پر ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں زیر نگرانی پروفیسر رئیس انور تھیسس داخل کی تھی جس پر انہیں اپریل ۲۰۱۰ء پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

☆ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کو حکومت ہند نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر پدم شری کے خطاب سے نوازا ہے۔ موصوف ہندوستان کی جنگ آزادی کے مشہور رہنما شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کے صاحبزادہ ہیں۔ آج کل وہ مکتبہ جامعہ کے ڈائرکٹر، انجمن ترقی اردو ہند کے کارگزار صدر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری ہیں۔

☆ ایل این متھلا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی سربراہ محترمہ جمیلہ خاتون بنائی گئی ہیں۔ انہوں نے ۲۱ر جون ۲۰۱۰ء کو صدر کا عہدہ سنبھالا۔ محترمہ جمیلہ خاتون اس سے قبل ایم آر ایم کالج میں شعبہ اردو کی صدر تھیں۔

☆ شمالی کشمیر کے ضلع کپوارہ کے ۲۸ سالہ نوجوان شاہ فیصل نے سول سروسیز امتحان میں اولین پوزیشن حاصل کر کے ملک کا نام روشن کیا ہے۔ انہوں نے اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو رکھا تھا۔ وہ ایم بی بی ایس پاس کر چکے تھے لیکن انہیں آئی اے ایس بننا تھا تا کہ ملک کی خدمت کر سکیں۔ اس لئے محنت و لگن کے ساتھ تیاری کی اور والدہ کی دعائیں ساتھ تھیں، آئی اے ایس میں ٹاپ کیا۔ ان کے والد کا قتل ہو چکا تھا۔

ادارہ ان تمام حضرات کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہے!

وفیات:

☆ معروف ترقی پسند ادیب وشاعر نامی انصاری (رحمۃ اللہ نامی انصاری) ۱۰رجنوری ۲۰۱۰ء کی شب میں کانپور میں انتقال فرماگئے۔ وہ ۷۹ سال کے تھے۔ وہ ۳۱رجنوری ۱۹۳۰ءکو رائے بریلی کے موضع جائس (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ مرحوم ریلکن ملز کمپنی لمیٹیڈ کانپور میں سیلز آفسر (ایکسپورٹ) تھے جہاں سے ۱۹۹۱ء میں سبکدوش ہوئے تھے۔ نامی انصاری نے ادب اطفال میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ان کے ۳ شعری مجموعے برگ سبز، روشنی اے روشنی اور حساب جاں شائع ہو چکے ہیں۔ ''آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح'' اور ''بیسویں صدی میں طنز ومزاح'' ان کی اہم کتابیں ہیں جس سے انہیں ادبی وقار حاصل ہوا۔ ''افکار واظہار'' اور ''لہروں کے درمیان'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ انہیں کئی ایوارڈس بھی مل چکے ہیں۔

☆ کمیونسٹ رہنما اور سابق وزیر اعلیٰ جیوتی باسو کا انتقال ۱۷رجنوری ۲۰۱۰ءکو ہو گیا۔ ان کی رحلت کے ساتھ ہی کمیونسٹ تحریک کا ایک باب بند ہو گیا۔ وہ لگاتار پانچ مرتبہ منتخب ہونے والے پہلے وزیر اعلیٰ تھے۔ انہوں نے ۲۳ سال تک حکومت کی، آنجہانی کی سیاسی زندگی ایمانداری، سادگی اور ڈسپلن سے عبارت تھی۔ انہوں نے ہی کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کو یونیورسٹی کا درجہ دیا۔ ۱۹۹۶ء میں وہ ہندوستان کے وزیر اعظم بنتے بنتے رہ گئے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد جب پورا ملک فرقہ پرستی کی آگ میں جھلس رہا تھا تو انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت سے بنگال کو بچالیا۔

☆ قادرالکلام شاعر عبدالعزیز خالد (ریٹائرڈ انکم ٹیکس کمشنر) کا ۲۸ جنوری ۲۰۱۰ءکو لاہور (پاکستان) میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کو شاعری پر درک حاصل تھا لیکن ان کی مشکل پسندی نے انہیں عوام میں مقبول نہیں ہونے دیا۔ ان کی شاعری میں حمد ونعت کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ انہیں نثر سے نظم کرنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے کئی نعتیہ مجموعے فارقلیط، طاب طاب، عبدہ منحمنا حمطایا اور ماذ ماذ ہیں۔ ان کے شعری مجموعے کف دریا، ورق ناخواندہ، حدیث خواب، کلک موج، سراب ساحل اور زنجیر رم آہو مشہور ہیں۔ انہوں نے جاپانی نظموں کا غبار شبنم کے نام سے اور پرواز عقاب کے عنوان سے چینی نظموں کا ترجمہ بھی کیا۔ دکان شیشہ گراں ان کے منظوم ڈرامے ہیں۔ مرحوم فن خطاطی کے بھی ماہر تھے۔ اردو کی مشہور ادیبہ عفت موہانی مرحومہ نے ان کی ایک منظوم کتاب بھی عنایت کی تھی اور تمثیل نو کا ان سے تعارف بھی کرایا تھا پھر ان کی تخلیق بھی تمثیل نو میں شائع ہوئی۔ ان پر کامل القادری نے مہمات خالد، حسین سحر نے، خالد شخص اور شاعر اور وفا راشدی نے ''خالد: ایک نیا آہنگ'' کے عنوانات سے کتابیں لکھیں ہیں۔ حفیظ صدیقی نے رسالہ تحریریں کا عبدالعزیز خالد نمبر تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ قدیر شیدائی نے فانوس اور حفیظ الرحمٰن احسن نے سیارہ کے خصوصی نمبر شائع کئے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے ''ارمغان خالد'' کے عنوان سے گیارہ سو صفحات پر مشتمل کتاب شائع کی ہے۔ مرحوم درویش صفت انسان تھے۔

☆ ممتاز صحافی موہن چراغی یکم فروری ۲۰۱۰ءکو حرکت قلب بند ہو جانے سے کولکاتہ میں انتقال کر گئے۔ آنجہانی نے ۲۰ سال قومی آواز میں اپنی خدمات انجام دیں اور اخبار کو وقار بخشا۔ یہ اخبار مارچ ۲۰۰۷ء میں بند ہو گیا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے صحافیوں میں ڈاکٹر شاہد پرویز، نصرت ظہیر، فرحت احساس، ڈاکٹر محمد ظفر الدین، چندر بھان خیال، شمس الحق عثمانی، سہیل انجم، ایم۔ ہاشمی، منصور آغا، سید اجمل حسین، عالم نقوی وغیرہ شامل ہیں جو مختلف شعبہ جات میں اپنی خدمات بہ احسن انجام دے رہے تھے۔ آنجہانی موہن چراغی اردو روزنامہ ''آئینہ'' اور انگریزی روزنامہ ''نیشنل

ہیر اللہ“ سے بھی وابستہ رہے۔ کشمیر کی سیاست پر ان کی کتاب ”برف میں آگ“ بیحد مقبول ہوئی۔ انہیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے نیشنل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ قومی آواز اردو کا بڑا اخبار تھا اور اسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ پٹنہ میں بھی اس کا دفتر تھا جو ۱۹۹۰ء کے آس پاس بند ہو گیا تھا اور راقم الحروف بھی عرصہ تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔

☆ معروف صحافی اور کالم نویس محفوظ الرحمٰن کا انتقال ۶ رفروری ۲۰۱۰ء کو ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔ وہ اعظم گڑھ کے ناری گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مسلم مجلس مشاورت کے اخبار قائد سے اپنا صحافتی سفر شروع کیا۔ وہ مجلس کے جوائنٹ سکریٹری بھی رہے۔ دہلی آنے کے بعد سہ روزہ ”دعوت“ سے منسلک ہو گئے اور عرصہ تک اس کی ادارت سنبھالی۔ راشٹریہ سہارا میں وہ کالم بھی لکھتے رہے۔ ملی موضوعات پر مرحوم کی بڑی گہری نظر تھی۔ ممبئی کے قیام کے دوران ہندی روزنامہ نو بھارت ٹائمز سے وابستہ رہے۔ ہما ڈائجسٹ میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ پولینڈ اور روس کے سفارتخانہ میں بطور مترجم کام کیا۔ دہلی اردو اکیڈمی نے ۲۰۰۷ء میں انہیں ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔

☆ اردو کے معروف افسانہ نگار اور ناول نگار شفق (شفیق احمد خاں) کا انتقال ۲۸ رفروری ۲۰۱۰ء کو بنارس میں ہو گیا۔ جہاں وہ علاج کے سلسلہ میں گئے تھے۔ وہاں سے ان کا جسد خاکی سہسرام لایا گیا جہاں یکم مارچ ۲۰۱۰ء کو تدفین عمل میں آئی۔ ان کے ۴ افسانوی مجموعے کٹی ہوئی زمین، سگ گزیدہ، شناخت اور وراثت اور دو ناول کانچ کا بازیگر اور بادل شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ شفق کی ولادت ۱۹ رفروری ۱۹۴۵ء کو سہسرام میں ہوئی اور ایک کالج میں صدر شعبہ اردو رہے۔ پھر شیر شاہ کالج سہسرام میں عرصہ تک پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے پی جی شعبہ اردو میں پروفیسر رئیس انور نے ایک سیمینار کرایا تھا جس میں خاکسار نے ان کے ناول بادل پر مضمون پیش کیا تھا جو کافی سراہا گیا تھا۔

☆ معروف شاعر، ادیب اور اردو اکیڈمی دہلی کے سابق سکریٹری مخمور سعیدی (سلطان محمد خاں) کا انتقال ۲ر مارچ ۲۰۱۰ء کو جے پور میں ۵ ربجے شام میں ہو گیا۔ مرحوم چند روز قبل علیل ہو گئے تھے جنہیں یکم مارچ کو علاج کے لئے دہلی سے جے پور لے جایا گیا جہاں وہ ابدی نیند سو گئے۔ ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی گاؤں ٹونک (راجستھان) لے جایا گیا جہاں ۳ رمارچ کو ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم این سی پی یو ایل کے ماہنامہ ”اردو دنیا“ اور ”فکر و تحقیق“ کی ادارتی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دے رہے تھے۔ ان کی ولادت ۳۱ ردسمبر ۱۹۳۴ء کو ٹونک میں ہوئی۔ مرحوم ۱۹۵۳ء سے دہلی میں مقیم تھے اور ادبی و علمی سرگرمیوں میں بیحد مصروف تھے۔ مشاعرہ کے مقبول شاعر تھے۔ دربھنگہ کے مشاعرہ میں کئی بار شرکت کر چکے تھے۔ وہ ہفت روزہ ایشیا، ریاست اور ہماری زبان کے ساتھ ساتھ ماہنامہ جمالستان، شعلہ و شبنم، تحریک، گلفشاں، نگار، ایوان اردو، امنگ اور ماہی نخلستان کی ادارت سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ مخمور سعیدی کے دس شعری مجموعوں کے علاوہ ۴ نثری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ ”راستہ اور میں“ پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی انہیں مل چکا ہے۔ انتقال سے چند ماہ قبل این سی پی یو ایل کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بیحد خلیق انسان تھے۔

☆ اردو کی معروف شاعرہ اور صحافی محترمہ نور جہاں ثروت کا انتقال ۷ راپریل ۲۰۱۰ء کو دہلی کے نرسنگ ہوم میں ہو گیا۔ وہ ۲۸ رنومبر ۱۹۴۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے اپنا صحافتی کیریئر پندرہ روزہ سیکولر ڈیموکریسی سے شروع کیا۔ آل انڈیا ریڈیو میں براڈ کاسٹر بھی رہیں اور ادبی انٹرویوز کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کالج میں بطور لکچرر ۱۹۷۴ء میں بحال ہوئیں۔ قومی آواز دہلی سے جب شائع ہوا تو اس کی بنیادی رکن بھی رہیں اور مشہور

صحافی عشرت علی صدیقی کی زیر پرستی اپنی صحافتی کیریئر کو سنوارا اور ہفتہ وار ضمیمہ کی ادارت میں رہیں۔ ان کا شعری مجموعہ بے نام شجر (۱۹۹۵ء) شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں صدر جمہوریہ ہند آنجہانی شنکر دیال شرما کے ہاتھوں ایک کتاب کے اجرا کے موقع پر مرحومہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ شاہد ماہلی صاحب کی دعوت پر جناب مظہر امام کے ساتھ مجھے بھی وہاں جانے کا موقع ملا تھا۔

☆ پاکستان کے مشہور اسلامی اسکالر اور مفسر قرآن ڈاکٹر اسرار احمد کا انتقال ۱۳/اپریل ۲۰۱۰ء کی صبح کو ہوگیا۔ وہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو ہریانہ ضلع کے حصار (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ مرحوم ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر تھے اور پھر انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے اسلامیات میں ایم۔ اے۔ بھی کیا تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے جماعت اسلامی کی فکر سے قریب تھے اور اس کے شوریٰ کے بھی رکن تھے بعد میں وہ اس سے الگ ہو گئے اور احیائے دین میں مصروف ہوگئے اور وہ قرآنی فکر کے ترجمان بن گئے۔ ای۔ ٹی اور قیو۔ ٹی وی پر ان کو تمام لوگ قرآنی موضوعات پر خطاب کرتے ہوئے سنتے اور دیکھتے تھے۔

☆ ممتاز مارکسی نقاد اور دانشور پروفیسر محمد حسن کا انتقال ۲۴/اپریل ۲۰۱۰ء کی شب میں ہوا اور ۲۵/اپریل کو دہلی گیٹ پر واقع قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کی ولادت ۱۹۲۶ء کو مراد آباد میں ہوئی تھی۔ مرحوم کی اردو، ہندی اور انگریزی میں ۵۰ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، ادبیات شناسی، اردو ادب میں رومانوی تحریک، ادبی سماجیات، ادبی تنقید، عرض ہنر، میرے اسٹیج ڈرامے، اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ ہندی ادب کی تاریخ، مرزا سودا کے تنقیدی مراسلات، اقبال اور طرز خیال قابل ذکر ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار رہے۔ دہلی یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر پھر کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سربراہ ہوئے۔ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۱ء تک جے این یو میں پروفیسر اور پھر پروفیسر ایمریٹس رہے۔ انہوں نے ''عصری آگہی'' کے نام سے رسالہ بھی نکالا تھا۔ ان کی صلاحیت کے سبھی معترف تھے۔ راقم الحروف سے خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سیمینار میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ان سے میں نے آٹوگراف بھی لیا تھا جو آج بھی محفوظ ہے۔

☆ معروف شاعر اور صحافی جناب نظر ایٹوی کا انتقال یکم مئی ۲۰۱۰ء کو آگرہ میں ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی۔ وہ جبل پور کے مشاعرہ سے واپس اپنے گھر پہنچے جہاں ان کی طبیعت خراب ہوئی اور دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ انہیں ۲/مئی کو پوپری (سیتامڑھی) میں مشاعرہ پڑھنا تھا۔ ان کے انتقال کی خبر اسی وقت پھیل گئی چونکہ اس مشاعرہ کی صدارت بھی انہیں کرنی تھی۔ اس مشاعرہ میں کشن گنج کے ان کے دوست اور مقبول شاعر شاہد یوسفی کو بھی جانا تھا جب ان کی رحلت کی خبر ملی۔ انہیں بیحد صدمہ ہوا اور وہ بھی مشاعرہ میں نہیں گئے۔ نظر ایٹوی کا مولد ایٹہ ہے لیکن وہاں وہ زیادہ دن نہیں رہے۔ دہلی کا رخ کیا جہاں ۱۹۹۰ء تک رہے۔ دہلی سے ایک اخبار مراسم نکالا وہاں سے فیروز آباد آ گئے۔ یہاں سے بھی اخبار ''لکیر'' نکالا۔ وہاں بھی انہیں سکون نصیب نہیں ہوا۔ حنا تیموری کو مشاعرہ کی مقبول شاعرہ بنانے میں ان کا اہم رول ہے۔ مرحوم کے شعری مجموعے ''سیپ''، اور ''پلکیں'' کافی مقبول ہوئے۔ حفیظ بلیاوی نے ان پر ایک کتاب ''نظر ایٹوی: ایک نظر'' ترتیب دی۔ مرحوم نے آگرہ کو اپنا وطن بنا لیا جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

☆ معروف جدید شاعر صحافی اور ادیب عبداللہ کمال کا ۱۸/مئی ۲۰۱۰ء حرکت قلب بند ہو جانے سے ۶۴ سال کی عمر میں ممبئی میں انتقال ہوگیا ان کی ولادت ۷ اپریل ۱۹۴۹ء کو مظفر پور میں ہوئی۔ وہ عرصہ سے ممبئی میں مقیم تھے۔ ان

کا وطن سیتامڑھی بہار تھا۔ ان کے دو شعری مجموعے ''میں'' (۱۹۷۳ء) اور ''بے آسماں'' (1991) شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ شب کے دیوار میں روزن (شعری مجموعہ) زیر ترتیب ہے۔ غلام آرزو حیات اردو کارنامے (نثر) بھی زیر ترتیب ہے۔ ان کی دو بیویاں زریں کمال جن سے ۵ بچے اور شریں کمال جن سے دو بچے ہیں۔ وہ اردو ادبی سرکل قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں ۱۹۹۰ء میں تشریف لائے۔ ڈاکٹر منصور عمر، جناب شہیر امام، عبدالمعبود آمر، و دیگر دفتر میں موجود تھے۔ ان کی شاعری سننے کا موقع ملا۔ آزاد غزل کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ بابری مسجد کی شہادت پر ان کا طویل مکتوب ملا جس کو پڑھنے کے بعد آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ خط ہماری فائل میں موجود ہے۔ ۲۰۰۱ء میں انجمن باشندگان بہار، ممبئی کے کل ہند مشاعرہ میں ان سے ملاقات نہیں ہو سکی صرف فون سے بات ہوئی۔ انہوں نے ڈاکٹر شاکر خلیق، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر منصور عمر اور ڈاکٹر امام اعظم کو اپنے یہاں مدعو بھی کیا تھا لیکن وقت کی کمی کے سبب ان کے یہاں نہیں جا سکے۔ تمثیل نو ان کے پاس باقاعدگی سے جاتا تھا۔ مرحوم دہلی میں گوپال متل کے رسالہ تحریک سے بھی وابستہ تھے۔ انہوں نے ممبئی سے ایک اخبار ''اخبار وطن'' اور رسالہ ''بنت حوا'' بھی نکالا تھا۔ راج کھوسلہ کے معاون کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

☆ اردو کے مشہور شاعر اور ادیب پروفیسر منشاالرحمٰن خاں منشا کا ۲۷ رمئی ۲۰۱۰ء کو ناگپور میں انتقال ہو گیا جہاں وہ مقیم تھے۔ مرحوم مہاراشٹر کے ضلع بلڈانہ کے موضع پیپل راجہ میں ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۶ سال تھی۔ منشاالرحمٰن خاں منشا ۱۹۵۵ء میں مورس کالج ناگپور میں لکچرار ہوئے اور ۱۹۸۲ء میں شعبۂ اردو و فارسی کے صدر مقرر ہوئے۔ ان کی تقریباً ۲۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں جیون ترنگ، نوائے دل، ستاروں کی دھرتی اور آئینۂ اقبال شامل ہیں۔ مرحوم بیحد خلیق اور مرنجا مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ ۱۹۸۸ کے آس پاس ایل این متھلا یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر سید ضیاء الرحمٰن صاحب کے وائیوا میں منشاء الرحمٰن خاں منشا تشریف لائے تھے۔ وائیوا پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن صاحب مرحوم کی زیر نگرانی تھا۔ شام کے حصہ میں پروفیسر قاضی انصار الحق (سابق رجسٹرار ایل این ایم یو) کی رہائش گاہ میر نجن میں ایک ادبی نشست ہوئی تھی۔ جس میں مظہر امام، اویس احمد دوراں، پروفیسر سید ضیاء الرحمٰن وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ مرحوم پہلی بار دربھنگہ میں تشریف لائے تھے۔

☆ معروف شاعر و ادیب سید عاشور کاظمی کا لندن میں طویل علالت کے بعد ۶ رجون ۲۰۱۰ء کو انتقال ہو گیا۔ مرحوم ترقی پسند ادبی تحریک کی شمع برطانیہ میں روشن کئے ہوئے تھے۔ وہ اس تحریک کے ۷۵ سال مکمل ہوتے پر لندن کے دوسرے شہروں میں جشن اردو منعقد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی اصناف پر طبع آزمائی کی۔ وہ ایک اچھے ظرافت نگار بھی تھے۔ سخن گسترانہ بات اور چھیڑ خوباں سے طنز و مزاح انشائیے (خاکے) اور ان کے شعری مجموعہ ''حرف حرف جنوں، جس میں صرف غزلیں ہیں۔ حمد، نعت منقبت اور سلام کے مجموعوں میں چراغ منزل اور صراط منزل شائع ہو چکے ہیں۔ فسانہ کہیں جسے ''ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر'' ''بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں'' ''بیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل مغربی دنیا میں'' ان کی یادگار تحریریں ہیں۔ انہوں نے برطانیہ میں اردو کی تاریخ لکھی جس کی بیحد پذیرائی ہوئی۔ وہ دہلی اکثر آیا کرتے تھے۔ ۲۰۰۱ء میں وہ دہلی آئے تھے اور ان سے ہماری ملاقات ہوئی تھی اور تمثیل نو بھی ان کے یہاں جاتا تھا۔ سید عاشور کاظمی ادبی تاریخ نویسی کے ساتھ ساتھ مرثیہ پر اپنی یادگار کتابیں ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' ''اردو مرثیے کا سفر (۱۶ ویں صدی سے ۲۰ ویں صدی تک)'' اور ''۲۰ ویں صدی کے اردو مرثیہ نگار'' چھوڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی تازہ کتاب ''ادب اسطور

اور آفاق'' میں ان پر ایک وقیع مضمون ''عاشور کاظمی اور مرثیے کا تجدیدی سفر'' شامل ہے۔

☆ اردو اور عربی کے ممتاز محقق، اسکالر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو (عمر تقریباً ۸۶ سال) کا انتقال ۳۰ رجون ۲۰۱۰ کو علی گڑھ میں ہو گیا۔ پروفیسر مرحوم ۱۴ نومبر ۱۹۲۴ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن رسول پور نظرا ضلع پٹنہ تھا اور نانیہال استھانواں ضلع نالندہ۔ مرحوم نے کئی کمروں پر مشتمل ایک شاندار لائبریری قائم کی تھی جس میں اردو، فارسی، عربی کی نایاب و نادر کتابیں بڑے سلیقہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے پاس تمثیل نو باقاعدگی سے جاتا تھا اور وہ اسکی رسید ضرور بھیجتے تھے۔ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے جرمنی، فرانس، ترکی، شام، لبنان، عراق، پاکستان کا سفر کیا۔ ان کے تحقیقی مقالوں کو اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہیں صدر جمہوریہ ہند سے سرٹی فیکٹ آف آنر سے نوازا جا چکا تھا۔ نیز کئی اداروں نے انہیں ایوارڈ بھی دئے تھے۔

مرحوم مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی پٹنہ کے بانی وائس چانسلر تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر کے عہدے سے کئی برس قبل سبکدوش ہو چکے تھے۔ اردو کے علاوہ عربی میں ان کے گرانقدر کام ہیں۔

مرحوم کے والد حضرت مولانا ظفر الدین احمد جید عالم تھے اور وہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں عرصہ تک پرنسپل رہے۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے شروعاتی تعلیم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے حاصل کی تھی۔ مرحوم کے اندر خاکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ جس سے بھی ملتے لپک کر ملتے۔ ان کی رحلت سے تحقیق کا ایک باب بند ہو گیا۔

ادارہ ان حضرات کی رحلت پر اپنی سوگواری کا اظہار کرتے ہوئے دعائے مغفرت کرتا ہے!

..........امام اعظم

امان خاں دلؔ، نیویارک (امریکہ)

حمدِ باری تعالیٰ

رفعت خدائے پاک کی ہے جس کمال کی
واں تک پہنچ نہیں ہے کسی کے خیال کی

دستِ طلب بڑھا کے کوئی خود بھی دیکھ لے
"اُس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال کی"

دیتا ہے گر کسی کو خدا زخمِ زندگی
صورت نکالتا ہے وہی اِندمال کی

قدرت سے جس نے خلق کیا کُل جہان کو
تعریف ہو زباں پہ اُسی ذوالجلال کی

یارب! ترے کمال کا کیسے شمار ہو
حد ہی نہیں ہے جب کوئی تیرے کمال کی

شائد اسی ادا پہ خدا بخش دے مجھے
روزِ حساب فکر ہے اپنے مآل کی

اک تُو ہے اے خدا کہ نہیں جس کو ہے زوال
باقی تو سب پہ آئے کی ساعت زوال کی

ہر ذرّہ کائنات کا شاہد ہے اے خدا
ہے روشنی ہر ایک میں تیرے جمال کی

جس دم بھی جی میں آئے، خدا سے دعا کرو
اِس میں تو کوئی قید نہیں ماہ و سال کی

روقِ حرام کی کبھی اے دلؔ طلب نہ ہو
تا عمر دے خدا مجھے روزی حلال کی

نجم عثمانی، واسع پور، دھنباد ۸۲۶۰۰۱ (جھارکھنڈ)

نعتِ پاک

گُل کی، بوٹے کی، نہیں برگ وثمر کی خوشبو
یہ ہے آقاؐ کی عنایت کی نظر کی خوشبو

کس قدر ہے کشش انگیز سفر کی خوشبو
کوئے محبوبؐ کی، اللہ کے گھر کی خوشبو

تا قیامت دل انساں کو کرے گی مسحور
آپؐ کے طرزِ تخاطب کے اثر کی خوشبو

بولہب کے لئے انگشت ہوئی راحت بخش
کیا اثر رکھتی ہے آمد کی خبر کی خوشبو

غنچۂ خوف خدا ہے دل مومن میں کھلا
آپؐ نے بخشی ہے اللہ کے ڈر کی خوشبو

میں جو پڑھتا ہوں درود آپؐ پر اے ختم رُسُل
پھیل جاتی ہے فضا میں مرے گھر کی خوشبو

نجمؔ یہ باغِ ارم کی بھی فضاؤں میں کہاں
کوئے طیبہ میں ہے جو شام وسحر کی خوشبو

☆☆☆

پروفیسر نظیر صدیقی کا مکتوب

(۲۷)

۱۴ جنوری ۱۹۹۸ء: برادر عزیز السلام علیکم آپ کا خط مورخہ ۲۱ دسمبر مجھے ۵ جنوری ۹۸ کو ملا۔ یہ جان کر کوفت ہوئی کہ "پروین شاکر کے خطوط" آپ تک نہیں پہنچی۔ چونکہ وہ کتاب By Surface Mail بھیجی گئی ہے اس لئے اس کے پہنچنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ بہر حال اگر اس خط کے پہنچنے سے پہلے نہ پہنچی ہو تو میں کراچی سے اس کی جلدیں منگا کر اسلام آباد سے روانہ کروں گا۔ اب میری ہر کتاب آپ تک پہنچنی چاہئے۔

برادرم مظہر امام کی کتاب دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بہت اچھی چھپی ہے۔ مضامین بھی اچھے ہیں۔ ان کے نام خط بھیج رہا ہوں۔ کچھ اور خطوط بھی ہیں۔ ان سب کو By air بھیج دیں تا کہ جلد پہنچیں اور میرا ایک کام جلد سے جلد انجام پا سکے۔ آپ کے پاس شمس الرحمٰن فاروقی کا پتہ تو ہوگا۔

دہلی میں غالب سیمینار تو ہوا۔ پاکستان سے بھی کچھ لوگ مدعو تھے جو گئے تھے۔ میری ذات میں کوئی interested ہوتا تو مجھے بھی بلوا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ اٹلی میں بیٹھ رہے۔ شاید وہ سیمینار میں آئے ہوں تو آئے ہوں۔ کسی سے شکایت کا محل نہیں ہے۔ اگر کوئی بلائے تو احسان ہے۔ مظہر امام سے معلوم کیجئے کہ ڈاکٹر نارنگ غالب سیمینار میں شریک تھے یا نہیں اور پاکستان سے کون لوگ مدعو تھے۔

مجھے یگانہ چنگیزی پر معصوم رضا راہی کی کتاب کی ضرورت ہے۔ لکھنے کو تو میں نے افتخار امام (بمبئی) کو بھی لکھا ہے لیکن ان کی طرف سے امید نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر آپ بھیج سکیں تو بھیج دیں۔ مجھ پر پی ایچ۔ ڈی کا جو کام مظفر پور یونیورسٹی میں ہوا اس کے کتابی شکل میں چھپنے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ مقالے کے لکھنے والے اور ان کے گائڈ دونوں میں سے کوئی بھی میرے خطوں کو جواب نہیں دیتا تھا اس لئے میں نے دونوں سے خط و کتابت ترک کر دی۔ میں فیاض رفعت صاحب سے واقف نہیں تھا۔ آپ کے ذریعہ تعارف ہوا۔ انہیں میرا اسلام لکھئے گا۔ معصوم عزیز کاظمی صاحب کو بھی میرا اسلام پہنچا دیا کریں۔ کاش تمام نظیر شناسوں کا دیدار ہو سکتا۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ شہزاد منظر ۱۹ ر دسمبر ۹۷ کی صبح کو انتقال کر گئے۔ ان کی صحت دو ایک سال سے خراب تھی۔ انتقال سے پہلے ان کی دو کتابیں منظر عام پر آ گئیں۔ (۱) اردو تنقید کے پچاس سال جلد اول، جلد دوم کا آغاز انہوں نے مجھ پر چالیس صفحات کا مضمون لکھ کر کیا تھا۔ اس پر وہ نظر ثانی کر سکے نہ کہیں چھپوا سکے۔ دوسری کتاب اردو افسانے کے پچاس سال۔ انہوں نے اردو ادب پر خاصا کام کیا ہے۔ آپ کی نظر سے ان کی کچھ تحریریں گزری ہوں گی۔ چند سطریں ادب در بھنگہ کے بارے میں:

''رسالہ ادب دربھنگہ کا پہلا شمارہ نظر سے گزرا۔ اگر چہ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ طباعتی معیار کے اعتبار سے بہار آج بھی وہیں ہے جہاں پچاس سال پہلے تھا لیکن اس خیال سے خوشی ہوئی کہ اس رسالے کے ذریعے دربھنگہ بلکہ بہار کی نئی ادبی نسل سے ملاقات ہوئی۔ بہار میں Talent کی کمی کبھی نہیں رہی۔ البتہ اس کے صحیح نشو ونما کے لئے صحیح ماحول کا فراہم ہونا ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے۔ امید ہے کہ نئی نسل اس مسئلے کو بھی حل کرے گی۔ اس رسالے کے مندرجات معیاری ہیں۔ اس رسالے کو بہار کا ایک نمائندہ رسالہ بننے دیر نہیں لگے گی۔

'بادبان' کے ایڈیٹر بھی خط وکتابت میں بہت سست ہیں۔ افتخار اجمل شاہین سے کہئے کہ وہ ذاتی طور پر ل کر آپ کا پتا ان کے ہاں درج کرائیں۔

اچھا اب اجازت۔ ڈاک کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ تمام احباب سے سلام کہئے۔

آپ کا

نظیر صدیقی

پروفیسر سید منظر امام، فاطمہ ہاؤس واسع پور، دھنباد۔۸۲۶۰۰۱ (جھارکھنڈ)

یہ سرگزشت ہی ہے

(آٹھویں قسط)

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میری دلچسپیاں فلم سے زیادہ ہیں یا ادب سے۔ حالانکہ اب سنیما گھروں میں جا کر فلم دیکھنے کا شوق بہت کم ہو گیا ہے۔ لیکن فلم کے متعلق کتابوں اور رسائل کے مطالعہ سے دلچسپی ہنوز برقرار ہے۔

ادب سے قربت اور فلموں سے عشق بڑے بھائی حسن امام درد اور مظہر امام کا ودیعت کردہ ہے۔ ہمارے یہاں ادبی کتابوں اور جرائد کے علاوہ فلم جرنلز بھی کافی آتے تھے۔ اس وقت کے مشہور فلمی ماہ نامے Film India اور Sound امیر منزل میں پابندی سے آیا کرتے تھے اور اپنے دونوں بھائیوں کو بڑے انہماک سے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ میں چوری چھپے ان رسالوں کی ورق گردانی کرتا اور ان کے معنی سمجھنے کی سعی کرتا۔

ممکن ہے یہ بات عجیب سی لگے لیکن حقیقت ہے کہ تھوڑی بہت انگریزی جو مجھے آتی ہے وہ فلم انڈیا، ساؤنڈ، فلم فیئر، اسکرین، اسٹار ڈسٹ اور سنے بلٹز پڑھنے کی وجہ سے۔ حالانکہ کم عمری ہی میں منجھلے بھیا (مظہر امام) نے Child Easy English Grammar زبانی یاد کرا دی تھی۔ اسی طرح فارسی اور اردو قواعد بھی مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے نہ انگریزی گرامر آتی ہے اور نہ فارسی/اردو قواعد۔

مشہور فلمی جریدہ ''فلم فیئر'' سن ۵۲ میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس وقت اس کی حیثیت پندرہ روزہ تھی اور قیمت صرف پچاس پیسے۔ اب ماہنامہ ہے اور قیمت پچاس روپئے ہے۔ یہی وہ رسالہ ہے جس نے ۱۹۵۳ء میں ''فلم فیئر ایوارڈ'' کا آغاز کیا جو امریکہ کے آسکر ایوارڈ کی طرح ہی خیال کیا جاتا ہے۔

فلم فیئر دربھنگا میں صرف وہیلر کے بک اسٹال پر آتا تھا اور میں اسے خریدنے کے لئے ہر پندرہ دن پر چھ کیلو میٹر پیدل جایا کرتا تھا۔ اسٹیشن ہمارے گھر امیر منزل سے تقریباً تین کیلومیٹر ہے۔ کم عمری میں فلم بینی کا شوق دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ ہر اچھی بری فلم دیکھنے کی خواہش ہوتی اور اس خواہش کی تکمیل میری بڑی بھابھی کرتیں جو مجھے پیسے بھی دیتیں اور تحفظ کا بھی انتظام کرتیں۔

فلم میں اکثر نائٹ شو دیکھا کرتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منجھلے بھیا جن سے میں بے حد ڈرتا تھا (آج بھی ڈرتا ہوں) رات کا کھانا سویرے کھالیتے اور بستر پر لیٹ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ پوری رات پڑھتے رہتے یا لکھتے رہتے۔ لالٹین کی مدھم سوئی سوئی روشنی میں۔ اس وقت تک دربھنگے میں بجلی کی آنکھ مچولی شروع نہیں ہوئی تھی۔

میں بے فکر ہو کر پیچھے کے راستے سے نکل جایا کرتا تھا۔ بھابھی اس وقت تک جاگی رہتیں جب تک میں واپس نہیں آجاتا تھا۔ مگر وہ ایک رات میری زندگی کی ناقابل فراموش رات بن گئی۔

سن ۴۹ء کی بات ہے۔ دس گیارہ سال کا رہا ہوں گا میں۔ فلم انداز لگی ہوئی تھی۔ دلیپ کمار، نرگس اور راجکپور پہلی مرتبہ ایک ساتھ آئے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی شباب پر تھی۔ میں خاموشی سے پیچھے کے راستے نکل گیا۔ واپسی میں خوش خوش دیوار ٹپ کر صحن سے ہوتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ ہلکی سی دستک دی مگر دروازہ نہیں

کھلا۔ ٹھنڈ سے پورا وجود لرز رہا تھا۔ پانچ منٹ گذر گئے بے حد دھیمی آواز میں بھابھی کو صدا لگائی۔ دروازہ کھلا۔ سامنے منجھلے بھیا کھڑے تھے۔ انہوں نے پہلے تو ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر جڑ دیا اور پھر یہ کہتے ہوئے کہ باہر ہی رہو، دروازہ بند کر دیا۔ میں پوری رات باہر ٹھٹھرتا رہا۔ صبح انہوں نے ہی دروازہ کھولا اور مجھ اندر آنے کو کہا۔ میں ڈرا ڈرا سہما سہما اندر داخل ہوا اور بھابھی کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

دلیپ کمار سے میرا رشتہ فلم ملن سے شروع ہوا تھا۔ یہ ان کی تیسری فلم ہے۔ پہلی دو فلمیں جوار بھاٹا اور پرتما بے حد ناکام رہی تھیں۔ ان کی اداکاری کے لحاظ سے بھی۔ فلمی ناقدین کا خیال تھا کہ یہ اداکار جو ٹی بی زدہ اور مدقوق لگتا ہے یہیں پر ختم ہو جائے گا لیکن ''ملن'' نے جسے متن بوس نے ہدایت دی تھی دلیپ کے قدم فلمی دنیا میں مستحکم کر دیئے اور اس کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

دلیپ کمار یعنی یوسف خاں سرور خاں ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو پشاور میں پیدا ہوئے جو اب پاکستان میں ہے۔ ان کے والد پھلوں کے تاجر تھے جو بعد میں ناسک (مہاراشٹر) آگئے تھے۔ دلیپ کمار اپنے تیرہ بھائی بہنوں کے درمیان پانچویں اولاد ہیں۔ ان کی والدہ عائشہ بیگم کا انتقال ۲۷ر اگست ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ بیوی کی رحلت کے دو سال بعد یعنی ۵ر مارچ ۱۹۵۰ء کو دلیپ کمار کے والد بھی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی خواہش کے مطابق انہیں بھی دیولالی میں ان کی بیگم کے قریب ہی سپرد خاک کیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ دلیپ صاحب جب تین سال کے تھے تو ان کے والد انہیں تونسہ شریف مزار پر لے گئے تھے وہاں انہوں نے ایک غیبی آواز سنی جو مزار کے عقبی حصے سے آ رہی تھی۔

''سرور خاں تمہارا یہ بیٹا ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا۔''

آنے والے دنوں میں یہ صدائے غیب حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

جب تک دلیپ کمار پردہ سیمیں کی زینت رہے عظیم ترین اداکار کہلائے اور مجھے یقین ہے کہ آنے والے زمانوں میں بھی ہندوستانی سنیما ان کے مقابلہ کا اداکار پیدا نہیں کر سکے گا۔

دلیپ صاحب سے میری عقیدت اور محبت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں انہیں اپنے وجود ہی کا ایک حصہ سمجھنے لگا۔ بالکل اپنے بھائیوں کی طرح۔ چودہ پندرہ سال قبل کی بات ہے میں دہلی گیا ہوا تھا اور بھیا کے ڈرائنگ روم میں دلیپ کمار سے لیا ان کا انٹرویو دیکھ رہا تھا۔ قریب ہی میری پوتی (بھتیجا شہیر امام کی بیٹی) بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دلیپ کمار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''یہ تمہارے سب سے بڑے دادا ہیں۔

'سچ مچ، لیکن یہ تو کبھی آئے نہیں؟''

'بہت مصروف رہتے ہیں نا۔ پھر وہ بھابھی سے پوچھنے لگی، چھوٹے دادا سچ بول رہے ہیں؟'

بھابھی مسکرا کر رہ گئیں تھیں۔

دلیپ صاحب کو دیکھنے، ان سے ملنے باتیں کرنے کی حسرت تو اسی دن سے تھی جب انہیں پہلی مرتبہ ''ملن'' میں دیکھا تھا۔ سن ۷۱ء میں شاہینہ اور میں بمبئی سیر کو گئے تو اس آرزو کے ساتھ کہ شاید دلیپ صاحب کا دیدار ہو جائے۔ ''پالی ہل''، باندرہ ان کے بنگلے پر پہنچے تو دربان نے بتایا کہ وہ آج کل اپنی بیگم سائرہ بانو کے گھر میں

رہتے ہیں۔ سائرہ کا گھر قریب ہی تھا وہاں گئے تو پتہ چلا کہ صاحب اپنی بیگم اور خوش دامن کے ساتھ کشمیر گئے ہوئے ہیں۔ سائرہ کے مکان سے بالکل سٹا ہوا سنیل دت کا عالیشان گھر ہے۔ گیٹ پر دربان نہیں تھا۔ ہم دونوں اندر چلے گئے اور اطمینان سے لان میں لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ایک صاحب تشریف لائے اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ ہم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کہ صاحب شوٹنگ پر گئے ہوئے ہیں۔ اور نرگس جی بچوں کے ساتھ ہل اسٹیشن۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ہم لوگ اسی سڑک پر تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ سنیل دت کو سرخ رنگ کی اسپورٹس کار میں خود ڈرائیو کر کے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس سفر میں ہماری ملاقات امیتابھ بچن، شتروگھن سنہا، مالا سنہا، تبسم، نگار سلطانہ، حنا کوثر، ٹن ٹن، مدن پوری اور ساحر لدھیانوی سے ہوئی۔ کئی فلم اسٹوڈیوز بھی دیکھے ان میں محبوب اسٹوڈیو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہیں ''گورا اور کالا'' کی شوٹنگ دیکھی۔ اس وقت سٹ پر راجندر کمار اور ہیما مالنی موجود تھے۔ اسی سفر کی ایک اور بات یاد آرہی ہے۔ بمبئی کے جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا اس میں اپنے زمانے کے مشہور اداکار امر بھی قیام پذیر تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر بڑی سی داڑھی تھی، جس پر لمبا سا کرتا اور لنگی۔ وہ ہوٹل کے مینیجر سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے آواز سے انہیں پہچانا۔ کئی فلموں میں دیکھ چکا تھا۔ دلیپ کمار کی تو تقریباً ہر فلم میں وہ معاون اداکار کی حیثیت سے ہوتے تھے۔ ان کا کمرہ میرے کمرے کے سامنے ہی تھا۔ میں نے دستک دی۔ آواز آئی۔ آجایئے۔

میں نے سلام کیا اور فوراً پوچھ بیٹھا آپ امر صاحب ہیں نا؟

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا، جی ہاں میں امر ہی ہوں۔

اس حال میں؟

یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ میری بیہودہ بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی، ساتھ میں میرے بیٹے کو بھی لے گئی۔ بنگلہ بھی فروخت کر دیا جو اسی کے نام سے تھا۔

ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ دلیپ کمار کا بھی ذکر آیا۔ وہ ان کے ساتھ بیس سے زائد فلمیں کر چکے تھے۔ اپنے زمانے کی مشہور اداکارہ ثریا کے ساتھ بہ طور ہیرو بھی کام کیا تھا۔

اسی ہوٹل سے وابستہ ایک دلچسپ بات یاد آرہی ہے۔ میں اور شاہینہ نیچے ناشتے کے لئے جا رہے تھے۔ اچانک ہوٹل کے منیجر نے آواز دی۔ شاہینہ سیڑھیاں اتر چکی تھیں۔

فرمایئے؟

سر ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ انہیں فلم اسٹار بنانا چاہتے ہیں۔ اور فلم اسٹوڈیو کے چکر لگا رہے ہیں۔

بالکل نہیں جناب، ہم بمبئی صرف تفریح کے لئے آئے ہیں اور بس۔

نیچے آکر شاہینہ کو یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسی۔

مشہور ہدایت کار تپن سنہا نے سگینہ کو دو زبانوں میں بنایا تھا۔ پہلی مرتبہ بنگالی میں سگینہ مہتو کے نام سے جو ۱۹۷۰ء میں ریلیز ہوئی تھی اور دوسری ہندی میں سگینہ کے نام سے جو ۱۹۷۴ء میں سینما گھروں میں دکھائی گئی۔

سگینہ مہتو نے بے حد کامیابی حاصل کی۔ دلیپ کمار کی اداکاری کو بے حد سراہا گیا۔ بنگالی میڈیا نے تو تعریف کی انتہا کردی۔ انگریزی کے مشہور اخبار Statesman نے لکھا:

"But perhaps the most memorable distinction is Dilip Kumar's performance as hero. 'Sagina Mahto' remains a film with a considerable difference, because of Dilip Kumar, it may even be memorable".

بنگالی زبان کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ آنند بازار پتریکا نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"Technically brilliant the film has for its outstanding feature, Excelent acting by DilipKumar, the likes of which is rarely seen in the Bengali Screen".

اس وقت بنگالی سنیما کے سب سے مقبول اداکار اتم کمار زندہ تھے۔ بنگالی جن کی پرستش کرتے تھے۔

ہندی میں سگینہ ۱۹۷۴ء میں ریلیز ہوئی۔ میں جمشید پور میں تھا۔ میرا بے حد پیارا دوست قمر الہدیٰ ان دنوں کلکتہ میں تھا۔ اس نے مجھ فون پر بتایا کہ فلاں تاریخ کو لائٹ ہاؤس سنیما میں ''سگینہ'' کا پریمئر ہے۔ دلیپ کمار اور سائرہ بانو شریک ہو رہے ہیں۔ میں نے ٹکٹ لے لیا ہے، تم آجاؤ۔

میں دوسرے دن کلکتہ پہنچ گیا۔ پریمئر آٹھ بجے تھا۔ ہم دونوں نے کارپوریشن اسٹریٹ کے امینیہ ہوٹل میں کھانا کھایا اور ٹہلتے ہوئے لائٹ ہاؤس سنیما چلے گئے۔ تھیٹر سے باہر فلم دیکھنے والوں سے زیادہ زائرین کی بھیڑ تھی جو اپنے محبوب اداکار کی زیارت کے لئے آئے تھے۔

میں سنیما کے مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ دربان نے میرا راستہ نہیں روکا میں اندر چلا گیا۔ قمر کو باہر ہی رکنا پڑا اندر کاریڈور میں کئی شناسا چہرے نظر آئے۔ بیشتر کو میں 'سگینہ مہتو' میں دیکھ چکا تھا۔

انل چٹرجی، اپرنا سین، ارندھتا تی مکھرجی، فلم کے ہدایت کار تپن سنہا قبل سے وہاں موجود تھے۔ شہنشاہ اور ان کی ملکہ کے استقبال کے لئے۔

کچھ ہی دیر کے بعد تمام لوگ مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ دلیپ کمار اپنی بیگم سائرہ بانو کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے اور ہال کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے پیچھے انسانوں کا ایک ہجوم چل رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ سبھوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا دلیپ کمار کے قریب آگیا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے اسٹیج پر پہنچ گیا۔ جہاں اجیت پانجا (وہ اس وقت حکومت مغربی بنگال میں وزیر تھے مرحوم ہو چکے ہیں) نے ان کا اور سائرہ بانو کا استقبال کیا اور پھر تینوں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ میں کچھ دیر بت کی طرح دلیپ کمار کے پاس ہی کھڑا رہا۔ ایک بار نظر اٹھا کر انہوں نے میری طرف دیکھا بھی۔ پھر میں نیچے آگیا جہاں قمر میرا منتظر تھا۔

پروگرام تقریباً ایک گھنٹہ چلا۔ دلیپ صاحب نے کچھ انگریزی اور کچھ اردو میں تقریر کی۔ انہوں نے شروع ہی میں یہ کہہ دیا کہ سائرہ کو بولنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے کیوں کہ وہ اسٹیج پر بولنے سے گھبراتی ہیں۔

اس فنکشن میں دلیپ کمار کے سوا سبھی مجھے بونے نظر آئے۔ اپرنا سین بھی مائک پر آئیں مگر بہت گھبرائی ہوئی۔ اپرنا بنگالی فلموں کی معروف اداکار اور ہدایت کار ہیں۔ کئی خوبصورت فلمیں بنائی ہیں انہوں نے۔ ان کی صاحبزادی کو نکرنا سین کو شرما ہندی اور بنگالی فلموں کی بہت کامیاب اداکارہ ہے۔ مگر اس رات اپرنا کے منہ سے آواز ہی نکل رہی تھی۔

دلیپ کمار کا فلمی عہد چھ دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ان چھ دہائیوں میں انہوں نے صرف ۵۸ فلمیں کی ہیں۔ ان ۵۸ فلموں میں آگ کا دریا (جو آج تک ریلیز نہیں ہوئی) اور سگینہ جو دو زبانوں میں بنی اور بنگالی فلم 'پاری' شامل ہے۔ جب کہ ان کے ہم عصروں میں کئی نے دو سو سے زائد فلموں میں کام کیا ہے۔ لیکن دلیپ کمار، دلیپ کمار ہیں۔ اس بلندی تک نہ کوئی اداکار پہنچا ہے اور نہ شاید پہنچ پائے گا۔ ان کی حد صرف آسمان ہے۔

ذیل میں بالترتیب ان فلموں کے نام درج کر رہا ہوں جن میں دلیپ کمار نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہیرو کی حیثیت سے بھی اور مہمان اداکار کی حیثیت سے بھی۔

جوار بھاٹا (۱۹۴۴ء): پروڈیوسر: بمبئی ٹاکیز، ہدایت کار: امیہ چکرورتی، موسیقار: انل بسواس، اداکار: دلیپ کمار، مری دولا، شمیم، آغا جان

پرتما (۱۹۴۵ء): پروڈیوسر: بمبئی ٹاکیز، ہدایت کار: پی جے راج، موسیقار: انل بسواس، اداکار: دلیپ کمار، سورن لتا، جیوتی، ممتاز علی، شاہ نواز

ملن (۱۹۴۶ء): پروڈیوسر: بمبئی ٹاکیز، ہدایت کار: نتن بوس، موسیقار: انل بسواس، اداکار: دلیپ کمار، میرا مشرا، رنجنا، پہاری سنیال

جگنو (۱۹۴۷ء): پروڈیوسر: شوکت آرٹ پروڈکشنز، ہدایت کار: شوکت حسین رضوی، موسیقار: فیروز نظامی، اداکار: دلیپ کمار، نور جہاں، غلام محمد، آغا

انوکھا پیار (۱۹۴۸ء): پروڈیوسر: امیہ کا فلمز، ہدایت کار: ام آئی دھرم سی، موسیقار: انل بسواس، اداکار: دلیپ کمار، نرگس، نلنی جیونت، مقری

گھر کی عزت (۱۹۴۸): پروڈیوسر: مرلی مووی ٹون، ہدایت کار: رام دریانی، موسیقار: گوبند رام، اداکار: دلیپ کمار، ممتا شانتی، جیون، منورما

میلہ (۱۹۴۸ء): پروڈیوسر: واڈیا فلمز لمیٹڈ، ہدایت کار: اس یونی، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، نرگس، جیون، امر

ندیا کے پار (۱۹۴۸ء): پروڈیوسر: فلمستان، ہدایت کار: کشور ساہو، موسیقار: سی رام چندر، اداکار: دلیپ کمار، کامنی کوشل، مایا بنرجی، ڈیوڈ

شہید (۱۹۴۸ء): پروڈیوسر: فلمستان، ہدایت کار: رمیش سہگل، موسیقار: غلام محمد، اداکار: دلیپ کمار، کامنی کوشل، چندر موہن، لیلا چٹنس

انداز (۱۹۴۹ء): پروڈیوسر: محبوب خان، ہدایت کار: محبوب خان، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، نرگس، راج کپور، مراد

شبنم (۱۹۴۹ء): پروڈیوسر: فلمستان، ہدایت کار: بھوتی مترا، موسیقار: اس ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، کامنی کوشل، جیون، پارو

آرزو (۱۹۵۰ء): پروڈیوسر: انڈین نیشنل پکچرس، ہدایت کار: شاہد لطیف، موسیقار: انل بسواس، اداکار: دلیپ کمار، کامنی کوشل، گوپ، ککو

بابل (۱۹۵۰ء): پروڈیوسر: سنی آرٹ پروڈکشنز، ہدایت کار: اس یو سنی، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، نرگس، منور سلطانہ، امر

جوگن (۱۹۵۰ء): پروڈیوسر: رنجیت موی ٹون، ہدایت کار: کدار شرما، موسیقار: بلوسی رانی، اداکار: دلیپ کمار، نرگس، پرتیما دیوی، پورنیما

دیدار (۱۹۵۱ء): پروڈیوسر: فلمکار لیمیٹیڈ، ہدایت کار: نتن بوس، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، نرگس، اشوک کمار، یعقوب

ہلچل (۱۹۵۱ء): پروڈیوسر: کے آصف، پروڈکشنز ہدایت کار: اس کے اوجھا، موسیقار: محمد شفیع، سجاد حسین، اداکار: دلیپ کمار، نرگس، بلراج ساہنی، یعقوب

ترانہ (۱۹۵۱ء): پروڈیوسر: کرشن مود پٹون، ہدایت کار: رام دریانی، موسیقار: انل بسواس، اداکار: دلیپ کمار، مدھو بالا، شیاما، جیون

آن (۱۹۵۲ء): پروڈیوسر: محبوب پروڈکشنز، ہدایت کار: محبوب خان، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، نمی، نادرہ، پریم ناتھ

داغ (۱۹۵۲ء): پروڈیوسر: مارس اینڈ موویز، ہدایت کار: امیت چکرورتی، موسیقار: شنکر جے کشن، اداکار: دلیپ کمار، نمی، اوشا کرن، للیتا پوار

سنگدل (۱۹۵۲ء): پروڈیوسر: تلوار فلمز، ہدایت کار: آرسی تلوار، موسیقار: سجاد حسین، اداکار: دلیپ کمار، مدھو بالا، لیلا چٹنس، شمی

فٹ پاتھ (۱۹۵۳ء): پروڈیوسر: رنجیت مووی ٹون، ہدایت کار: ضیاء سرحدی، موسیقار: خیام، اداکار: دلیپ کمار، مینا کماری، رمیش تھاپر، انور حسین

شکست (۱۹۵۳ء): پروڈیوسر: آشادیپ، ہدایت کار: رمیش سہگل، موسیقار: شنکر جے کشن، اداکار: دلیپ کمار، نلنی جیونت، اوم پرکاش، درگا کھوٹے

امر (۱۹۵۴ء): پروڈیوسر: محبوب پروڈکشنز، ہدایت کار: محبوب خان، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، مدھو بالا، نمی، جینت

آزاد (۱۹۵۵ء): پروڈیوسر: پکشی راج اسٹوڈیو، ہدایت کار: اس ام اس نائڈو، موسیقار: سی رام چندر، اداکار:

دلیپ کمار، مینا کماری، پران، اوم پرکاش

انسانیت (۱۹۵۵ء): پروڈیوسر: جمن پکچرز، ہدایت کار: اس اس واسن، موسیقار: سی رام چندر، اداکار: دلیپ کمار، دیوانند، بینا رائے، وجے لکشمی

اڑن کھٹولہ (۱۹۵۵ء): پروڈیوسر: سنی آرٹ پروڈکشنز، ہدایت کار: اس یوسنی، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، نمی، ثریا کماری، جیون

دیوداس (۱۹۵۶ء): پروڈیوسر: بمل رائے پروڈکشنز، ہدایت کار: بمل رائے، موسیقار: اس ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، سچترا اسین، وجینتی مالا، موتی لال

نیا دور (۱۹۵۷ء): پروڈیوسر: بی آر فلمز، ہدایت کار: بی آر چوپڑہ، موسیقار: او پی نیر، اداکار: دلیپ کمار، وجینتی مالا، اجیت، جانی واکر

مسافر (۱۹۵۷ء): پروڈیوسر: فلم گروپ، ہدایت کار: رشی کیش مکھرجی، موسیقار: سلیل چودھری، اداکار: دلیپ کمار، ادشا کرن، کشور کمار، سچترا اسین

مدھومتی (۱۹۵۸ء): پروڈیوسر: بمل رائے پروڈکشنز، ہدایت کار: بمل رائے، موسیقار: سلیل چودھری، اداکار: دلیپ کمار، وجینتی مالا، پران، جانی واکر

یہودی (۱۹۵۸ء): پروڈیوسر: بمبے فلمز، ہدایت کار: بمل رائے، موسیقار: شنکر جے کشن، اداکار: دلیپ کمار، مینا کماری، سہراب مودی، نگار سلطانہ

پیغام (۱۹۵۹ء): پروڈیوسر: جمنی پکچرز، ہدایت کار: اس اس ومن، موسیقار: سی رام چندرن، اداکار: دلیپ کمار، وجینتی مالا، راج کمار، جانی واکر

کوہ نور (۱۹۶۰ء): پروڈیوسر: ریپبلک فلم کارپوریشن، ہدایت کار: اس یوسنی، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، مینا کماری، جیون، کم کم

مغل اعظم (۱۹۶۰ء): پروڈیوسر: اسٹرلنگ الوسٹمنٹ کارپوریشن، ہدایت کار: کے آصف، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، مدھوبالا، پرتھوی راج، درگا کھوٹے

گنگا جمنا (۱۹۶۱ء): پروڈیوسر: سٹی زن فلمز، ہدایت کار: نتن بوس، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، وجینتی مالا، ناصر خان، انور حسین

لیڈر (۱۹۶۴ء): پروڈیوسر: مکھرجی فلم سنڈیکیٹ، ہدایت کار، رام مکھرجی، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، وجینتی مالا، موتی لال، جینت

دل دیا درد لیا (۱۹۶۶ء): پروڈیوسر: کے پروڈکشنز، ہدایت کار: اے آر کاردار، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، وحیدہ رحمٰن، رحمان، پران

رام اور شیام (۱۹۶۷ء): پروڈیوسر: وجے انٹرنیشنل، ہدایت کار: چانکیہ، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، وحیدہ رحمٰن، ممتاز، پران

آدمی (۱۹۶۸ء): پروڈیوسر: پی اس وی فلمز، ہدایت کار: اے بھیم سنگھ، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، وحیدہ رحمٰن، منوج کمار، پران

سنگھرش (۱۹۶۸ء): پروڈیوسر: راہل تھیٹرس، ہدایت کار: اچ اس رویل، موسیقار: نوشاد، اداکار: دلیپ کمار، وجینتی مالا، بلراج ساہنی، سنجیو کمار

گوپی (۱۹۷۰ء): پروڈیوسر: پروسپوریٹی پکچرس، ہدایت کار: اے بھیم سنگھ، موسیقار: کلیان جی آنند جی، اداکار: دلیپ کمار، سائرہ بانو، اوم پرکاش، پران

سگینہ مہتو (بنگالی) (۱۹۷۰ء): پروڈیوسر: ہیمن گنگولی، ہدایت کار: تپن سنہا، موسیقار: تپن سنہا، اداکار: دلیپ کمار، سائرہ بانو، اپرنا سین، انل چٹرجی

داستان (۱۹۷۲ء): پروڈیوسر: بی آر فلمز، ہدایت کار: بی آر چوپڑہ، موسیقار: لکشمی کانت پیارے لال، اداکار: دلیپ کمار، شرمیلا ٹیگور، پریم چوپڑہ، بندو

سگینہ (ہندی) (۱۹۷۴ء): پروڈیوسر: جے کے کپور، ہدایت کار: تپن سنہا، موسیقار: اس ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، سائرہ بانو، اوم پرکاش، اپرنا سین

بیراگ (۱۹۷۶ء): پروڈیوسر: مشیر ریاض، ہدایت کار: امیت سین، موسیقار: کلیان جی آنند جی، اداکار: دلیپ کمار، سائرہ بانو، لینا چندراورکر، پریم چوپڑہ

کرانتی (۱۹۸۱ء): پروڈیوسر: وی آپی فلمز، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال، اداکار: دلیپ کمار، منوج کمار، ہیما مالنی، ششی کپور

شکتی (۱۹۸۲ء): پروڈیوسر: مشیر ریاض، ہدایت کار: رمیش پپی، موسیقار: آر ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، امیتابھ بچن، راکھی، سمیتا پاٹل

ودھاتا (۱۹۸۲ء): پروڈیوسر: گلشن رائے، ہدایت کار: سبھاش گھئی، موسیقار: کلیان جی آنند جی، اداکار: دلیپ کمار، سنجیو کمار، سنجے دت، ششی کپور

مزدور (۱۹۸۳ء): پروڈیوسر: بی آر فلمز، ہدایت کار: روی چوپڑہ، موسیقار: آر ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، نندا، راج ببر، پدمنی کولہاپوری

دنیا (۱۹۸۴ء): پروڈیوسر: یش چوپڑہ، ہدایت کار: رمیش تلوار، موسیقار: آر ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، سائرہ بانو، رشی کپور، امرتا سنگھ

مشعال (۱۹۸۴ء): پروڈیوسر: یش راج فلمز، ہدایت کار: یش چوپڑہ، موسیقار: ہردے ناتھ منگیشکر، اداکار:

دلیپ کمار، وحیدہ رحمٰن، رتی اگنی ہوتری، انیل کپور

دھرم ادھیکاری (۱۹۸۶ء): پروڈیوسر: سوریہ نرائن راؤ، ہدایت کار: رگھونڈر راؤ، اداکار: دلیپ کمار، جیتندر، سری دیوی، قادر خان

کرما (۱۹۸۶ء): پروڈیوسر: سبھاش گھئی، ہدایت کار: شبھاش گھئی، موسیقار: لکشمی کانت پیارے لال، اداکار: دلیپ کمار، نوتن، انیل کپور، جے کی شروف سری دیوی

قانون اپنا اپنا (۱۹۸۹ء): پروڈیوسر: مادھوی پروڈکشنز، ہدایت کار: بی گوپال، موسیقار: بپی لہری، اداکار: دلیپ کمار، نوتن، سنجے دت، مادھوری دکشت

عزت دار (۱۹۹۰ء): پروڈیوسر: سدھاکر بوکاڈے، ہدایت کار: کے پپا، موسیقار: لکشمی کانت پیارے لال، اداکار: دلیپ کمار، گووندا، مادھوری دکشت

سوداگر (۱۹۹۱ء): پروڈیوسر: مکتا آرٹس، ہدایت کار: سبھاش گھئی، موسیقار: لکشمی کانت پیارے لال، اداکار: دلیپ کمار، راج کمار، منیشا کوئرالہ، وویک مشران

قلعہ (۱۹۹۸ء): پروڈیوسر: ایگل فلمز، ہدایت کار: امیش مہرہ، موسیقار: آنند راج آنند، اداکار: دلیپ کمار، ریکھا، مکل دیو، ممتا کلکرنی

فلمیں جن میں دلیپ کمار نے بطور "مہمان اداکار" کام کیا:

کالا بازار (۱۹۶۰ء): پروڈیوسر: نوکیتن، ہدایت کار: وجے آنند، موسیقار: اس ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، دیوانند، وحیدہ رحمٰن، نندہ

پاری (۱۹۶۷ء): پروڈیوسر: پرنوتی گھوش، ہدایت کار: جگن ناتھ چٹوپادھیائے، موسیقار: سلیل چودھری، اداکار: دلیپ کمار، دھرمیندر، پرنوتی گھوش، ابھی بھٹاچاریہ

انوکھا ملن (۱۹۷۲ء): پروڈیوسر: آر جی وزیرانی، ہدایت کار: جگن ناتھ چٹوپادھیائے، موسیقار: سلیل چودھری، اداکار: دلیپ کمار، دھرمیندر، پرنوتی گھوش، ابھی بھٹاچاریہ

کوشش (۱۹۷۲ء): پروڈیوسر: انوپم چندر، ہدایت کار: گلزار، موسیقار: آر ڈی برمن، اداکار: دلیپ کمار، سنجیو کمار، جیا بھادوری، ڈیوڈ

پھر کب ملوگی؟ (۱۹۷۴ء): پروڈیوسر: ہری مہرہ، ہدایت کار: رشی کیش مکھرجی، موسیقار: آر ڈی برمن، اداکار، دلیپ کمار، مالا سنہا، بسواجیت، ڈیوڈ

اگرچہ دلیپ کمار کا فلمی سفر ختم ہو چکا ہے لیکن زندگی کے راستوں پر وہ ابھی بھی رواں اور دواں ہیں۔ یہی دعا ہے کہ ان کی رہگزر حیات طویل تر ہو جائے۔ اس یقین کے باوجود "کل نفس ذائقة الموت! (جاری)

☆☆☆

مظہر امام، ۶۔۱۷۶۔بی، پاکٹ۔ا منیز ا، میورو بہار، دہلی ۱۱۰۰۹۱

یش چوپڑہ کی اردو فلمیں

''اردو ہمارے ملک سے نکل گئی۔ نئی نسل اس زبان سے واقف بھی نہیں ہے۔ افسوس ہوتا ہے۔ اردو ایک شاندار اور خوبصورت زبان ہے اور اسے ختم نہیں ہونا چاہے۔'' (یش چوپڑہ)

تقسیم کے بعد پنجاب سے ہجرت کر کے جو فلمی شخصیتیں بمبئی آئیں، ان میں بی۔آر۔چوپڑا اور یش چوپڑہ کے نام نہایت اہم ہیں۔ ایسے وقت میں جب اردو سخت حالات سے گذر رہی تھی۔ انہوں نے اور ان کے کچھ اور رفیقوں نے بے تکلفی سے اردو فلمیں بنائیں، خواہ انہیں ہندی فلموں کے ہی زمرے میں شامل کیا گیا۔ مشہور فلم مورخ راشل ڈائر نے ۲۰۰۱ء میں "Yash Chopra ;Fifty years in Indian Cinema" کے نام سے ایک کتاب شائع کرائی تھی۔ اس کا پیش لفظ لتا منگیشکر نے لکھا تھا۔ یش چوپڑہ کی اردو فلموں نے کامیابی اور مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ دھول کا پھول ۱۹۵۹ء گانے: ساحر لدھیانوی، موسیقی: این دتہ

۲۔ دھرم پتر ۱۹۶۲ء مکالمے: اختر الایمان، موسیقی: این دتہ

۳۔ وقت ۱۹۶۵ء گانے: ساحر، موسیقی: روی

۴۔ آدمی اور انسان ۱۹۶۹ء گانے: ساحر، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لعل، مکالمے: اختر الایمان

۵۔ اتفاق ۱۹۶۹ء مکالمے: اختر الایمان، موسیقی: سلیل چودھری

۶۔ داغ ۱۹۷۳ء گانے: ساحر، موسیقی: لکشمی کانت پیارے لال، مکالمے اختر الایمان

۷۔ خوشبو ۱۹۷۳ء گانے: ساحر، موسیقی: آر ڈی برمن

۸۔ دیوار ۱۹۷۵ء گانے: ساحر، موسیقی: آر ڈی برمن، مکالمے: سلیم جاوید

۹۔ کبھی کبھی ۱۹۷۶ء گانے: ساحر، موسیقی: خیام، مکالمے: ساگر سرحدی

۱۰۔ کالا پتھر ۱۹۷۹ء گانے: ساحر، موسیقی: راجیش روشن، مکالمے: سلیم جاوید

۱۱۔ ترشول ۱۹۷۸ء گانے: ساحر، موسیقی: خیام، کہانی، مکالمے: سلیم جاوید

۱۲۔ سلسلہ ۱۹۸۱ء گانے: جاوید اختر، کمال حسن، ندا فاضلی، مکالمے: ساگر سرحدی
موسیقی: شیو کمار شرما، ہری پرساد چورسیا

۱۳۔ مشعل ۱۹۸۴ء گانے، کہانی، مکالمے: جاوید اختر، موسیقی: ہردے ناتھ منگیشکر

۱۴۔ فاصلے ۱۹۸۵ء گانے: شہریار، موسیقی: شیو کمار شرما، ہری پرساد چورسیا

۱۵۔ وجے ۱۹۸۸ء گانے: ندا فاضلی، موسیقی: شیو کمار شرما، ہری پرساد چورسیا
مکالمے: اختر الایمان، سریندر پرکاش

۱۶۔ چاندنی ۱۹۸۹ء گانے: آنند بخشی، موسیقی: شیو کمار شرما، ہری پرساد چورسیا
مکالمے: ساگر سرحدی

۱۷۔ لمحے ۱۹۹۱ء گانے: آنند بخشی، موسیقی: شیو کمار شرما، ہری پرساد چورسیاء
مکالمے: راہی معصوم رضا

۱۸۔ پرمپرا ۱۹۹۲ء گانے: آنند بخشی، موسیقی: شیو کمار شرما، ہری پرساد چورسیا
مکالمے: راہی معصوم رضا

۱۹۔ ڈر ۱۹۹۳ء گانے: آنند بخشی، موسیقی: شیو کمار شرما، ہری پرساد چورسیا
مکالمے: جاوید صدیقی

۲۰۔ دل تو پاگل ہے ۱۹۹۷ء گانے: آنند بخشی، موسیقی: اتم سنگھ، مکالمے: آدتیہ چوپڑہ

۲۱۔ ویرزارا ۱۹۹۹ء گانے: آنند بخشی، موسیقی: مدن موہن، مکالمے: ادتیہ چوپڑہ

☆☆☆

حسن امام درد، امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔ ۸۴۶۰۰۴

ابتدائی دور کی ہندوستانی فلمیں

سب جانتے ہیں کہ ہمارا گھرانہ میرے والد کے تحت مذہبی رجحان اور روایتی تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ ہمارے یہاں فلم بینی تو بڑی بات ہے، کوئی اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ہمارے چچیرے بھائی جناب سعادت علی مرحوم، جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے، انہیں شعر و نغمہ اور فنون لطیفہ کا ذوق تھا، وہ اکثر سینما دیکھا کرتے تھے اور مجھے کبھی کبھی ساتھ لے جاتے تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں مجھے ان کے ساتھ سینما دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت دربھنگے میں کوئی تھیٹر ہال نہیں تھا۔ شامیانہ اور راوٹی گھیر کر ہال تیار کیا گیا تھا اور بینچ ڈال کر اور ترپال بچھا کر درجہ بدرجہ نشست کی جگہ متعین کی گئی تھی۔ خاموش فلم تھی جس میں انگریزی میں ٹائٹیل دیئے گئے تھے۔ جس سے میں محظوظ نہ ہو سکا۔ لیکن اس "چلتا بائسکوپ" کو دیکھنے کے لئے عوام کی کافی بھیڑ اکٹھی ہو گئی تھی۔ فلم دکھانے والی یہ سفری کمپنی تھی جو چند دنوں میں تماشہ دکھا کر چلی گئی۔

لیکن اس کے بعد اس زمین پر اہل ثروت کائستوں نے سالانہ چترگپت پوجا کے لئے ایک ہال تعمیر کرایا، جس کا نام مہامایا ہال رکھا۔ اس موقع سے چونکہ کلچرل پروگرام ہوا کرتے تھے اس کا اسٹیج متعدد پردوں کے ساتھ تھیٹر کے انداز کا تیار کیا گیا۔ اس ہال میں باذوق نوجوانوں نے مستقل ڈرامہ کا پروگرام شروع کر دیا۔ ڈرامہ کھیلنے کا ذوق چند سال میں ختم ہو گیا (جس کی تفصیل "وقت" دھنباد میں رقم کر چکا ہوں) بات فلم کی چل رہی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ تھیٹر سینما ہال میں تبدیل ہو کر پرکاش ٹاکیز کے نام سے معروف ہوا، اور ناطقی فلموں کی نمائش شروع ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتے میں روایتی کہانیوں پر مبنی فلمیں بن رہی تھیں اور کجن اور ماسٹر نثار کا بول بالا تھا۔ اور بمبئی میں رنجیت اور سرکو فلم ساز کمپنیوں کی دھار تک اور زیادہ تر مار دھار کی فلمیں یہاں آ رہی تھیں۔ ان فلموں میں سلوچنا، بلیموریا، مادھوری وغیرہ کا بول بالا تھا۔ کچھ سنجیدہ فلمیں بھی آئی تھیں۔ جن میں رنجیت کے بینر تلے شانتارام کی "امر جیوتی" اور دنیا نہ مانے اہم ہیں اور سرکو کے تحت محبوب کی فلمیں "ججمنٹ آف اللہ"، بہن، عورت اور روٹی نے دھوم مچا دی تھی۔ پھر سہراب مودی کی تاریخی فلمیں بھی بڑی کامیاب تھیں۔ جن میں پکار، سکندر اور پرتھوی ولبھ، معروف ہوئیں اور سہراب مودی کو انڈین سوشیل بی ڈی مائیل کہا جانے لگا۔ مندرجہ بالا فلموں میں چندر موہن، پرتھوی راج اور سہراب مودی نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

اسی دوران کلکتے میں نیو تھیٹرس فلمساز ادارہ قائم ہوا، جس نے صاف ستھری سماجی فلمیں پیش کیں۔ زیادہ تر فلمیں بنگال کے معروف ناول نگاروں کی کہانی پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان فلموں کی تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کے نغمے بھی بڑے دلنواز ہوتے تھے۔ گانے والوں میں سیگل، پنکج ملک، کانن بالا وغیرہ کے نغموں نے بڑی دھوم مچا دی تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ ایک ہی سیٹ پر بنگالی اور اردو دونوں زبان میں فلمیں تیار کر لی جاتی تھیں، جس سے بنگالی ماحول پورے طور پر اجاگر ہو جاتا تھا۔ وہاں اردو کے باوقار شعراء جیسے آرزو لکھنوی اور ذاکر حسین ذاکر دربھنگوی نیو تھیٹرس کے مستقل نغمہ نگار تھے۔ نیو تھیٹرس کی فلموں میں غالب کے اشعار تو اتر سے پڑھے جاتے تھے اور مختلف گائک اپنی اپنی آواز سے نغمہ سرا ہوتے تھے جس میں سیگل اہم تھا۔

کلکتے میں دیگر فلم ساز ادارے بھی تھے، جہاں اسٹیج کی تاریخ ساز شخصیت، آغا حشر کاشمیری کے لکھے ہوئے ڈرامے پردہ سیمیں پر آ رہے تھے۔ ایک فلم "خونی کون" دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو تمام و کمال آغا حشر کشمیری کے سیریو، مکالے اور نغموں پر مبنی تھا۔ چند اشعار اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں:

چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی | خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی
اے حشر دیکھنا تو یہ ہے چودھویں کا چاند | آیا آسماں کے ہاتھ میں تصویر یار کی

پھر فضلی برادرس کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ وجود میں آیا، جس نے چند خوبصورت فلمیں پیش کیں۔ ان کی دو فلمیں معصوم اور چورنگی قابل ذکر ہیں۔ جن کے ڈائریکٹر سبطین فضلی تھے نغمے جگر مراد آبادی اور فضل الرحمٰن فضلی کے ہوتے تھے۔ جگر صاحب کے چند اشعار یاد آرہے ہیں :

معصوم نظر کا بھولا پن نظروں کا ملانا کیا جانے | دل آپ نشانہ بنتا ہے نظروں سے لبھانا کیا جانے
آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں | معصوم نگاہوں میں معصوم فسانہ ہے
کیا عشق و محبت کی وسعت کا ٹھکانہ ہے | سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

اور پھر فضلی صاحب کا یہ شعر :

ہزاروں ہاں تصدق اس 'نہیں' پر | جسے کہہ کر کوئی شرما رہا تھا

ان فلموں میں مہتاب، شیدا کیوروی اور منورما نے کردار ادا کیا تھا۔

چالیس کی دہائی میں ہمارے معمر استاد جناب کشوری سرن اگروال، جو ہمارے یہاں مجھے اور مظہر امام کو حساب اور سائنس پڑھانے آتے تھے، اور اردو اور فارسی کی بڑی اچھی صلاحیت کے حامل تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس سے "آب حیات" پڑھنے کو دیا تھا۔ اردو اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ میری یادداشت میں ان کے نامکمل اشعار کچھ اس طرح ہیں، اردو میں ان کے کلام کے دو مصرعے روم روم میں رم رہا ہے، رحمٰن ہے اس کا نام اور فارسی میں

"نہ ہندوام نہ مسلم ام یکے از ہر دو بالا ام"

جب انہیں تنخواہ ملتی تو وہ ہم دو بھائیوں کو سنیما دکھانے لے جاتے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ اس زمانے میں ہم تواتر سے فلمیں دیکھنے لگے تھے۔

اس دور میں فلموں کا انداز بہت حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ اور تواتر سے اچھی فلمیں آرہی تھیں۔ شانتارام نے "نو کا رام (رنگین)" ایک آنکھ بارہ ہاتھ، شکنتلا، محبوب نے انداز (جس نے ایکٹنگ کے فن میں انقلاب پیدا کیا) اور مدر انڈیا کدار شرما نے چترلیکھا گرودت نے "صاحب بیوی اور غلام" اور "چودھویں کا چاند" کے عاصف نے مغل اعظم، کمال امروہی نے "پاکیزہ" گلزار نے "میرے اپنے بنائیں" اس کے علاوہ بیجو باورا اور شعلے بھی اہم فلمیں تھیں۔

حالیہ دور میں بھی فلم انڈسٹری ترقی پر ہے۔ اور اب بھی کبھی کبھی تاریخ ساز فلمیں آجاتی ہیں جو سماجی مسائل پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن عریانیت، شور شرابا اور بے معنی فلموں کی بھرمار ہے۔

ان ابتدائی دور میں جن لوگوں کی کردار نگاری نے مجھے متاثر کیا ان کا بھی اجمالی تذکرہ کرنا مناسب ہوگا:۔ (۱) چندر موہن نے امر جیوتی میں، (۲) پرتھوی راج نے سکندر میں (۳) نواب کاشمیری نے یہودی کی لڑکی میں (۴) شانتارام نے ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی میں (۵) بھارت بھوشن نے بھرت ملاپ میں (۶) دلیپ کمار نے گنگا جمنا میں (۷) راج کپور نے عبداللہ میں (۸) جونی واکر نے چودھویں کے چاند میں اور اشوک کمار نے پاکیزہ میں اور اس وقت کی جس تصویر نے پوری دنیا میں دھوم مچائی وہ راجکپور کی فلم آوارہ تھی اور اس فلم ساز ادارہ سے بنی شمبھومترا کی فلم بنگالی میں ایک دن راتری ہندی میں "جاگتے رہو" نے بہت سارے بین الاقوامی انعامات حاصل کیئے۔ دونوں کی کہانی ایک ہی تھی اور دونوں میں مرکزی کردار راج کپور نے ادا کیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، کوہسار، بھیکن پور۔۳، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱

امیتابھ بچن اور راجکمار سے میری ملاقات

مئی ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ میں سری نگر میں تھا اور مشہور شاعر و ناقد اور دوردرشن کے ڈائریکٹر مظہر امام کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک دن شام میں مظہر امام نے پوچھا پہلگام چلیں گے؟ وہاں امیتابھ بچن اور ریکھا کی کسی فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے۔ میں دوردرشن کے لئے امیتابھ بچن سے انٹرویو کرنے کے لئے سوچ رہا ہوں۔

شہیر امام اور فرزانہ امام نے فوراً رضامندی ظاہر کردی۔ مبینہ امام نے بھی اثبات میں سر ہلادیا۔ اسی طرح میری رضامندی خود بخود ظاہر ہوگئی۔ کیونکہ ۱۹۷۵ء میں پہلگام دیکھا تھا، دوبارہ دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں نے شرط رکھی کہ ایک رات وہاں قیام کریں گے۔

اگلے دن مظہر امام صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ کل صبح پہلگام چل رہے ہیں۔ وہاں دو شب گزاریں گے۔ دوردرشن کی گاڑی پر ہم سب روانہ ہوئے۔ ویڈیوگرافر (کیمرہ مین) بھی ساتھ تھے۔ پہلگام کے سب سے بڑے ہوٹل ''پہلگام ہوٹل'' میں ہمارے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام تھا۔ مظہر امام اپنی فیملی کے ساتھ ایک بڑے کمرہ میں تھے۔ مجھے سنگل روم ملا تھا۔ ایسے بڑے ہوٹل میں سنگل روم بھی ٹرپل سے بڑا تھا۔ اس رات میں سو نہیں سکا۔ پہاڑ سے برف پگھل پگھل کر گرنے کی آواز میں ایسی موسیقی تھی کہ میں اندر سے بے چین ہوتا رہا۔ اسی ہوٹل کی دو رات میں، میں نے ناول، آنچ مکمل کیا تھا جو اسی سال نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا۔

امیتابھ بچن نے اگلی صبح ساڑھے نو بجے ملاقات کا وقت دیا تھا۔ وہ ''بخشی ہٹ'' میں ٹھہرے ہوئے تھے اور فلم ''خون و پسینہ'' کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔ ہم سب ٹھیک وقت پر بخشی ہٹ پہنچے۔ اندر خبر بھجوائی گئی تو وہ خود اور ریکھا باہر برآمدے میں آگئے اور ''ہائے وائے'' کے بعد ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ دونوں آؤٹ ڈور شوٹنگ میں جانے کے لئے تیار تھے۔ بہت زیادہ میک اپ میں ریکھا مجھے اچھی نہیں لگیں۔ چائے کے دوران امیتابھ بچن سے مظہر امام نے چند سوالات کئے جن کا جواب انہوں نے شیکسپیرین انگلش میں دیا۔ ان کے جملے طویل ہوتے تھے۔ چائے ختم ہوتے ہی وہ اٹھ گئے اور ہم سے کہا کہ فلاں جگہ شوٹنگ کرنی ہے وہیں پہنچے بریک میں بقیہ باتیں ہوں گی۔

امیتابھ بچن کی گاڑی جانے کے بعد ہم اطمینان سے روانہ ہوئے کیونکہ شوٹنگ دو گھنٹہ تک ہونی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جب ہم اس جگہ پہنچے تو وہاں سناٹا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہاں شوٹنگ کل تھی آج دوسری جگہ ہے۔ اس دوسری جگہ کا ہمیں علم نہیں ہوسکا۔ دوبارہ ''بخشی ہٹ'' آئے لیکن وہاں کے کیئر ٹیکر اور دربان کو بھی شوٹنگ کی جگہ کا پتہ نہیں تھا۔

پہلگام گھومنے میں دن نکل گیا۔ شام میں ہوٹل لوٹے تو لان میں مزاحیہ اداکار سندر سے ملاقات ہوگئی۔ سندر کے چہرے کی بناوٹ ایسی تھی کہ دیکھنے والوں کو ہنسی آجاتی تھی۔ باتوں کے دوران سندر نے بتایا کہ اسرانی بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے اور یہ کہ راجکمار بھی پہلگام میں ہی ہیں۔ راجکمار کے قیام کی جگہ بھی سندر نے ہی بتائی۔

سندر کسی دوسری فلم کی شوٹنگ کے لئے آئے تھے۔

رات نو بجے بیرا نے بتایا کہ اسرانی اپنے کمرے میں ہے۔ مظہر امام صاحب نے کہا کہ اسرانی سے بھی انٹرویو لیا جاسکتا ہے۔ بیرا کی رہنمائی میں ہم اس سوٹ تک پہنچے جہاں اسرانی تھا۔ کال بیل بجائی گئی۔ دیر تک بجائی گئی۔ ہم سب نے باری باری آواز بھی دی۔ کئی لمحے قتل ہو گئے تب اندر سے اسرانی کی آواز آئی ''آتا ہوں بابا'' آتا ہوں۔ لوگ سونے بھی نہیں دیتے۔''

پھر دروازہ کھلا۔ صرف انڈرویر پہنے اسرانی سامنے کھڑا تھا۔ شراب کی بہت تیز بو ہم نے محسوس کی، ایک اچٹتی نگاہ ہم سب پر ڈال کر اس نے پوچھا، کیا ہے ایں؟ پیچ ہے.....

مظہر امام نے عندیہ ظاہر کیا۔ جسے سنتے ہی اسرانی زور سے بولا ''انٹرویو' ہرگز نہیں۔'' اور اس نے دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔

رات کھانے کے ٹیبل پر ہم نے طے کیا کہ کل راجکمار سے ضرور ملیں گے۔

گیارہ بجے ہم سب اس جگہ پہنچے جہاں راجکمار ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ جگہ کا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ ممکن ہے مظہر امام صاحب کو یاد ہو۔

مظہر امام نے خبر بھجوائی کہ سری نگر دوردرشن کے ڈائریکٹر اور کچھ دوسرے لوگ ملنا چاہتے ہیں۔

فوراً ہمیں اندر بلالیا گیا۔ اوپر جانے کی سیڑھی پر ہمارے استقبال کے لئے راجکمار کھڑے تھے۔ انہوں نے بلند آواز سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم اوپر پہنچے تو بہت ہی مہذب انداز میں انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں راجکمار کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اتنا خوبصورت مرد میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ سرخ سفید رنگ جیسے دودھ اور شہد ملا کر بنایا گیا ہو۔ نیلی آنکھیں جسے دیکھ کر نیلے پانی کی جھیل کا گمان ہو۔ قد کے حساب سے بے حد چوڑا سینہ۔ اور گفتگو کا سوفی صدو ہی انداز جو فلموں میں ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ کسی بھی فلم میں وہ اتنے خوبصورت نظر نہیں آتے جتنے خوبصورت تھے۔ میں نے سوچا انہیں دیکھ کر لڑکیاں کھینچی چلی آتی ہوں گی۔

راجکمار دو چار منٹ میں ہی بے تکلف ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک نئی فلم کی شوٹنگ کے لئے لوکیشن دیکھنے آئے ہیں۔ کہانی پر بھی نظر ثانی کررہے ہیں اور یہ کہ دو دن جموں رک کر آئے ہیں۔ جہاں سے ایک فین لڑکی ان کے ساتھ یہاں تک آگئی ہے۔

مظہر امام نے انٹرویو کی بات کہی تو راجکمار نے ہاتھ اور سر ہلا کر کہا کہ پوچھئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مختلف سوال کے جواب میں راجکمار نے بتایا تھا:

۲۸؍ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ باضابطہ پہلی فلم ''رنگیلی'' تھی۔ خاص اور اہم فلموں میں ''گھمنڈ'' لاکھوں میں ایک ''نوشیرواں عادل''، ''مدر انڈیا''، ''گھرانا''، ''اردھانگنی''، ''پیغام''، ''دل اپنا پریت پرائی''، ''دل ایک مندر''، ''اونچے لوگ''، ''کاجل''، ''وقت''، ''پاکیزہ'' وغیرہ ہیں۔ کشمیری پنڈت گھرانے میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ماں باپ نے ان کا نام کلبھوشن رکھا تھا۔ بی اے آنرز تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پولس ٹرینگ لے کر ایک تھانے میں سب انسپکٹر کے پوسٹ پر بحال ہوئے۔ ایک سال میں ہی چور اچکوں

سے دل بھر گیا اور نوکری چھوڑ کر چچا کے پاس چلے گئے۔ وہ خود کو کلبھوشن ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے فلمی نام راجکمار رکھ کر کیریئر شروع کیا۔ اور سہراب مودی کی فلم سے شاہی زندگی جینے کا انداز انہوں نے سیکھا۔ محبوب خاں نے اپنی فلم ''مدر انڈیا'' میں انہیں ''فادر انڈیا'' کا کردار دیا۔ ''وقت'' میں انہوں نے گاؤں کا چولا اتار کر شہری زندگی اپنائی۔ ''وقت'' کے مکالمے تو سپر ہٹ تھے ہی، یہ فلم بھی سپر ہٹ رہی۔ اس کے دو ڈائلاگ انہیں یاد تھے:

''چنائے سیٹھ، جن کے گھر شیشے کے ہوتے ہیں وہ دوسروں کے گھر میں پتھر نہیں پھینکا کرتے۔''

''جانی، یہ بچوں کے کھیلنے کی چیز نہیں۔ ہاتھ کٹ جائے تو خون نکل آتا ہے۔''

فلم ''پاکیزہ'' کے مکالمے کے بارے میں راجکمار نے بتایا کہ ایک ڈائلاگ کوئی بھی عاشق اپنی محبوبہ کو ضرور کہتا ہے ''آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔ انہیں زمین پر مت رکھئے گا میلے ہو جائیں گے۔''

فلمی دنیا میں راجکمار کے بہت کم دوست تھے۔ مردوں میں بی آر چوپڑا کو اور عورتوں میں مالا سنہا کو سب سے قریبی دوست مانتے تھے۔ مالا سنہا انہیں ''بھوشن'' یا ''بھوشی'' کہتی تھیں۔

راجکمار کی سنٹرل لیڈ کی فلمیں ''جنگ باز'' ''ترنگا'' ''بلندی'' ''بے تاج بادشاہ'' ''پبلک پولس'' وغیرہ تھیں۔ بعض ڈائلاگ بیحد مشہور ہوئے۔ شہیر امام اور فرزانہ امام کے ساتھ میں نے اور مبینہ امام نے بھی اصرار کیا تب راجکمار نے بیحد خوش گوار موڈ میں چند ڈائلاگ سنائے:

''ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں۔ ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں۔ (فلم بلندی)

''نہ تلوار کی دھار سے، نہ گولیوں کی بوچھار سے، بندہ ڈرتا ہے تو صرف پروردگار سے۔ (فلم ترنگا)

''ہمیں خیرات لینے کی عادت نہیں ویر سنگھ، ہم تمہیں ماریں گے لیکن وہ بندوق بھی ہماری ہوگی، وہ جگہ بھی ہماری ہوگی، وہ سمئے بھی ہمارا ہوگا۔'' (فلم سوداگر)

''سوداگر'' میں دلیپ کمار کے ساتھ وہ تھے ''وقت'' اور ''ہمراز'' میں سنیل دت ان کے ساتھ تھے۔

لفظ، جانی، راجکمار کا تکیہ کلام تھا۔ لیکن ان کے جرمن شیفرڈ کتے کا نام بھی جانی تھا۔ سگار پیتے ہوئے راجکمار لال جوتے پہنتے تھے۔ فلم انڈسٹری کے لوگ انہیں ''راجا صاحب'' کہنے لگے تھے۔

راجکمار نو بھائی بہن تھے۔ ان کا نمبر پانچواں تھا۔

فلم ''رنگیلی سے قبل'' ''سنو سناتا ہوں''، ''انتظار کے بعد'' ''نرسنگھ اوتار'' اور ''جنم اشٹمی'' جیسی فلموں میں راجکمار مختصر رول کر چکے تھے۔ راجکمار کی بیوی جینیفر سالومن یہودی تھی اور ایئر ہوسٹس تھی جسے وہ گائتری کہتے تھے۔

راجکمار کے پاس دو گھنٹے بیٹھ کر جب ہم رخصت ہونے لگے تو مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت انہوں نے کہا ''زندگی کے کسی بھی لمحے میں ملاقات ہوگی تب میں آپ کو پہچان لوں گا۔

کسی کو بھی متاثر کرنے کے لئے راجکمار کا اپنا انداز تھا۔ ۶۹ سال کی عمر میں ۶۵ فلموں میں کام کرنے والا راجکمار کینسر سے لڑتے ہوئے ۱۹۹۱ میں مر گئے۔ لیکن اپنی یادگار فلموں کے لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ میں ان سے صرف ایک بار ملا تھا مگر ان کی باتیں، ان کا انداز اور ان کی اپنائیت ابھی تک ذہن کے پردے پر رقصاں ہیں۔

☆☆☆

محمد خالد عابدی، بھوپال

مولانا ابوالکلام آزاد اور فلم

بہت سے شاعر و ادیب ایسے گزرے ہیں جن کی شخصیت اور فن مختلف شعبوں میں منقسم تھا۔ لیکن خاطر خواہ مواقع نہ ملنے کی صورت میں وہ اپنے سبھی شعبوں میں نکھر کر سامنے نہیں آسکے یا بعض وجوہ کی بنا پر وہ ان شعبوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ خواجہ احمد عباس اس سلسلے میں خوش نصیب تھے کہ وہ بحیثیت ادیب بھی جانے جاتے تھے اور بحیثیت فلمساز و ہدایت کار بھی کسی حد تک، منشی پریم چند بھی فلمی کہانی نویس کی حیثیت سے پہچانے گئے اور ادیب تو بہر حال وہ تھے ہی لیکن مولانا ابوالکلام آزاد اور فلم کا تعلق کیوں کر ممکن ہے؟ میرے مطالعے میں ابوالکلام آزاد اور فلم کے تعلق سے جستہ جستہ معلومات جمع ہونے لگیں تو میں نے ان منتشر معلومات کو یہاں یکجا محفوظ کرنا مناسب سمجھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ تو کسی فلم میں ہیرو کا رول ادا کیا اور نہ ہی انہوں نے کسی فلم کی ہدایت کاری کی اور نہ ہی کبھی وہ فلم ساز رہے۔ شاعر تو وہ بہر حال تھے ہی لیکن انہوں نے فلم کے لیے کبھی کوئی گیت نہیں لکھا۔ موسیقی سے تو انہیں دلچسپی تھی۔ ''غبار خاطر'' مجموعے میں موسیقی اور فن موسیقی کے بارے میں آپ کو ان کے خیالات مل سکتے ہیں۔ تاہم وہ کبھی کسی فلم کے موسیقار بھی نہیں رہے اور نہ گلوکار۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ تمام فنی اوصاف ودیعت تھے جن سے کسی فلم کی تکمیل کی جاتی ہے۔ مولانا آزاد کیوں کہ مذہبی قسم کے انسان تھے اور شاید یہ بات مشکل سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ فلم کو کوئی حقیر اور لغو چیز سمجھتے ہوں۔ فنون لطیفہ سے تو انہیں غایت درجہ دلچسپی تھی۔ فلم ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں تمام فنون لطیفہ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ فلم میں اداکاری، آرٹ، گیت، کہانی، رقص اور موسیقی وغیرہ سبھی شامل ہوتے ہیں۔

وزارت کے دوران ہی ''فنون لطیفہ'' اور ادبیات کے فروغ کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے اکادمیوں کی بنیاد ڈالی اور تین اکادمیاں وزارت تعلیم کے ایما سے قائم کی گئیں۔ ادب کے لیے ساہتیہ اکادمی، رقص، موسیقی اور ڈرامے کے لیے سنگیت ناٹک اکادمی، اور مصوری کے لئے للت کلا اکادمی۔ ان تینوں اکادمیوں کے سربراہ مولانا ابوالکلام آزاد ہی تھے۔ ان اکادمیوں کا یہی کام نہیں تھا کہ وہ ملک کے مقتدر فنکاروں کو انعام و اکرام تقسیم کریں بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں کے ادبی اور فنی میلانات کو سمو کر انہیں قومی سطح پر ایک فنی وحدت اور فروغ عطا کریں۔

مولانا ابوالکلام آزاد وزارت میں تو بعد میں آئے اور ثقافتی اکادمیوں کا قیام بھی بعد میں ہوا لیکن بہت عرصے پہلے منشی پریم چند نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں کہہ دیا تھا کہ وہ ایسی صلاحیت اور قابلیت رکھتے ہیں کہ اگر مولانا فلمی دنیا اختیار کرلیں تو بہتر مکالمے لکھ سکتے ہیں۔ منشی پریم چند نے حسام الدین غوری کو ۲۱ مئی ۱۹۲۵ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ ''اگر مولانا ابوالکلام آزاد مکالمے لکھیں تو فلموں میں جان پڑ جائے۔ مگر آپ تو جانتے ہیں کہ فلم کی قدر درجہ پنجم کے تماشائیوں پر ہے اور اور یہ اچھے مکالمے کی قدر نہیں کر سکتے۔ مگر خیر یہ لوگ قدر نہ

کریں۔ سمجھنے والے تو کرتے ہیں۔"

اسی سلسلے میں ایک اور اہم خط ملاحظہ فرمائیے، یہ خط مولانا ابوالکلام آزاد کے عزیز مشہور فلم ساز، ہدایت کار، کہانی کار، مکالمہ نویس جناب ناصر حسین خاں کا ہے جو انہوں نے بھوپال کے سیفیہ کالج کے اردو استاد جناب عبدالقوی دسنوی صاحب کو لکھا ہے۔ اس خط سے بھی مولانا ابوالکلام آزاد کا فلمی دنیا کے بارے میں ایک صحت مند نظریہ واضح و قائم ہوتا ہے۔ جناب ناصر حسین خاں لکھتے ہیں کہ "تقسیم ہند کے وقت اور دلی کے فساد کے وقت میں مولانا صاحب کے گھر پر مقیم تھا۔ ڈھائی تین ماہ وہاں رہا۔ اور کافی دنوں تک جب کہ ان کے سکریٹری اجمل خاں صاحب بنگلے پر نہ آسکے تو ان کے فرائض میں نے انجام دیے۔ لکھنے کو میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں مگر چونکہ میرا تعلق فلمی دنیا سے ہے اور پرانی وضع کے لوگ ہم لوگوں کی باتوں کا من گھڑت سمجھتے ہیں، اس لیے اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ دو تین سال ہوئے میرا ایک انٹرویو شمع میگزین میں چھپا تھا اس میں میں نے ذکر کیا تھا کہ جب بحیثیت ایک مکالمہ نویس کے میں نے فلمی انڈسٹری میں قدم رکھا۔

میرے سارے عزیز خفا ہو گئے اور ملنا جلنا بند کر دیا اسی درمیان میں مولانا صاحب بمبئی میں تشریف لائے اور صبح صبح جو میں ان سے ملنے پہنچا تو وہاں میری خالہ اور ماموں بھی موجود تھے میری خالہ صاحبہ نے مولانا صاحب سے شکایت کی کہ میں نے فلم انڈسٹری میں کام کرنا شروع کر دیا ہے تو مولانا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میرے عزیز فلم میں تم کیا کام کرتے ہو میں نے انہیں بتایا کہ ایک فلم کے مکالمے لکھ رہا ہوں اس پر مولانا صاحب نے کہا، میرے خیال سے یہ کوئی بری بات نہیں۔ آنے والے دور میں فلم کی بہت اہمیت ہونے والی ہے۔ رہا بگڑنے کا خطرہ تو وہ انسان پر منحصر ہے وہ کہیں بھی بگڑ سکتا ہے۔ میرے اس انٹرویو کے بعد مجھے اکثر حضرات نے خطوط بھیجے کہ مولانا صاحب کبھی ایسا کہہ نہیں سکتے تھے اور آپ نے مولانا صاحب کے بارے میں یہ لکھ کر انہیں بدنام کیا ہے۔

منشی پریم چند نے یہ بات "فلم کی قدر پنجم درجہ کے تماشائیوں پر ہے" اس وقت کہی تھی جب فلمیں اپنی ابتدائی کوششوں میں تھیں۔ کیوں کہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۱ء تک خاموش فلموں کا زمانہ تھا اور ۱۹۳۱ء سے فلم کو زبان مل گئی تھی، لیکن اس اثناء میں پارسی تھیٹریکل کمپنیوں اور دیگر ڈراما کمپنیوں کے باعث فلمیں، ڈرامے کو مرعوب نہیں کر سکیں بلکہ فلموں پر ڈرامائی اثرات زیادہ حاوی رہے۔ چنانچہ فلموں کے مکالموں کو وہ فوقیت حاصل نہیں ہو سکی جو ڈراموں کے مکالموں کو تھی خواہ وہ مکالمے غیر فطری اور چیخ چیخ کر کیوں نہ بولے گئے ہوں۔ فلموں نے بہت بعد میں اپنا اثر و معیار قائم کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے (مکالمہ نگاری) منشی پریم چند کی تجویز، تفریحاً نہیں تھی بلکہ اس بات میں ان کا وہ تجربہ اور مشاہدہ تھا جو وہ فلمی دنیا میں رہ کر حاصل کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا انداز تخاطب، ان کی تقریر کا انداز، الفاظ اور جملوں کا استعمال تیر بہدف ہوتا تھا، اور یہی وہ فنی نکات تھے جو منشی پریم چند نے محسوس کیے تھے جو کسی دعوے سے کم نہیں تھے۔

مشہور ترین ادیبہ قرۃ العین حیدر نے بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی فلم سے وابستگی کا انکشاف کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے "جنگ" (لندن) کے ۳۔۴ر جون ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ

ایشیا ٹک مووی ٹون لمیٹیڈ لاہور افغان شہزادہ یا ترکی حور فلم کا اشتہار (ماہنامہ تصویر لاہور ۶ رجنوری ۱۹۳۵ء مملوکہ صولت لائبریری رام پور یوپی) ان کی نظر سے گزرا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ "جس کی کہانی ایشیا کے مایہ ناز شاعر علامہ سر محمد اقبال کے جنبش قلم کا نتیجہ ہے۔ مکالمے خواجہ حسن نظامی نے لکھے ہیں"۔ اور "پس نوشت" کے تحت یہ عبارت درج ہے، "مولانا ابوالکلام آزاد کی کہانی اور مکالموں پر مبنی فلم بنگال ٹاکیز کلکتہ نے اناؤنسر (اناؤنس) کی تھی۔ ڈاکٹر (ڈائریکٹر) موہن بوس۔"

"افغانی شہزادہ" یا "ترکی حور" فلم کی جب میں نے اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں شائع فلمیات پر مبنی کتابوں میں تلاش کیا تو مجھے یہ نام نہیں ملا۔ البتہ ۱۹۳۳ء میں میڈن تھیٹرس نے "ترکی شیر" ضرور بنایا تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۴ء میں "افغان ابلا" کے نام سے کمار ایم کی فلم بھی بنی تھی، لیکن "افغان شہزادہ" یا "ترکی حور" نام سے کسی طرح کا ریکارڈ نہیں ملا۔ اسی طرح ایشیا ٹک مووی ٹون کے نام کا ادارہ بھی دیکھنے، سننے اور پڑھنے میں نہیں آیا۔ جو نام عام طور پر پڑھنے میں آئے ہیں وہ اس طرح ہیں، ایشیا ٹک آرٹ پروڈکشن بمبئی، ایشیا ٹک پکچرس بمبئی، ایشین پکچرس اندور اور ایشین فلمز کلکتہ، بہت ممکن ہے کہ یہ فلم اشتہار کی زندگی ہی حاصل کر سکی ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد جس زمانے میں وزیر تھے، ان کے دو سکریٹری ہوا کرتے تھے، ایک سرکاری اور دوسرا غیر سرکاری۔ غیر سرکاری پرائیوٹ سکریٹری جن کا ابھی ابھی اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ آج کے مشہور ترین فلم ساز، ہدایت کار کہانی نویس اور مکالمہ نویس ناصر حسین تھے۔ ناصر حسین مولانا کے عزیزوں میں سے ہیں۔ ان کو فلموں سے دلچسپی تھی چنانچہ وہ فلموں کے لیے کوشاں تھے۔ دریں اثناء سروجنی نائڈو یا پنڈت وجے لکشمی نے مولانا سے کہا کہ آپ بلاوجہ ناصر حسین کو اپنے ساتھ مصروف رکھتے ہیں۔ یہ ایک اچھا آرٹسٹ ہے اسے فلموں میں جانے دیجئے۔

آخرش ناصر حسین (پیدائش بھوپال، ۱۷ نومبر ۱۹۲۶ء) لکھنؤ یونی ورسٹی سے فارسی، انگریزی اور فلسفے میں ایم۔اے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم سے علمی استفادہ کیے ہوئے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں انٹر یونی ورسٹی کہانی نویسی کے مقابلے میں اعزازی کپ حاصل کر چکے ہیں۔

ماہنامہ آجکل دہلی میں کبھی آپ کے افسانے اہتمام سے شائع ہوتے رہے۔ اور ان افسانوں پر انہیں تحائف بھی مل چکے ہیں۔ جب کرشن چندر نے ان کا اسٹیج شدہ ڈراما دیکھا تو بیساختہ کہا تھا کہ یہ شخص اگر فلموں میں جائے تو بے حد کامیاب رہے گا۔

چنانچہ ۱۹۴۶ء میں چھٹیاں گزارنے بمبئی آئے تو ہدایت کار اے آر کاردار (عبدالرشید کاردار) سے ملاقات کی۔ ان کے اسٹوری ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کر لی۔ کاردار کے بعد فلمستان کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ "چاندنی رات، شبستان، انارکلی، منیم جی، پینگ گیسٹ، اور شبنم (دلیپ کمار، کامنی کوشل) وغیرہ فلموں کے مکالمے لکھے۔

پہلی بار فلم "تم سا نہیں دیکھا" کی ہدایت دی۔ اپنا ذاتی ادارہ ناصر حسین فلمز قائم کیا۔ ان کے بیٹے منصور خاں نے فلم "قیامت سے قیامت تک" ڈائریکٹ کی جو کہ ایک ہٹ فلم ہے۔

تفریحی فلموں کے شہنشاہ کہلانے والے ناصر حسین کے چھوٹے بھائی طاہر حسین بھی ہیں جو کہ اوائل میں اداکار کی حیثیت سے متعارف ہوئے تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک جوہو آرٹ تھیٹر سے وابستہ رہے۔ دراصل یہ

ادارہ بلراج ساہنی نے ''اپٹا'' سے نکل کر بنایا تھا۔ طاہر حسین، ہدایت کار، نجم نقوی کے معاون بھی رہے بعدہ سبھود مکرجی اور آئی ایس جوہر کے بھی معاون رہے۔ ناصر حسین کے ساتھ چیف اسسٹینٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی رہے۔ فلم ''دل دے کے دیکھو'' اور ''پھر وہی دل لایا ہوں'' وغیرہ فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول بھی کیے۔ اپنا ذاتی ادارہ ونود کمار کی معیت میں ''ٹی وی فلمز'' قائم کیا اور فلم ''کارواں'' بنائی۔ آجکل یہ ادارہ طاہر حسین انٹر پرائز ز کے نام سے فعال ہے۔ طاہر حسین آجکل کے پسندیدہ ہیرو عامر خاں کے والد ہیں۔ وہی عامر خاں جن کی فلم ''قیامت سے قیامت تک'' نے دھوم مچادی ہے۔ غرض یہ کہ ناصر حسین، طاہر حسین اور عامر خاں، مولانا ابوالکلام آزاد کے خاندان سے ہیں۔ ناصر حسین نے اپنے بھانجے طارق کو بھی فلم سے متعارف کرایا تھا لیکن وہ اس میدان میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور شاعر و فلمی مکالمہ نگار اختر الایمان کے درمیان ''غلط نام'' کا معاملہ بھی کوئی کم دلچسپ نہیں رہا ہے۔ شاعر و فلمی گیت کار جاں نثار اختر مرحوم نے اس کی تفصیل یوں لکھی ہے کہ: ''مولانا ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں ساہتیہ اکادمی نے اردو ادب کی ایک مبسوط تاریخ مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں اردو شاعروں کی جو فہرست تیار کی گئی اس میں اختر الایمان کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اختر الایمان کا نام حذف کر دیا اور کہا کہ جس شاعر نے اپنا نام غلط رکھا ہو وہ صحیح شعر نہیں کہہ سکتا۔ اختر الایمان نے اس واقعہ پر ایک جلی بھنی نظم کہہ ڈالی جس کا عنوان ہے ''میرا نام'' اور جوان کے مجموعے ''یادیں'' میں شامل ہے۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اسی مجموعے ''یادیں'' پر جس میں مولانا آزاد کے خلاف نظم شامل ہے اسی ساہتیہ اکادمی نے اختر الایمان کو ساہتیہ اکادمی اوارڈ بھی دیا۔ اس اتفاق کا اعادہ ایک اور شکل میں ہوا کہ ۸۹۔۱۹۸۸ء میں جب کہ ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی صدی منا رہے تھے، اس صدی تقریبات کے زمانے میں اختر الایمان کو مدھیہ پردیش سرکار کا ''اقبال اوارڈ'' دیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا بالواسطہ یا بلا واسطہ فلموں یا فلم والوں سے تعلق یہیں ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ مشہور اداکارہ نرگس کی والدہ جان بائی جو کہ فلموں میں کہانی نویس، موسیقار، اداکار اور ہدایت کار وغیرہ بھی ہوا کرتی تھیں کے نام کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام دستاویزوں میں اس طرح محفوظ ہو گا کہ موہن بابو جو مولانا ابوالکلام آزاد کے باعث مشرف بہ اسلام ہو کر عبدالرشید ہو گئے تھے۔ جدن بائی اور عبدالرشید کا مولانا آزاد نے نکاح پڑھایا تھا۔

بہر حال آپ انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل کرنا کہیں، یا کہیں کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ مولانا آزاد کو ایک بار نہیں دوبارہ پردہ سیمیں پر پیش کیا جا چکا ہے۔ پہلی بار منوج کمار کی فلم کرانتی میں انہیں قومی ہیرو کی تصاویر میں دکھایا گیا اور دوسری بار فلم گاندھی میں ان کو کیریکٹرائز کیا۔ ٹی۔ وی۔ کے چھوٹے پردے پر بھی ان کا کردار پیش کیا گیا ہے۔

☆☆☆

رشید انجم، ۴۷۔کاشانہ۔اسلام پورہ، بھوپال

ہندوستانی فلموں میں طرزِ معاشرت

ماضی بعید اور ماضی قریب میں جن ہندوستانی فلموں میں مسلم طرز معاشرت کو نمائندگی دی گئیں وہ فلمیں سنیما کی تاریخ کے اوراق پر محفوظ ہیں۔ ہندوستان میں فلموں کے آغاز ۱۹۱۳ء سے ہی اولاً ہندو میتھولوجی پر جو فلمیں بڑی تعداد میں تخلیق کے مراحل سے گزریں، اس دور میں تو نہیں مگر جیسے جیسے سنیما ارتقائی ادوار طے کرتا گیا، فلم کے موضوعات بھی بدلتے گئے۔ ابتدائی دور میں جو دوسرے فلم ساز سنیما کے تخلیقی سفر میں شامل ہوئے ان کی طرز فکر جدا پائی گئی۔ دراصل اس طرز فکر کا محرک وہ اسٹیج تھا جو اردو تھیٹر کے نام سے جانا گیا اور جہاں اردو ڈراموں کا ایک طویل سلسلہ قائم تھا۔ اسی اردو تھیٹر نے جب سنیما کے توسط سے فلموں میں اپنا وجود درج کرایا تو ہمارے فلموں میں وہ معاشرہ ترتیب پایا جس میں ایک خاص تہذیب اور طرز زندگی کو نمائندگی دی گئی تھی۔ فلم شائق آغاز سے ہی اردو زبان کی لطافت، شگفتگی اور شیریں لب ولہجہ کا گرویدہ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آغاز سے اب تک اردو زبان ہماری فلموں سے اپنا دامن نہیں چھڑا پائی۔ اردو زبان کی اسی شگفتہ ساز "برکت" نے مسلم طرز معاشرت کو فلموں کی اس جمالیاتی کیفیت سے آشنا کیا جس کی بازگشت صدی گزرنے کے بعد بھی گونج رہی ہے۔ ہندوستان کا ہر وہ فلم بین طبقہ یا فرد جو علاقائی زبانوں کا اسیر رہتا ہے آیا ہے یا وہ افراد جو اردو زبان سے ناواقف ہیں، ہر وہ فلم، ہندوستان کے غیر اردو داں علاقوں میں بھی کامیاب رہی جس میں اردو زبان کے مکالمے اور نغمے ہوا کرتے تھے اور ہیں۔ اور وہ فلم بھی کامیاب رہی جس میں مسلم طرز معاشرت دکھایا جاتا رہا ہے۔ ایسی کئی فلموں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ مثلاً نور جہاں، عدل جہانگیر، تاج محل، انارکلی، مغل اعظم، میرے محبوب، میرے حضور، چودھویں کا چاند، بے نظیر، رضیہ سلطان، پاکیزہ اور امراؤ جان وغیرہ، یہ چند فلمیں ہیں جو مثال کے طور پر پیش کی گئیں۔

سنیما کی تاریخ ایسی فلموں کی امانت دار ہے اور اس کے اوراق شاہد ہیں کہ مسلم معاشرے، مسلم تہذیب (خواہ وسماجی ہو، تاریخی ہو یا عام زندگی سے متعلق ہو) فلم بین کو متاثر کرتی رہی ہے۔ ان میں تمام فلمیں ہی کامیاب نہیں رہیں۔ مگر جو باکس آفس پر کمزور رہیں یا باکس آفس کلکشن نہیں کر پائیں۔ فلم بین کو کہیں نہ کہیں متاثر کرنے میں ضرور کامیاب رہیں۔ مسلم تہذیب نے جب ہندوستان کی وسیع تر سماجی، سیاسی، جغرافیائی زمین کو اپنی گرفت میں لیا تو سنسکرت اور ہندی کے علاوہ دیگر زبانوں کا پروردہ یہ ملک اپنے محدود ماحول کا اسیر تھا اور کسی اور معاشرے سے واقف نہیں تھا اولاً عربوں کی آمد اور صوفیائے کرام کے ورود سے اس ملک کا نظام مرتعش ہوا۔ زاں بعد ترک، مغلوں اور پٹھانوں نے جب ہندوستان کے سیاسی نظام پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کیا تو یہاں کا طرز زندگی بھی اثر انداز ہوا۔ اور عوام فارسی، ترکی اور اردو زبان کے ساتھ مسلم طرز معاشرت سے نہ صرف واقف ہوئے بلکہ اس وسیع ملک کی دور دراز بستیاں بھی اس معاشرت کی طلسمی کیفیات کو جذب کرنے سے خود کو روک نہ پائیں۔ مسلم حکمرانوں

نے اس ملک کا تمام تمدنی اور سماجی ڈھانچہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ صدیاں اس نظام حکمرانی کی گواہی ہیں کہ نہ صرف خواص بلکہ عوام کے گھروں میں فارسی اور پھر اردو زبان روزمرہ کا لہجہ اور تخاطب بن چکی تھی۔

نظام بدلا، انگریز آیا تو اپنی تہذیب اور معاشرے اس قدر ہندوستانی ذہنوں پر اثر انداز ہوا، اس کے باوجود کہ انگریز کو نفرت اور حقارت گردانتے ہوئے کوئی بھی ہندوستانی انگریز کی زبان اور اس کی طرز معاشرت کو اپنانے سے گریز نہیں کر سکا۔ لیکن اردو زبان اپنی رواں دواں بول چال اور شائستہ تخاطب سے شکست پزیر نہیں ہو سکی۔ اردو شاعری نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ اس طرح کہ کسی زبان میں شاعری کا وہ لہجہ، وہ جمال، وہ تشبیہی ضابطہ اور نغمگی کی شدت میں ڈھلتا زبان کی مینا کاری کا نقش گر احساس مفقود رہا ہے۔ شعری اور نثری دونوں طرح اردو زبان ہر ذہن کو مسخر کرنے میں کامیاب رہی اور جب نغموں نے زبان حاصل کی تو فلمیں اردو زبان سے ہی آبرو مند رہیں اور آج بھی ہیں۔

عرق ریز گہری تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ خاموش فلمی دور میں ہی ایسی فلمیں بن کر تیار ہوئیں جو خاص مسلم طرز معاشرت پر بنی تھیں۔ ہندوستان پر یوں تو مختلف خاندانوں نے صدیوں حکومت کی لیکن مغلوں کے حکمرانی دبدبے، ان کی شان و شوکت، انصاف پسند فطرت اور ان کی محلاتی زندگی نے ہندوستان کے ہر فرد کو اپنی طلسماتی قوت میں اسیر کر لیا۔ اس طلسماتی قوت کی کشش ہر فرد نے تب محسوس کی جب فلم سازوں نے اسے اپنا موضوع بنا کر فلموں کی تخلیق کی۔ صرف مغل حکمرانوں کے تقریباً ہر بادشاہ کو فلموں کا کلیدی کردار بنایا گیا اور وہ فلمیں گو کہ موضوع کے لحاظ سے یکساں تھیں مگر ان کی پیش کش اور منظر نامے کی سحر انگیز تپش کبھی کمزور ثابت نہیں ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کی مکالماتی زبان تو تھی ہی اردو شاعری نے بھی جب راگ راگنیوں کے قلب میں دھڑکتے فلمی نغموں کا روپ اختیار کیا تو ہر دیکھنے اور سننے والا اس جادو صفت ''آشوب'' سے خود کو بچا نہیں پایا اور ان کا پابند ہوتا چلا گیا۔

خاموش اور متکلم عہد میں مسلم طرز معاشرت کو جن فلموں میں پیش کیا گیا وہ فنتاسی بھی تھیں، جادوئی اور کرشماتی فلمیں بھی تھیں۔ تاریخ اخذ کیے واقعات پر مبنی بھی تھیں اور روحانیت کی آخری حدوں کو چھوتی فلمیں بھی تھیں۔ وہ فلمیں بھی تیار ہوئیں، پاکیزگی جن کا ایموشنل ٹریٹمنٹ رہا اور وہ فلمیں بھی جو ایمان یقین کے ساتھ ہی اولیاء کرام کی صوفیانہ تعلیم پر مبنی رہیں۔ مسلمانوں کے ایک طبقے کے اعتقاد (قبر پرستی) کی مظاہر تھیں۔ وہ فلمیں بھی جو اردو زبان و ادب کی قدآور شخصیات کی ادبی اور شعری خدمات پر مبنی تھیں۔ ان سبھی فلموں میں مسلم طرز معاشرت اور طرز حیات کو فلم کی بندشیں دی گئیں۔

یہ سلسلہ شروع ہوا خاموش فلموں کی تخلیق کے اس عہد سے جب اردشیر ایرانی نے اپنی فلم سازی کا آغاز کیا۔ ابتدائی خاموش عہد میں داستان الف لیلیٰ کی کچھ کہانیوں پر فلمیں بنائی جا چکی تھیں۔ مثلاً، گل بکاولی، (۱۹۲۴ء)۔ اس قسم کی فلمیں فنتاسی تھیں۔ اردشیر ایرانی نے ۱۹۲۶ء میں آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کو منتخب کیا اور ''صید ہوس''

کے نام سے خاموش فلم بنائی۔ گو یہ بے زبان فلم تھی مگر مسلم ماحول کو اسی فلم سے پہلی بار بڑھاوا حاصل ہوا۔ انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، ہمانشو رائے نے ۱۹۲۷ء میں ''شیرازی'' اور ''لوآف اے گریٹ مغل پرنس'' اور اردو شیر ایرانی نے ''انارکلی'' بنائیں۔ ۱۹۲۸ء میں اردو شیر ایرانی نے فلم ''نور جہاں'' بنائی جو مغل بادشاہ جہانگیر کے انصاف پسند دور حکمرانی کی پہلی مرعوب کن فلم تھی۔ زاں بعد اس فلم نور جہاں کو ۱۹۳۱ء میں زبان دیدی گئی۔

طوالت سے بچنے کے لئے میں چند اہم فلموں کا ہی ذکر کروں گا۔ جن میں مسلم طرز معاشرت کو کمال خوبی اور ہنر مند فلم سازی سے تخلیق کیا گیا تھا۔ متکلم فلموں کی ابتدا ہی مسلم طرز حیات پر بنائی گئی فلم ''عالم آرا'' ۱۹۳۱ء سے ہوئی تھی۔ یہ فلم کسٹیوم تھی مگر اس کا پوراپس اور پیش منظر مسلم ماحول کی عکاسی کرتا تھا۔ اسی خاموش دور میں وہ فلمیں بھی بنائی گئیں جو عشق و محبت کی لازوال داستانوں کو بیان کرتی تھیں۔ لیلی مجنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہیوال، وامق وعذرا، ہیر رانجھا، مرزا صاحبان وغیرہ۔ یہ تمام فلمیں شدت جذبات اور عشق کی بے پناہ کیفیات سے معمور فلمیں ہیں۔ یہ تمام فلمیں گو کہ مسلم ماحول کی عکاسی ہیں۔ لیکن الگ الگ طرز معاشرت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جیسے لیلی مجنوں سرزمین عرب کے ماحول کی منعکس ہے۔ شیریں فرہاد ایرانی طرز معاشرت کی، سوہنی مہیوال، مرزا صاحبان اور ہیر رانجھا ہندوستان کے پنجاب علاقے کے اس ماحول کی عکاس ہیں جو ہندو مسلم کی ملی جلی تہذیب رہی۔ ان فلموں کے علاوہ زیادہ تر اردو فلمیں تیار ہوئیں جو صرف الف لیلی اور قصہ ہزار داستان سے اخذ کی گئیں تھیں۔ مثلاً حاتم طائی، حاتم طائی کی بیٹی، حاتم طائی کا بیٹا، علادین اور جادوئی چراغ، علی بابا اور چالیس چور، گل بکاؤلی، گل صنوبر، شاہی لکڑہارا، تھیف آف بغداد، چہار درویش، سیر پرستان، بخی لٹیرا، بلبل ایران، لعل یمن، سند باد جہازی وغیرہ۔ ایسی فلمیں بھی آئیں جو طبع زاد اردو ڈراموں پر مبنی تھیں۔ 'صید ہوس'، خواب ہستی، یہودی کی لڑکی، پاک دامن رقاصہ، زہر عشق، نیکی کا تاج، اور نیک پروین وغیرہ۔ مغل بادشاہوں کے عشق، حسن تدبر، جنگی فراست اور عدل و انصاف پر اب تک جو فلمیں تیار کی گئیں وہ محلات کے اندرون شاہی مسلم ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ 'نور جہاں' (۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۱ء)، انارکلی (۱۹۲۷ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۳ء)، عدل جہانگیر (۱۹۳۴ء اور ۱۹۵۵ء)، جہاں آرا (۱۹۳۵ء اور ۱۹۶۴ء)، پکار (۱۹۳۹ء) تاج محل (۱۹۴۱ء، ۱۹۶۳ء اور ۲۰۰۵ء)، شہنشاہ اکبر (۱۹۴۳ء)، ممتاز محل (۱۹۴۴ء اور ۱۹۵۷ء)، شہنشاہ بابر (۱۹۴۴ء)، ہمایوں (۱۹۴۵ء)، شاہ جہاں (۱۹۴۶ء)، ملکۂ عالم نور جہاں (۱۹۴۵ اور ۱۹۶۷ء)، بابر، لال قلعہ اور مغل اعظم (۱۹۶۰ء) شیر افگن (۱۹۶۶ء) اور جودھا اکبر (۲۰۰۸ء) مغل بادشاہوں کے علاوہ جن بادشاہوں، یا بادشاہ زادیوں نے ہندوستان پر حکومت کی یا ہندوستان کے قطعہ ارض پر حکمراں رہے۔ ان پر جو فلمیں بنائی گئیں ان فلموں میں مغل سلطنت سے بالکل جدا مسلم طرز معاشرت دکھایا گیا ہے۔ ایسی فلمیں ہیں۔ سلطانہ چاند بی بی، (۱۹۳۶ء)، باز بہادر اور ٹیپو سلطان (۱۹۵۹ء) نواب سراج الدولہ (۱۹۶۷ء)، رضیہ سلطان اور رضیہ سلطانہ (۱۹۸۳ء) ان بادشاہ اور بادشاہ زادیوں کے علاوہ جن بیرون ہند باصلاحیت اور منصف مزاج مسلم حکمرانوں اور جاں باز مجاہدوں پر فلمیں بنیں ان میں سپاہیانہ مسلم شان نمایاں تھی۔

شاہ بہرام (۱۹۳۵ء)، غازی صلاح الدین (۱۹۳۹ء)، بیرم خاں (۱۹۴۶ء)، رستم سہراب (۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء اور ۱۹۶۳ء)، نوشیروان عادل (۱۹۵۷ء) ان میں رستم سہراب اور شاہ بہرام علاقہ فارس کی ماورائی داستان پر مبنی فلمیں تھیں۔ اہل فارس آتش پرست تھے مگر چونکہ ان کے نام نسبتاً مسلم تھے اور ان کا ماحول بھی مسلم معاشرے سے ملتا جلتا رہا اس لیے اسے مسلم طرز زندگی کی نمائندگی حاصل ہوئی ان کے علاوہ 'ہلاکو' (۱۹۵۶ء) 'خاقان' اور 'چنگیز خاں' (۱۹۵۷ء) میں وہ ماحول دکھایا گیا تھا جو تھا تو غیر اسلامی مگر مسلم طرز معاشرت سے ملتا جلتا تھا۔ یہودی کی بیٹی (۱۹۵۷ء)، یہودی کی لڑکی (۵۷-۱۹۳۳ء) اور یہودی (۱۹۵۸ء) سکندر (۱۹۴۰ء)، سکندر اعظم (۱۹۶۵ء) اور نادر شاہ (۱۹۶۸ء) یہ فلمیں مختلف ماحول کی عکاس رہ کر بھی مسلم طرز معاشرت پر مبنی رہیں۔ "پاک دامن" (۱۹۳۱)، 'پاک دامن رقاصہ' (۱۹۳۲ء)، 'خدا دوست'، 'شان سبحان' اور 'نور ایمان' (۱۹۳۳ء) 'فدائے توحید' (۳۶-۱۹۴۳ء) 'خاک کا پتلہ'، 'نیکی کا تاج'، 'نور اسلام' 'شان خدا'، اور 'میرا ایمان' (۱۹۳۴ء)، 'اللہ کا انصاف' (۱۹۳۵ء) نور وحدت (۱۹۳۶ء)، خدا کا فیصلہ (۱۹۳۶ء) فخر اسلام (۱۹۳۷ء)، نئی تعلیم (۱۹۴۹ء) 'دیار حبیب'، 'نور یمن' (۱۹۵۶ء) 'ہماراج'، اور 'شان حاتم' (۱۹۵۸ء) 'حاتم طائی کی بیٹی' اور 'عبداللہ' (۱۹۶۰ء)، زیارت گاہ ہند (۱۹۷۰ء)، 'میرے غریب نواز' (۱۹۷۳ء) 'دیار مدینہ' (۱۹۷۵ء)، 'نور الٰہی' 'نیاز و نماز' (۱۹۷۶ء)، سلطان ہند (۱۹۷۸ء) 'اولیائے اسلام، دین اور ایمان اور مدینے کی گلیاں (۱۹۷۹ء)، فرض اسلام، لبیک، سید وارث شاہ، بابا حاجی ملنگ اور قوت پروردگار (۱۹۸۰ء)، خواجہ کی دیوانی اور ولی اعظم (۱۹۸۱ء)، بندہ نواز (سلطان دکن) اور کعبہ (۱۹۸۲ء)، بسم اللہ کی برکت (۱۹۸۳ء) یہ وہ فلمیں تھی جو اسلام کی بنیادی تعلیم ایک خدا پر ایمان، فرائض حق و یقین پر مبنی تھیں ہی لیکن ان میں وہ مسلم ماحول منعکس ہوا جو غربت اور فقیرانہ شان کا مظہر تھا۔ ایسی فلمیں بھی بنائی گئیں جو عصمت اور پاکیزگی کا ایمان پرور انتخاب تھیں۔ پاک دامن رقاصہ، روشن آرا (۱۹۳۲ء)، اینہ (۱۹۳۴ء)، عصمت کا موتی (۱۹۳۵ء)، چراغ حسن (۱۹۳۵ء) رشیدہ، سلیمہ، یاسمین (۱۹۳۵ء) پاک دامن (۱۹۴۰ء) 'نجمہ' (۱۹۴۳ء)، 'عصمت' اور 'بیگم' (۱۹۴۴ء)، 'بھائی جان' اور 'زینت' (۱۹۴۵ء) 'نرگس' 'نیک پروین' ریحانہ' (۱۹۴۶ء)، 'عابدہ' اور 'درد' (۱۹۴۷ء) انجمن، شہناز اور شوہر (۱۹۴۸ء)، بانو، چلمن اور کنیز (۱۹۴۹ء)، رشید دلہن اور پردہ (۱۹۵۰ء)، عبرت (۱۹۵۴ء)، پاک دامن اور نیلوفر (۱۹۵۷ء)، نیک خاتون (۱۹۵۹ء) لبنا (۱۹۸۱ء)، سلمیٰ (۱۹۸۵ء)، انجمن (۱۹۸۶ء) یہ فلمیں مسلم خواتین کو محور بنا کر فلم کے سانچے میں ڈھالی گئی تھیں ان فلموں میں اس ماحول کی نمائندگی ہوئی جو محلوں سے لیکر عام سماجی زندگی کا مظاہر ہے۔ ان تمام فلموں میں عورت کے پاکیزہ اور عفت مآب کردار کو پیش کیا گیا تھا۔ جو شوہر کے ظلم سہہ کر، معاشرے کی نفرت کا شکار ہو کر آفات و غربت کی کرب خیزیت میں بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑتی اور بالآخر بنا کسی تکبر اور خودنمائی کے فتح یاب ہوتی ہے۔

فلم پھول (۱۹۴۵ء) کے آصف مرحوم کی پہلی فلم جس میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم ڈاکٹر کو عین نکاح کے موقع پر شادی سے انکار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا جو تحریک خلافت میں شامل ہو کر وطن پرست نوجوانوں کی نمائندگی کرتا

ہے۔ فلم 'درد' (۱۹۴۶ء) کا کردار کی وہ نا قابل فراموش فلم جس میں یتیم و بے کس بچوں کی حالت زار و امارت و غربت کے درمیان طبقاتی خلیج اور عشق و حسن کا باہمی ربط، سماج و معاشرے کی نا قبولیت کو کمال ہنر مندی سے کاردار نے پیش کیا تھا۔ ہندوستان کے عام مسلمانوں کے معاشرتی نظام حیات اور تباہ ہوتی اقدار پر کئی موثر فلمیں تخلیق کی گئیں۔ 'افضل'، 'عید کا چاند' 'زہر عشق' (۱۹۳۳ء) 'ورد دل' اور 'سلطانہ' (۱۹۳۴ء)، 'آہ مظلوماں' (۱۹۳۵ء) 'شہید محبت' (۱۹۳۶ء)، 'دلبل کی آرزو' اور خان بہادر' (۱۹۳۷ء)، 'مراد' (۱۹۳۹ء) 'مسلم کا لعل' (۱۹۴۱ء)، 'آداب عرض' (۱۹۴۳ء)، 'بڑے نواب صاحب اور بیگم (۱۹۴۴ء) ، 'غزل' (۱۹۴۵ء) 'خان صاحب' (۱۹۴۶ء)، 'دامن' (۱۹۵۱ء) 'چاندنی چوک' 'ناز'، دروازہ' (۱۹۵۴ء)، 'میرا اسلام' (۱۹۵۷ء) 'لالہ رخ' (۱۹۵۸ء) 'سلام محبت' (۱۹۶۰)، 'آسمان محل' (۱۹۶۴ء)، 'شطرنج کے کھلاڑی' (۱۹۷۷ء) 'اور 'دہلیز' (۱۹۸۶ء) ایسی فلمیں بھی بنائی گئیں جو اردو شعر و ادب کی قد آور کی شخصیات کی حیات اور معاملات کی عکاس رہیں۔ 'عمر خیام' (۱۹۴۶ء)، 'شاعر' (۱۹۴۹ء)، 'مرزا غالب' (۱۹۵۴ء)، 'شاعر کشمیر مہجور' (۱۹۷۲ء) اور 'محافظ' (شاعر نور لکھنوی۔ ۱۹۹۳ء) میں وہ ماحول پیش ہوا جسے ہم خالص اردو شعر و ادب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ان تمام فلموں کے سرسری جائزے کے بعد اب آیئے ان فلموں پر جنھوں نے اپنی تخلیق کے دور میں زبردست کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اور جو آج تک فلم بین کو متاثر کرتی آ رہی ہیں۔ دہلی، حیدرآباد اور لکھنو یہ تین شہر وہ ہیں جو ایک ہی تہذیب کی الگ الگ نمائندگی کرتے آئے ہیں۔ ان تینوں شہروں میں قدر مشترک مسلم طرز معاشرت ضرور ہے مگر تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ یہ فرق ہے اردو زبان کا لہجہ اور اس کی اثر آفریں نزاکت کے ساتھ لباس اور ذائقے ان تینوں شہروں میں لکھنو اپنی رومان پرور حکایات لیے ہمارے ہونٹوں پر پھول کی پتی کے پہلے بوسے کی مانند دھڑکتا آ رہا ہے۔ فلم سازوں نے ہماری اس جذباتیت سے فائدے اٹھائے اور وہ فلمیں تخلیق کیں جن فلموں نے ہماری طلب اور تلاش کو نغمہ بدوش کہانیوں سے شرر بار کر دیا۔ ان میں وہ فلمیں خاص ہیں جو لکھنو کی رومان پرور سرزمین پر فلمائی گئیں اور نوابان اودھ کے ساتھ اہل اودھ کی طرز معاشرت کے ساتھ تخلیق کی گئیں متاثر کن فلمیں ہیں۔ بڑے نواب صاحب (۱۹۴۴ء)، بیگم (۱۹۴۵ء)، مہندی (۱۹۵۸ء) چودھویں کا چاند (۱۹۶۰ء)، 'میرے محبوب' اور بے نظیر' (۱۹۶۳ء) غزل (۱۹۶۴ء)، عید کا چاند اور آسمان محل (۱۹۶۴ء)، بہو بیگم (۱۹۶۶ء) پالکی اور میرے حضور (۱۹۶۷ء) ، نواب صاحب اور جنون (۱۹۷۸ء)، امراؤ جان (۱۹۸۱ء)، نکاح، بازار اور ویدار یار (۱۹۸۲ء) ، طوائف (۱۹۸۵ء)، انجمن اور دہلیز (۱۹۸۶ء)، تہذیب (۲۰۰۳ء) ان میں زیادہ تر فلمیں لکھنو کی رومان پرور معاشرے کی دین ہیں۔ ان تمام فلموں کے جائزے سے یہ ثابت ہوا کہ ہماری فلموں میں نہ صرف اردو زبان، شعر و شاعری، بلکہ مسلم طرز معاشرت کو ایک حقیقت پرور عکاسی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

☆☆☆

پروفیسر شاکر خلیق (ممبر، ان۔سی۔پی۔یو۔ایل، حکومت ہند، دہلی) محلہ شاہ سوپن، دربھنگہ (بہار)

اردو کی کہانی فلموں کی زبانی

اس ملک کے لوگوں کو جوڑا ہے محبت سے — ہر کھیت کی مٹی ہے دریاؤں کا پانی ہے
سکھ اور عیسائی سے ہندو سے مسلماں سے — اردو کی کہانی ہے فلموں کی زبانی ہے

اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب Composite culture کی سب سے بڑی دین اور انڈو اسلامک کلچر کی نمائندہ زبان ہے۔ شروع شروع اسے مختلف ناموں جیسے ریختی، ہندوی، ہندوستانی وغیرہ سے جانا گیا لیکن آخر کار ''اردو'' کے نام سے ہی یہ زبان پھولتی اور پھلتی ہوئی آج اس مقام پر براج مان ہے جہاں اس کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ یہ ایک تہذیب، ایک کلچر ایک طرز زندگی اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کا بہترین نمونہ ہے۔ ابتدا سے آج تک اردو کے خوبصورت لباس میں موتی اور زر و جواہرات پرونے اور اس کے دامن کو رنگ برنگے پھولوں سے بھرنے کا کام مادر وطن کے ان بے شمار سپوتوں نے انجام دیا جن کا تعلق مختلف مذہب و قوم سے تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اردو نے مادر وطن کے ہر حصے کو مضبوط رشتوں میں جوڑنے کا کام کیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے پھولوں اور کلیوں کو اپنے اندر سمیٹ کر اردو نے ایک ایسا حسین گلدستہ بنایا جس کی خوشبو اور جس کے رنگ و روپ نے ساری دنیا کو چکا چوند کر دیا۔ اردو کے دامن میں قومی یکجہتی National Integration کا بہترین سرمایہ اور قومیت Nationality کی بہترین پونجی محفوظ ہے۔

اردو نے سنسکرت سے گھن گرج، کھڑی بولی اور برج بھاشا سے لوچ و لچک، ہریانوی اور پنجابی سے بنتی الھڑپن، دکھنی ہندوستان کی زبانوں سے سانولا اور سلوناپن، اور مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں کی شیرینی اور مٹھاس سے ایک ایسا رنگ و روپ نکھارا کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی ہمت کسی کو نہ رہی۔

کشمیر کی دل فریب وادیوں سے حسن و نکھار، آسمان کو چومتی ہوئی ہمالہ کی چوٹیوں سے بلندی، گنگا اور جمنا کی بل کھاتی ہوئی لہروں سے روانی، دکن کی سنگلاخ مضبوط چٹانوں سے ہمت و حوصلہ اور سمندر کے کناروں سے وسعت و پھیلاؤ کو سمیٹ کر اردو نے خود کو سنوارا اور سجایا ہے۔

اردو حضرت امیر خسرو کے دوہوں اور کہہ مکرنیوں کے ذریعہ عوام سے رشتہ جوڑتی ہوئی، گول کنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کی سیر کرتی ہوئی، بادشاہوں کے محلوں سے کتراتی اور گلیوں کوچوں، میلوں ٹھیلوں میں پھرتی ہوئی، گلبرگہ کے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے آستانہ سے ہوتی ہوئی مرہٹوں اور پیشواؤں کے درباروں کی سیر کرتی ہوئی نہایت بے نیازی سے اپنا سفر اختیار کرتی رہی۔

اردو اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے جب فلم انڈسٹری کے روپہلے پردے تک پہنچتی ہے تو کیمرے کی آنکھوں نے اس کے روپ و بہروپ کو اور بھی نکھارا اور ابھار کر دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا اور موسیقی نے سننے

والوں کے کانوں میں رس گھول دیا۔ فلم سے عوام کا براہ راست رابطہ ہے اور اس طرح اردو نہ صرف ہندوستان کے عام لوگوں تک پہنچی بلکہ اس نے ملک کی سرحدوں سے باہر نکل کر بھی اپنے حسن کے جادو سے دنیا کو موہ لیا۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری کے شاندار سو سال کو کامیابی اور بلندی عطا کرنے میں اردو نے سب سے بڑا رول ادا کیا ہے۔ اگر ایک طرف اردو کے سدابہار گانوں کے میٹھے بول سننے والوں کے کانوں میں رس گھولتے اور دلوں کو چھو لیتے ہیں تو دوسری طرف اس کے زوردار مکالمے Dialogue اپنے کرداروں Characters کے رول کو اور بھی اجاگر کرتے ہیں۔ اردو کے گانوں اور Dialogue کے بغیر آج تک ایک بھی فلم کامیاب نہیں ہوسکی۔ جب بھی کسی فلم میں اردو کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ فلم فلاپ ہوئی اور ہندوستانی عوام نے اسے مسترد کر دیا۔

'اردو کی کہانی فلموں کی زبانی' کے ذریعہ جو نظریہ پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کے فروغ میں اردو کی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے ایک طرف تو اس کے خلاف ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے اور دوسری طرف اس سو فی صد ہندوستانی زبان کی سادگی، شیرینی، روانی اور برجستگی کے ذریعے ہر ہندوستانی کے دل تک پہنچا جا سکے۔

اردو کم و بیش سو سال قبل ہندوستانی فلم انڈسٹری تک پہنچی ہے مگر شروع کے بیس سال کا زمانہ خاموش فلموں کا زمانہ تھا اس لئے صرف اسی سال پر محیط فلموں کا سرسری جائزہ پیش کیا جا سکے گا۔ یہاں اس امر کی وضاحت کرتا چلوں کہ سن ۱۹۹۰ء کی دہائی میں راقم الحروف ایک بڑے پروجکٹ پر کام کر رہا تھا جس کی رو سے بہ یک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں "The Contribution of Urdu towards growth and development of film industry" کے موضوع پر کتاب آنی تھی۔ بعد ازاں ۱۹۹۵ء میں اس وقت کے مشہور فلم پروڈیوسر مرحوم طاہر حسین (مشہور فلم اداکار عامر خاں کے والد) کے ایما پر ایک ٹی۔ وی سیریل بنام ''اردو کی کہانی فلموں کی زبانی'' بنانے کی بات طے ہوئی جس پر بہت دور تک کام ہوا۔ اس کی تفصیل راقم الحروف کے مضمون ''آہ طاہر حسین'' مطبوعہ روزنامہ قومی تنظیم پٹنہ بابت ستره فروری ۲۰۱۰ء میں آ چکی ہے۔

اردو اس مہان بھارت کی عظیم زبان ہے۔ ہندوستان ہی میں پیدا ہو کر اس نے ہر ہندوستانی کے دلوں کو مضبوط رشتوں میں جوڑنے کا کام کیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں جیسے کھڑی بولی، برج بھاشا، پنجابی، ہریانوی، مراٹھی اور بنگالی وغیرہ کا رنگ، یہاں کے پھولوں کی خوشبو، یہاں کے پھلوں کی مٹھاس، یہاں کے دریاؤں کی روانی، یہاں کے پہاڑوں کی بلندی، یہاں کی رسموں اور رواجوں کی عظمت اور یہاں کے خوش نما تہواروں کے جوش و خروش سب کو اردو نے اپنے رنگ محل کے جگمگاتے ہوئے طاقوں میں سجا رکھا ہے۔ اردو نے وطن کو کبھی ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دے کر اور کبھی ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' کا مطلب بتا کر ہمیشہ اس دعوے کو سچا کر دکھایا ہے کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ کے اوراق الٹیے اور غیر جانب دارانہ فیصلہ کیجیے تو آپ کو اس نتیجہ پر پہنچنے

میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ اردو کے مکالمے (Dialogue) اور اردو کے نغموں Songs کے بغیر کوئی بھی فلم باکس آفس پر کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہندستانی فلم انڈسٹری کی پہلی بولتی ہوئی فلم Talkie Film ''عالم آرا'' سن ۱۹۳۱ء میں بنی تھی، سن ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۱ء کے درمیان بنی ہوئی فلموں کے رکارڈس اور Negatives اب دستیاب نہیں ہیں۔ حاصل شدہ مواد کی روشنی میں ہندوستانی فلموں کے ذریعہ اردو کے ارتقائی سفر کا جائزہ دراصل اردو کی انہیں خدمات کا اعتراف اور اظہار ہے جن کی بدولت آج اردو کے سدابہار نغمے ہر ہندوستانی کے ہونٹوں پر مچلتے اور اس کے زوردار مکالمے Dialogue کانوں میں گھن گرج پیدا کرتے ہیں۔

فلم ''عالم آرا'' کے ساتھ اردو جب ہندوستانی فلم انڈسٹری کے روپہلے پردے تک پہنچتی ہے تو اس کے رنگ و روپ نے کیمرے کی آنکھوں کو اور بھی چکاچوند کر دیا۔ اس کے حسن پر فدا اور اس کے جادوئی اثر و کشش سے مدہوش ہو کر فلم انڈسٹری اس کے عشق میں پاگل ہو گئی اور اسی جنون میں انڈسٹری دن دونی رات چوگونی ترقی کرتی ہوئی آج اس مقام پر براجمان ہے جہاں اردو کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

فلمی دنیا میں اردو کے استعمال اور اس کے ارتقائی سفر کا جائزہ لینے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف ادوار میں کامیاب فلموں کے اندر اردو نغموں اور مکالموں کے عمل دخل کو قارئین کرام کے روبہ رو پیش کیا جائے۔ ڈرامائی اور تمثیلی ادب میں کرداروں کے ذریعہ پیش کئے گئے مکالمے اور اداکاری کے مابین گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ڈرامہ کے نکتہ عروج Climax تک ناظرین و قارئین کی رسائی Suspense کے ختم ہونے کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

اس ضمن میں نمونتاً مشتے از خروارے کے بطور مختلف میدانوں میں ان چند ہستیوں کے نام پیش کئے جاتے ہیں جن کی کاوشوں سے فلم انڈسٹری میں اردو کا فروغ ہوتا رہا۔ فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے محبوب خاں، شانتا رام، کے آصف، سہراب مودی، ستیہ جیت رے، راج کپور، گرودت، ناصر حسین، طاہر حسین، سبودھ مکھرجی وغیرہ وغیرہ فنکار و اداکار کی حیثیت سے سہراب مودی، چندر موہن، موتی لال، پرتھوی راج کپور، اشوک کمار، دلیپ کمار، راج کپور، راج کمار، گرودت، دیو آنند، نور جہاں، مینا کماری، نرگس، ثریا، مدھوبالا، کشور کمار، نمی، وحیدہ رحمان، امیتابھ بچن، دھرمندر، سنجیو کمار، سنیل دت، جونی واکر، محمود، شبانہ اعظمی، نصیرالدین شاہ، شاہ رخ خان، عامر خان، سلمان خان، وغیرہ وغیرہ۔ شاعر اور نغمہ نگار کی حیثیت سے شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، راجندر کرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، شرد چندر، گلشن نندہ، فراق گورکھپوری، راجہ مہدی علی خاں وغیرہ وغیرہ۔ گلوکار کی حیثیت سے نور جہاں، ثریا، سہگل، محمد رفیع، طلعت محمود، لتا منگیشکر، آشا بھوسلے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی فلم انڈسٹری کے بے شمار شعبے ہیں جن میں اردو اور اردو والوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔

یہاں قارئین کرام کی دلچسپی اور معلومات کے لئے چند منتخب پرانی فلموں کے Dialogue اور نغمے پیش کئے جا رہے ہیں جو ماہ و سال کے گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کس طرح فلم انڈسٹری پر راج کرتی رہی ہے۔ سیاست وقت بھلے ہی اب اس پر ہندی کا لیبل چسپاں کرے مگر آج بھی صورتحال

سابق بدستور ہی ہے۔ ۱۹۳۹ء کی مشہور فلم پکار میں شہنشاہ جہانگیر کے رول میں (چندر موہن) ملکہ عالم کے رول میں (نسیم بانو) اور سنگرام سنگھ کے رول میں (سہراب مودی) کے درمیان یہ مکالمہ ملاحظہ فرمائیے:

شہنشاہ جہانگیر (چندر موہن):۔ ایک تیر کمان مظلومہ کے حوالے کیا جائے۔ مجرم تم ملکہ تھیں لیکن ملکہ ہونے کا تمہارا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم ایک زندگی کے ساتھ کھیل سکو۔ اپنی تفریح کے لئے تو زندگی جیسی انمول چیز کی پرواہ نہ کرو۔ تم چلو تو زندگیوں کو رگڑتی چلو، تم ہنسو تو اوروں کو رلا کر ہنسو۔ قانون کسی کو بھی اس فرعونیت کا اختیار نہیں دے سکتا۔ تمہیں یاد رکھنا چاہئے تھا کہ انصاف ایک اندھے کی لاٹھی ہے جسے کچھ نہیں سوجھتا۔ لہٰذا تمہارے حق میں ہمارا انصاف یہی فیصلہ ٹھہراتا ہے کہ جس طرح تم نے ایک عورت کے سہاگ کو خون میں ڈبویا ہے اسی طرح تمہارے سہاگ کو بھی خون میں ڈبو دیا جائے۔ مابدولت اپنے اس فیصلے کے مطابق تمہارے شوہر کو موت کے حوالے کرتے ہیں۔

رانی (دھوبن) جس طرح ملک نے تمہارے خاوند کی زندگی پر تیر مارا ہے اسی طرح تم بھی ملکہ کے شوہر کی زندگی میں تیر چھوڑ دو۔

ملکۂ عالم (نسیم بانو):۔ شہنشاہ

کنیز:۔ عالم پناہ کو ملکۂ عالیہ نے پکارا ہے۔

شہنشاہ (چندر موہن):۔ رانی مارو تیر ہمارے سینے میں۔ خون کا بدلہ خون، یہی جہانگیر کا انصاف ہے۔ اسی انصاف کے بل پر ہمارا خون بہا دو۔ ہمیں خون میں ڈبو دو۔ ہمیں ہمارے ہی قانون کے شکنجے میں رکھ کر پیس ڈالو، ہمیں ہمارے ہی انصاف پر قربان کر ڈالو۔ ہماری ہی لاش ہمارے انصاف کی ٹھوکروں میں ڈال دو۔ ہمارے انصاف کو آب حیات پلا دو۔

شہنشاہ:۔ تعمیل ہو، تعمیل ہو، تعمیل ہو، تعمیل ہو، تعمیل ہو

سنگرام سنگھ (سہراب مودی):۔ رانی اپنے سہاگ کے اجڑ جانے کا بدلہ دنیا کی تمام عورتوں کے سہاگ کو اجاڑ کر لے لو پر ملکہ معظمہ کے سہاگ کو مت اجاڑ پھینکنا کہیں۔ ایک اپنے نیائے کے کارن سارے سنسار کے نیائے کی پونجی کو مت چھینو۔ نیائے نے جو تمہیں اختیار دیا ہے سنسار کے کارن اس سے ہاتھ اٹھا لو۔ بلی دان کر ڈالو۔ ساری دنیا تمہاری احسان مند رہے گی۔

شہنشاہ:۔ سنگرام سنگھ

سنگرام سنگھ:۔ ان داتا

شہنشاہ:۔ تم شاہی انصاف کے خلاف آواز اٹھا کر گستاخی کر رہے ہو۔

سنگرام سنگھ:۔ چھما ان داتا۔ لیکن عالم پناہ کی زندگی سے تمام رعایہ کو زبردست واسطہ ہے۔ شہنشاہ اپنے لئے نہیں ہے۔ رعایہ کے لئے ہے اور رعایہ کو اپنے شہنشاہ کے لئے چلانے کا حق ہے۔

درباری:۔ درست کہا...... یہ صرف ایک ہی شخص کی آواز نہیں ہے ان داتا۔ اس میں تمام رعایہ کی چیخیں شامل ہیں۔

عام درباری:۔ ہمارا ان داتا۔ جگ جگ جیئے۔ جگ جگ جیئے۔ جگ جگ جیئے۔

درج بالا اقتباس کے ذریعہ راقم الحروف نے اپنے دعوے کے لئے دلیل پیش کر دیا ہے۔ سطور بالا میں الفاظ کے در و بست سے جو ایک فضا تیار کی گئی ہے یہی اس تمثیل کی کامیابی کی کلید ہے۔ کردار کی مناسبت سے سنگرام سنگھ کے مکالمے میں ہندی الفاظ کی آمیزش نے اثر آفرینی کے لئے دو آتشہ کا کام کیا ہے۔ اردو ہندی کی اس پیوندکاری نے ہندوستانی مزاج کے مطابق فلم انڈسٹری کو ہر قدم پر سہارا دیا ہے۔

اردو ہندی میں کوئی بیر نہیں — دونوں اک دوسرے کی ماجائی
ایسا کہنا بڑی جہالت ہے — یہ سمندر کے پار سے آئی

مضمون کی طوالت کے پیش نظر پرانی فلموں کے اردو نغموں کی صرف نشاندہی اور گلوکار کا نام اور گانے کا مکھڑا و سال حاضر خدمت ہے کیونکہ پرانے گانے تو اکثر سنادئے جاتے ہیں مگر مکالمے ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ ''تمثیل نو'' کے صفحات کے ذریعہ ان Dialogue کو زندہ کرتا ہے جن کے ذریعہ اردو زندہ و پائندہ ہے۔ ۱۹۴۶ میں فلم ''انمول گھڑی'' میں ملکۂ ترنم نورجہاں کے اس گانے نے جو دھوم مچائی اس کی دھمک آج بھی زندہ ہے۔

آجا آجا

آجا مری برباد محبت کے سہارے — ہے کون جو بگڑی ہوئی تقدیر سنوارے.....آجا آجا

۱۹۴۳ء میں فلم ''تقدیر'' کے اندر نرگس اور موتی لال کے درمیان یہ منظوم مکالمہ :

کیوں — آپ کیوں، آپ کیوں آئنگے — آپ کیوں، آپ کیوں آئنگے — ائے

۱۹۵۵ء کی فلم ''شری چارسو بیس'' کا یہ گانا آج بھی زبان زد خاص و عام ہے :

میرا جوتا ہے جاپانی، یہ پتلون انگلستانی

۱۹۵۴ء کی فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' کا نغمہ 'جائیں تو جائیں کہاں'' سمجھے گا کون یہاں، درد بھرے دل کی زباں آج بھی ہمارے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔

یہ فہرست بہت طویل ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شروع سے آج تک تمام فلموں میں اردو کے کامیاب گانے پیش کئے گئے۔ فلم انڈسٹری کی کامیابی اردو کی مرہون منت ہے۔ اب چند اہم فلموں کے سدابہار مکالموں کی جھلک پیش خدمات ہے۔ ۱۹۶۰ء کی شہرۂ آفاق فلم 'مغل اعظم'' کا یہ مکالمہ ایک طرف اردو کی جادوگری پیش کرتا ہے تو دوسری طرف فلم کی کامیابی کی ضمانت ہے:۔

اکبر (پرتھوی راج کپور:۔ ''تمہاری موجودگی نافرمانی کی دلیل ہے۔''

سلیم (دلیپ کمار):۔ ''انارکلی قید کرلی گئی اور میں دیکھتا رہا۔''

اکبر:۔ ''اور تم کر بھی کیا سکتے تھے۔''

سلیم:۔ ''ایک عظیم الشان شہنشاہ کے سامنے کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔ مگر آج ظل الٰہی کو اپنے ظلم اور

میرے ضبط کی حد مقرر کرنی ہوگی۔"

اکبر:۔ "اگر تمہاری آرزو ایک کنیز ہے، ایک باندی ہے تو ساری زندگی اسی طرح ضبط کرنا ہوگا۔

سلیم:۔ "کیا پروردگار عالم سے آپ نے مجھے اسی لئے مانگا تھا کہ زندگی مجھے ملے اور اس کے مالک آپ ہوں۔ آنکھیں میری ہوں اور دل کی دھڑکنوں پر آپ کا قبضہ رہے۔ ظل الٰہی کیا میری زندگی آپ کی دعاؤں کا قرض ہے؟ جو مجھے اپنے آنسوؤں سے ادا کرنا پڑے گا۔"

اکبر:۔ "سلیم۔ انارکلی تمہارے قابل نہیں۔"

سلیم:۔ "کیوں نہیں۔ ایک لاڈلے بیٹے کے باپ بن کر آپ مجھے اپنے کلیجے سے لگا لیجئے اور انہیں پیار سے اپنا بیٹا سمجھئے اور پھر کہئے انارکلی میرے قابل نہیں۔"

اکبر:۔ "ہم ایک لاڈلے بیٹے کے شفیق باپ ضرور ہیں مگر ایک شہنشاہ کے فرض کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے بیٹے کے دھڑکتے دل کے لئے ہندوستان کی تقدیر نہیں بدل سکتے۔"

سلیم:۔ "تقدیریں بدل جاتی ہیں، زمانہ بدل جاتا ہے، ملکوں کی تاریخیں بدل جاتی ہیں، شہنشاہ بدل جاتے ہیں، مگر محبت جس انسان کا دامن تھام لیتی ہے وہ انسان نہیں بدلتا۔"

اکبر:۔ "مگر تجھے بدلنا ہوگا۔ سلیم تجھے بدلنا ہوگا۔"

قارئین کرام آپ خود فیصلہ کریں۔ درج بالا مکالمہ کا ایک ایک لفظ اپنی معنویت اور تہہ داری میں بے مثال ہے۔ الفاظ کے دروبست سے جو فضا تیار ہوتی ہے اس کی گھن گرج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ اس زوردار مکالمے کے خوبصورت الفاظ کا متبادل پیش کرنا کسی بھی دوسری زبان کے بس کی بات نہیں۔ یہ ہے اردو اور یہ ہے اردو کا اٹوٹ رشتہ فلم انڈسٹری سے۔

طوالت کے پیش نظر صرف چند مشہور فلموں کے نام حاضر خدمت ہیں جن کے ذریعہ گذشتہ برسوں میں اردو کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ فہرست لمبی ہے مثلاً "لگان"، تارے زمین پر، تھری ایڈیٹس، مائی نیم از خان، گجنی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اردو کو عوام کے درمیان مقبول بنانے میں فلم انڈسٹری نے زبردست کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ فلموں کے ذریعہ اردو کا سفر جاری ہے۔ حرکت و عمل کا یہ سفر زندگی کے سفر کی طرح جاوداں پیہم دواں اور ہر دم جواں ہے۔ فلم انڈسٹری جب تک ہری بھری رہے گی اردو کی بیل اسی شاخوں پر ہمیشہ پھولتی پھلتی رہے گی۔ اس لحاظ سے ہندوستانی فلمیں اور اردو کا یہ گوشہ اپنی معنویت کے اعتبار سے اردو کی قابل ستائش کوشش ہے۔

☆☆☆
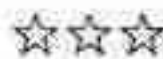
شہر کی معروف شخصیت اور سابق ڈپٹی کلکٹر **حافظ محمد احسن اللہ** (عمر تقریباً ۸۰ سال)

ایڈوکیٹ، محلہ: بہادر گنج لہیریا سرائے، دربھنگہ کا طویل علالت کے بعد

۵/جولائی ۲۰۱۰ء کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم نہایت خلیق انسان تھے۔

ابراہیم اشک، ممبئی

ہندوستانی فلموں میں موسیقی اور گیت

ہندوستانی سماج میں ابتدا ہی سے گیت کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو خوشی کے گیت گائے جاتے ہیں جب وہ بڑا ہوتا ہے اور اس کی شادی ہوتی ہے تو گیت سنگیت کے پروگرام منعقد ہوتے ہیں اور جب وہ مرجاتا ہے تب بھی دکھ بھرے گیت یا بھجن گائے جاتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے وجود اس کی ہر سانس اور ہر دھڑکن سے گیت اور موسیقی کا رشتہ اٹوٹ بنا ہوا ہے۔ ہندوستانی فلمیں ہمارے سماج کا آئینہ ہیں ان میں گیت اور موسیقی کی اہمیت یہ ہے کہ فلم کا ایک گیت بھی ہٹ ہو جاتا ہے تو وہ فلم کو ہٹ کرا دیتا ہے۔ گیت کی اسی اہمیت کی وجہ سے ابتدا میں جب فلمیں بننے لگیں تو ان میں گیتوں کی بڑی بھرمار رہی کچھ فلموں میں تو تیس چالیس گیت تک شامل رہے پھر یہ دس بارہ تک محدود ہو گئے۔ موجودہ دور میں پانچ چھ گیت ایک فلم میں ضروری بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لازمی سمجھے جانے لگے ہیں۔

شروع میں جب فلم انڈسٹری قائم ہوئی تو علم و ادب سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں، شاعروں، کویوں اور موسیقاروں کو فلمیں بنانے اور انہیں بخوبی سجانے سنوارنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ موسیقاروں میں غلام حیدر، کھیم چند پرکاش، نوشاد، ایس ڈی برمن، سلیل چودھری، سی رام چندر، بولوسی رانی، آرسی بورال، ہیمنت کمار نے اپنی موسیقی سے فلموں میں چار چاند لگاتے ہوئے فلمی موسیقی کی ایک نئی تاریخ مرتب کی دی ہیں... ان موسیقاروں کا جن کویوں اور شاعروں نے ساتھ دیا ان میں آرزو لکھنوی، نخشب، کوی پردیپ، بی ایل سنتوشی، کیدار شرما، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی راجہ مہدی علی خاں، شیلندر، حسرت جے پوری، اندیور، انجان، نقش لائل پوری، قمر جلال آبادی، آنند بخشی، پریم دھون، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، اسد بھوپالی، کیف بھوپالی، بھرت ویاس اور ایسے ہی بے شمار نام لئے جا سکتے ہیں۔

یوں تو آرزو لکھنوی کے ساتھ ہی ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی بھی فلموں میں گیت لکھنے آئے لیکن کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ جوش ملیح آبادی کا ایک گیت اس وقت بڑا موضوع بحث بنا جس کے بول تھے:

میرے جوبنیا کا دیکھو ابھار جیسے گدر انار، جیسے لٹو بلے

جیسے دریا کی موج، جیسے ترکوں کی فوج

آرزو لکھنوی اس دور کے کامیاب گیت کار تھے۔ انہوں نے فلم "دیوداس" میں بہت مقبول گیت لکھے۔ "کہوں کیا آس نراس بھئی" اسی دور میں ڈی این مدھوک نے فلم "رتن" میں موسیقار نوشاد کے ساتھ جو گیت لکھے انہوں نے فلم دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ گیت ہر ہندوستانی کی زبان پر گونجنے لگے اور دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ فلم "رتن" کی کامیابی میں نوشاد کی موسیقی اور ڈی این مدھوک کے گیتوں نے اہم کردار ادا کیا۔ فلم کا یہ گیت آج بھی

تازہ لگتا ہے: ساون کے بادلو ان سے یہ جا کہو

"رتن" فلم کے بعد ڈی این مدھوک فلمی دنیا کے مشہور ترین گیت کار بن گئے تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جب ان سے پروڈیوسر ڈائریکٹر کو گیت لکھانا ہوتا تو وہ مدھوک صاحب کو ہوٹل کے ایک کمرے میں کئی نوجوان لڑکیوں کے درمیان چھوڑ دیتے تھے اور پھر مدھوک صاحب ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے رومانی گیت لکھتے تھے۔

ایک بار مدھوک صاحب کسی محفل میں جگر صاحب سے ملے انہوں نے جگر صاحب کو دیکھ کر منہ بنایا اور کہا" یہ وہی جگر صاحب ہیں جنہیں فلمی دنیا میں کوئی گھاس تک نہیں ڈالتا ہے۔" جگر صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ گھاس جسے ڈالنا چاہئے اسے ڈالی جا رہی ہے۔" مدھوک صاحب جگر صاحب کا یہ جواب سن کر لاجواب ہو گئے۔ اور وہاں سے چلتے بنے۔

اسی زمانے میں فلم "دلاری" کے گیت اور موسیقی نے بھی زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس فلم میں موسیقی نوشاد کی تھی اور گیت شکیل بدایونی نے لکھے تھے۔ فلم کا ایک گیت جو محمد رفیع نے گایا تھا آج تک مقبول ہے:

سہانی رات ڈھل چکی نا جانے تم کب آؤ گے
ہوا بھی رت بدل چکی نا جانے تم کب آؤ گے

نوشاد فلم کے ذریعہ اتر پردیش کے رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی موسیقی ترتیب دے رہے تھے تو ایس ڈی برمن بنگال اور آسام کی موسیقی سے فلموں کو مالا مال کر رہے تھے۔ "دیوداس" "بندنی" "سجاتا" میں ان کی موسیقی زبردست کامیاب ہو رہی تھی۔ غلام حیدر نے پنجاب کے سروں سے فلموں کو سجایا تھا تو کھیم چند پرکاش حسن لال بھگت رام راجستھان کے سنگیت سے فلموں کو مالا مال کر رہے تھے اور اس طرح تمام ہندوستان کی موسیقی فلموں کے ذریعہ عوام کے دلوں کو دھڑکانے اور گرمانے کا فرض انجام دے رہی تھی۔ فلم "محل" آئی تو کھیم چند پرکاش کی دھنیں عوام میں گونجنے لگیں اس فلم کے ایک گیت سے لتا منگیشکر کی ایک نئی پہچان بن گئی۔ گیت کے بول تھے:

آئے گا، آئے گا، آئے گا آنے والا، آئے گا

گیت کاروں میں ساحر لدھیانوی نے کئی فلموں میں یادگار اور شاہکار گیت لکھے ان پر پروڈیوسروں اور ہدایت کاروں نے بھروسہ بھی کیا۔ بی آر چوپڑا کوئی فلم بنانے سے پہلے کہانی کار کو یہ کہہ دیتے تھے کہ آپ جا کر ساحر صاحب کو کہانی سنا دیں تاکہ وہ یہ طے کر لیں کہ کہاں کون سا گانا دینا ہے۔ گرو دت کا واقعہ تو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ گرودت نے فلم "پیاسا" کے لئے ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" سے کچھ نظمیں چن کر موسیقار ایس ڈی برمن کو دے دیں اور کہا ان کی دھنیں تیار کر دیں۔ برمن دا کو وہ شاعری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ ان پر دھنیں بنانے سے کتراتے رہے۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ تم شاعر بدل دو مجروح یا شکیل بدایونی کو لے لو، دو تین ملاقاتوں میں جب برمن دا نے گرودت سے شاعر بدلنے کی بات کہی تو گرودت نے آخر کار انہیں اپنا فیصلہ سناتے

ہوئے کہہ دیا: ''دادا اگر آپ نے ان گیتوں کی دھنیں نہیں بنائیں تو میں شاعر تو نہیں بدلوں گا موسیقار ضرور بدل دوں گا۔'' اپنے وقت کے کسی بڑے موسیقار کو اس طرح جواب دینا اور شاعر کے لئے ڈھال بن کر کھڑے ہو جانا گرودت جیسا ہدایت کار ہی کر سکتا تھا آج ایسا بھروسہ گیت کاروں پر کوئی بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ برمن دا نے جب گرودت کا جواب سنا تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اور انہوں نے بے دلی سے انہیں گیتوں پر دھنیں بنا کر دے دیں جنھوں نے دھوم مچا دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی شاعری پر معمولی دھنیں بھی بنائی جائیں تب بھی انہیں ہٹ ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا ہے۔

ساحر لدھیانوی کے ساتھ جن موسیقاروں نے کام کیا ان میں برمن دادا کے علاوہ روشن، خیام، جئے دیو، لکچھمی کانت پیارے لال، روی کے نام خاص طور سے لئے جا سکتے ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں کے ساتھ مدن موہن کی جوڑی خوب کامیاب رہی۔ دونوں نے فلم ان پڑھ، عدالت، میرا سایہ میں بہت اچھی غزلیں پیش کی ہیں۔

سی رام چندر کے ساتھ بھرت ویاس اور کوی پردیپ نے کئی اچھے گیت لکھے۔ ان میں فلم ''جاگرتی'' ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' ''نورنگ'' ''پیغام'' ''ناستک'' جیسی فلموں کے نام خاص طور سے لئے جا سکتے ہیں۔

مجروح سلطان پوری نے برمن دادا کے ساتھ خوب فلمیں کی ہیں ان میں ''گائیڈ'' ''ترے مرے سپنے'' ''جویل تھیف'' ''ابھیمان'' ''سجاتا'' ''بندنی'' کے نام خاص طور سے لئے جا سکتے ہیں۔

شکیل بدایونی کی جوڑی موسیقار نوشاد کے ساتھ خوب رنگ لائی۔ اس جوڑی نے مدر انڈیا، بیجو باورا، سوہنی ماہیوال، کوہ نور، مغل اعظم، درد، دلاری، میلا، سنگھرش، دل دیا درد لیا، رام اور شیام، بابل وغیرہ میں یادگار گیت سنگیت دیا۔

کیفی اعظمی نے موسیقار مدن موہن کے ساتھ فلم ''حقیقت''، ہنستے زخم، ہیر رانجھا، وغیرہ میں اچھے گیت لکھے لیکن ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی اور مجروح کی طرح انہوں نے زیادہ فلمیں نہیں کی ہیں۔

راجندر کرشن نے بھی اپنے قلم کا جوہر خوب دکھایا انہوں نے دلیپ کمار کی فلم ''مدھومتی'' ''گوپی'' اور ''آزاد'' میں یادگار گانے لکھے۔ آخری عمر میں انہوں نے ''بمبئی سے آیا میرا دوست' دوست کو سلام کرو رات کو کھاؤ پیو دن کو آرام کرو' بھی بپی لہری کی دھن پر لکھا۔ موسیقار چترگپت کے ساتھ راجندر کرشن نے فلم ''بھابھی'' میں یادگار گیت لکھے جو عوام میں بہت ہی مقبول ہوئے۔ ان میں سے ایک گیت جو محمد رفیع کی آواز میں ہے آج بھی کافی مقبول ہے۔ جس کے بول ہیں: چل اڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ

موسیقار کلیان جی آنند جی اور لکشمی کانت پیارے لال نے بھی ایک طویل عرصے تک فلموں میں اچھی موسیقی دی۔ کلیان جی آنند جی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کلیان جی کے والد نے کسی کو ادھار روپے دیئے تھے وہ شخص وہ روپے چکانے لائق نہیں تھا تب وہ اس کے یہاں سے ایک ساز اٹھا لائے اور اسے بجانا سیکھ کر موسیقار بن گئے۔

اس سے پہلے ایک فلم میں ہمت کمار کی ہدایت میں انہوں نے "ناگن" میں جو بین بجائی تھی اور بہت مقبول ہوئی تھی۔ بعد میں کلیان جی آنند جی نے آزادانہ طور پر موسیقی ترتیب دینا شروع کیا اور خوب کامیاب رہے۔ فلم "اپکار" "بیراگ" "ہمالیہ کی گود میں" "دھرماتما" "ڈان" جیسی بے شمار فلموں میں کلیان جی آنند جی کی موسیقی نے دھوم مچائی۔

لکشمی کانت پیارے لال پہلے کلیان جی آنند جی کے سازندے تھے بعد میں جب انہوں نے آزادانہ موسیقی دینا شروع کیا تو پہلی ہی فلم "پارسمنی" کے گیت سنگیت نے انہیں شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ "پارسمنی" کے گیت اسد بھوپالی نے لکھے تھے جو اس وقت عوام کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک گیت آج بھی ترو تازہ لگتا ہے۔

ہنستا ہوا نورانی چہرہ، کالی زلفیں رنگ سنہرا
تیری جوانی توبہ توبہ رے دلربا، دلربا

فلم کی کامیابی کا یہ اثر ہوا کہ جب لکشمی کانت نے اپنا بنگلہ جوہو پر بنایا تو اس کا نام بھی پارسمنی ہی رکھا۔ لکشمی کانت پیارے لال کے لئے تاراچند بڑجاتیہ کی فلم "دوستی" میں مجروح سلطان پوری نے بہت اچھے گانے لکھے۔ یہ فلم ایک اندھے اور لنگڑے نوجوانوں کی دوستی پر مبنی تھی اور بہت کامیاب رہی تھی۔

فلم موسیقاروں میں ایک جوڑی شنکر جے کشن کی بھی تھی جس کے ساتھ شیلندر اور حسرت جے پوری نے گیت لکھے ہیں۔ راج کپور کی زیادہ تر فلموں میں اس جوڑی نے بہترین موسیقی ترتیب دی ہے۔ جن میں "جس دیش میں گنگا بہتی ہے" "چار سو بیس" "آوارہ" "میرا نام جوکر" "سنگم" "سورج" اور ایسی ہی بے شمار فلموں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

ان کے بعد ایک دور موسیقار آر ڈی برمن کا بھی آیا۔ ناصر حسین کی ہدایت میں بننے والی فلم "تیسری منزل" سے آر ڈی برمن نے اپنا سفر شروع کیا۔ اس کے نغمے مجروح سلطان پوری نے لکھے تھے جو ہر طرف گونجنے لگے۔ آر ڈی برمن ایک طویل عرصے تک بے تاج بادشاہ کی طرح فلم انڈسٹری پر حکومت کرتے رہے لیکن زندگی کے آخری دنوں میں ان کے پاس کام نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر میں اکیلے بیٹھے رہا کرتے تھے۔

دراصل ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک ہندوستانی فلم موسیقی اور گیت کا جو دور رہا ہے اسے ہم سنہری دور کہہ سکتے ہیں سن ۱۹۷۰ء کے بعد ہندوستانی فلم موسیقی پر مغربی موسیقی کے اثرات مرتب ہونے لگے اور جو موسیقی سروں کی بنیادوں پر ترتیب دی جاتی تھی مغربی موسیقی کی طرح ردم کی بنیادوں پر ترتیب دی جانے لگی۔ گیتوں کے بولوں کی اہمیت کم ہونے لگی اور فلمی گیتوں سے شاعری غایب ہو کر رہ گئی۔ پہلے اس ماحول کو کچھ حد تک آر ڈی برمن نے بگاڑا اور پھر زبان کی ذرا بھی سمجھ نہ رکھنے والے موسیقار بپی لہری نے تو ہندوستانی فلم موسیقی کا بٹا ہی بیٹھا دیا۔

ایسے ماحول میں خاکسار کو جب "کہونا پیار ہے" اور "کوئی مل گیا" فلموں میں گیت لکھنے کا موقع ملا تو معنی

سے بھرپور شاعرانہ انداز کے گیت لکھ کر فلم موسیقی اور گیت کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ان نغموں نے مقبولیت اور بازار میں سی ڈی اور کیسٹوں کی بکری کی بنیادوں پر گزشتہ پچاس برسوں کا ریکارڈ توڑ کر نئے ریکارڈ قائم کیے۔ خاکسار نے نہ صرف راجیس روشن بلکہ آنند ملند، آنند راج آنند۔ سکھوندر سنگھ، ویجو شاہ اور دیگر موسیقاروں کے ساتھ معیاری گیت لکھ کر فلم موسیقی اور گیت کے گرتے ہوئے معیار کو دوبارہ بحال کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب اچھی موسیقی اور گیت سننے کو بھی مل رہے ہیں۔

آنند بخشی نے ایک طویل عرصہ تک بطور گیت کار فلمی دنیا میں اپنا سکہ چلایا یوں تو گیت کار سمیر نے بھی بے شمار گیت لکھے لیکن آئے دن وہ کئی الزامات سے گھرے رہے اس لئے ان کو کوئی خاص مقام فلمی دنیا میں نہیں بن سکا۔ گیت کار جاوید اختر اور گلزار نے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ گلزار نے کبھی امیر خسرو، کبھی بلھے شاہ، کبھی کسی لوگ گیت کو اپنانے میں کوئی بھی جھجک محسوس نہیں کی اور کامیاب رہے۔

فلموی گیتوں میں جہاں وطن پرستی کا جذبہ ابھر کر آیا وہیں مذہبی نعت، حمد ومناجات، منقبت، سلام اور بھجن بھی خوب لکھے گئے فلم ہم دونوں میں جئے دیو کی دھن پر ساحر لدھیانوی نے ایک امر بھجن لکھا ہے۔ جس کے بول ہیں:

اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام　　　سب کو سنمتی دے بھگوان......

لتا منگیشکر کی آواز میں یہ بھجن اتنا اچھا ریکارڈ ہوا ہے کہ سننے والا سنتا ہی رہ جاتا ہے۔ ایک بھجن نوشاد کی دھن پر شکیل بدایونی نے فلم ''بیجو باورا'' میں لکھا ہے جو محمد رفیع کی آواز میں ہے جس کے بول ہیں:

من تڑپت ہری درشن کو آج　　　مورے تم بن بگڑے سگرے کاج

راگ مالکونس میں اس کی بندش بہت ہی پیاری اور پر اثر بن پڑی ہے۔ فلم ''شو مہیما'' میں ایسا ہی ایک بھجن خاکسار نے بھی لکھا ہے جو عالمی پیمانے پر مقبول ہوا ہے جسے دلیپ سین سمیر سین کی دھن پر انورادھا پوڈوال نے گایا ہے۔ جس کے بول ہیں:

من میرا مندر شیو مری پوجا　　　شیو سے بڑا نہیں کوئی دوجا
بول ستیم شوم، بول تو سندرم　　　من مرے شیو کی مہیما کے گن جائے جا

ایک خاص بات یہ ہے کہ انورادھا پوڈوال اپنا ہر پروگرام اسی بھجن سے شروع کرتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلم گیت کاروں نے مذہب کی تمام دیواروں سے اٹھ کر ایسے بھجن لکھے ہیں جو یادگار ہیں فلم ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' میں گیت کار بھرت ویاس نے بھی ایک یادگار بھجن لکھا ہے۔ جن کے بول ہیں:

اے مالک تیرے بندے ہم، ایسے ہوں ہمارے کرم
نیکی پر چلیں اور بدی سے ٹلیں تا کہ ہنستے ہوئے نکلے دم

گیت اور موسیقی کے تعلق سے ایک سوال اکثر مجھ سے یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ موسیقار دھن پہلے بناتا ہے یا آپ گیت پہلے لکھ کر دیتے ہیں اور بعد میں اس پر دھن بنائی جاتی ہے۔ کچھ گیت کار اس کا صحیح جواب دے نہیں

پاتے ہیں۔ میں اس سوال کا تفصیل سے جواب دینا چاہتا ہوں۔

دراصل بات یہ ہے کہ شروع شروع میں جب گیت پہلے ہی لکھنے کی روایت عام تھی تو ہوتا یہ تھا کہ گیت کار اپنا گیت لکھ کر موسیقار کے حوالے کردیتا تھا اور اس پر موسیقار دھن بنا دیتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا تھا کہ موسیقار کی بنائی ہوئی دھن پروڈیوسر ڈائریکٹر کو پسند نہیں آتی تھی اور اسے بار بار دھنیں بنانے پر محنت کرنا پڑتی تھی۔ جبکہ گیت کار ایک بار ہی محنت کرکے چھوٹ جاتا تھا۔ یہ بات موسیقار کو اکھرنے لگی اور اس نے اپنی انا کا سوال بنا کر یہ غلط روایت عام کردی کہ وہ پہلے اپنی دھن پاس کروانے لگا اور بار بار محنت کرنے کے لئے اس نے گیت کار کو چھوڑ دیا۔

ساحر لدھیانوی نے اس غلط روایت کے بارے میں بہت صحیح بیان دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا'' پہلے قبر کھود لی جاتی ہے اور پھر قبر کے ناپ کا مردہ تلاش کیا جاتا ہے۔''

آج کل گیتوں کے گرتے ہوئے معیار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ دور کے زیادہ تر پروڈیوسر وہ ہیں جو انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرکے نکلے ہیں انہیں اپنے ملک کی زبان اردو، ہندی اور تہذیب وتمدن سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور انگریزی میں سوچتے اور ہالی ووڈ کی پیروی کرنے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی انگریزی کی بے معنی کھچڑی ہمارے ہندی فلموں کے گیتوں میں پکنے لگی ہے۔ اور گیتوں کا اپنی تہذیب سے رشتہ کٹتا جا رہا ہے۔

ایک زمانہ وہ بھی آیا جب راجیش روشن، آنند ملند، دلیپ سین، سمیر سین، جتن للت، ندیم شرون، نے اپنی دھنوں سے ماحول کو خوب گرمائے رکھا۔ ایک دور انو ملک کا بھی آیا جب وہ نمبر ایک کی کرسی پر براجمان ہوگئے۔ وجو شاہ نے بھی اپنے والد کلیان جی آنند جی کا نام زندہ رکھا اور کچھ اچھی فلموں میں موسیقی دے کر مقبولیت حاصل کی۔

اس وقت جو موسیقار مقبول ہیں ان میں سب سے پہلا نام اے آر رحمٰن کا ہے۔ جس نے عالمی پیمانے پر ہندوستانی موسیقی کو مقبول کیا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو منوا کر آسکر ایوارڈ تک لے لیا ہے۔ یہ اعزاز اور کسی موسیقار کو حاصل نہیں ہے۔ رحمٰن کے علاوہ شنکر احسان لائے، وشال بھاردواج، پریتم، آنند راج آنند ایسے موسیقار ہیں جو بدستور اپنی موسیقی سے ہندوستانی فلم کو سجانے سنوارنے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ موسیقی کے شور شرابے میں کبھی کبھی اچھے نغمے بھی سننے کو مل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک فلم موسیقی اور معیاری گیتوں کا جو سنہری دور گزر رہا ہے وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آسکتا ہے۔ کیونکہ جو وقت گذر جاتا ہے وہ پلٹ کر کبھی نہیں آتا ہے۔ اب نہ تو ایسے لوگ ہیں نہ ماحول۔

☆☆☆

مراق مرزا، ممبئی

ہندوستانی فلمیں اور اسکرین پلے

اسکرین کے پلے پر گفتگو کے آغاز سے پہلے میرا خیال ہے پلے کی دیگر اقسام پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینا ضروری ہے کہ اس سے اسکرین اور پلے کے مابین رشتے کو سمجھنے میں قدرے آسانی ہوگی۔ عصر حاضر میں ہمارے سامنے پلے کی تین عام قسمیں ہیں: اسٹیج پلے، ریڈیو یا ریڈیائی پلے اور اسکرین پلے۔ پلے کی ایک اور خاص قسم ہے جو لندن امریکہ نیز دیگر مغربی ممالک میں "Passion Play" کے نام سے موسوم ہے۔ پیشن پلے حضرت عیسیٰ کے دکھوں اور انہیں صلیب پر چڑھائے جانے کے واقعات پر مبنی ہے۔

اگرچہ ہندوستان سے پلے کا رشتہ بے حد قدیم ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں پر ڈرامے کھیلے جانے کے اثبات وشواہد ہندوستان کے عہد عتیق کی تاریخوں میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ بھگوان رام کی کتھا رام لیلا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے اسٹیج پر کھیلے جانے کی روایت آج بھی قائم ہے تاہم مغربی ممالک میں آج سے قریب چار صدیاں قبل plays یعنی ڈرامے وجود میں آئے جنہیں امیر و امراء اور بادشاہوں کی تفریحات کے لئے اسٹیج پر کھیلا جاتا تھا۔ ان ڈراموں میں تفریحی عناصر کے ساتھ ساتھ ملک و معاشرہ کے لئے کچھ نصیحتیں بھی شامل ہوا کرتی تھیں۔ پھر ریڈیو کی ایجاد کے بعد پلے کا رشتہ آوازوں کو دور دور تک پہنچانے والی اس جادوئی مشین یعنی ٹرانزسٹر سے بن گیا اور بہت سارے ریڈیو Plays لکھے گئے۔ "ریڈیو پلے" میں کرداروں کی آوازوں کے ذریعے کہانیاں کہی جاتی تھیں اور لوگ باگ انہیں سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ ان دنوں مطالعہ کے مقصد اور غرض سے پلے لکھے جانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ Plays صرف اسٹیج اور ریڈیو کے لئے لکھے جاتے تھے لہٰذا اہل علم حضرات نے لفظ پلے کو اسٹیج اور ریڈیو کے ساتھ جوڑ کر دو Compound words "ریڈیو پلے" اور "اسٹیج پلے" اختراع کر لئے۔

پھر کوئی سوا سو برس قبل Technology کے میدان میں ایک نیا انقلاب آیا اور سائنسی کرشمہ کی شکل میں فلم کی ایجاد عمل میں آئی۔ ۱۹۰۸ء میں لوئیس لومیئر (Louis Lumiere) نے Moving images یعنی پردے پر چلنے والی تصویریں ایجاد کیں اور اس طرح ۱۹۱۸ء میں Cupid Angling نام سے پہلی فلم وجود میں آئی۔ یہ خاموش فلم تھی۔ اس کے بعد فلم سازی کے میدان میں تیز رفتاری سے ترقی ہوتی گئی اور خاموش فلموں کے کچھ ہی سالوں بعد بولتی فلموں کا زمانہ آگیا اور اسی کے ساتھ اسٹیج اور ریڈیو کے علاوہ ڈراموں کو سنیما کے پردے پر جگہ ملنے لگی اب Plays فلم اسکرین پر انسانوں کی چلتی پھرتی اور بولتی تصویروں کے ذریعے دکھائے جانے لگے۔ پلے کے اسکرین کے ساتھ بنے اس نئے رشتے کے باعث پلے اور اسکرین کے Combination سے انگریزی لغت میں ایک اور نئے لفظ Screen play کا اضافہ ہوگیا۔

اس زمانہ کے ڈرامہ نگاروں میں کرسٹوفر مارلو، جارج برناڈ شاہ، ٹی ایس ایلیٹ، سیموئل بیکٹ، بن جانسن

اور ولیم شیکسپئر کے نام قابل ذکر ہیں، جن کے ڈرامے آج بھی انگریزی ادب کا بیش بہا سرمایہ خیال کئے جاتے ہیں۔ ان ڈرامہ نگاروں کے بہت سے ڈراموں پر بعد میں فلمیں بھی بنیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کے ڈرامے "Murder in the Cathederal" سے انسپائر ہوکر ہالی ووڈ کی شاہ کار فلم "Becket" بنی جسے میں اپنے زمانے کے مشہور اداکار پیٹر او ٹول (Peter O Toole) اور رچرڈ برٹن (Richard Burton) نے مرکزی کردار ادا کئے تھے اور بیکٹ سے تحریک لے کر بالی ووڈ یعنی ہندوستانی سنیما انڈسٹری میں ''نمک حرام'' بنائی گئی تھی جس میں راجیش کھنہ اور امیتابھ بچن مرکزی کردار میں نظر آئے تھے۔

ہندوستان میں ماڈرن ڈرامہ نگاری کا سلسلہ ۱۷ ویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا جب سر ولیم جانس کے ذریعے کالی داس کے سنسکرت میں لکھے گئے ناول شکنتلا کا ترجمہ کر کے اسے پہلے بار اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ بعد ازاں یہاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ڈرامے لکھے گئے اور اسٹیج پر کھیلے گئے۔ تفریحات کے تئیں لوگوں میں پیدا ہونے والے اس نئے رجحان کے سبب بہت سارے ڈرامہ نگار وجود میں آئے جن کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ بڑے شہروں میں متعدد ڈرامہ کمپنیاں کھل گئیں جو گاؤں گاؤں شہر شہر جا کر لوگوں کی فرحت اور تفریح کے لئے ڈرامے پیش کیا کرتی تھیں۔ ہندوستان میں پلے کے شائقین صرف خواص ہی نہیں بلکہ مغرب کے برخلاف عام لوگ بھی بڑے ذوق وشوق سے پلے دیکھا کرتے تھے۔

۱۹ ویں صدی کے وسط میں فلم سازی کے میدان میں قابل غور حد تک ترقی ہوئی۔ خاموش فلموں کے بعد بولتی فلموں کا دور آیا اور اس کے بعد رنگین فلموں کا زمانہ آتے آتے فلمیں عام لوگوں کی تفریح کا واحد ذریعہ بن گئیں۔ اسی کے ساتھ ریڈیو پلے ماضی کا حصہ بن گئے۔ اگر چہ اسٹیج پلے آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہے مگر اس کی مقبولیت پہلے جیسی نہیں رہی، ہندوستان کے چند بڑے شہروں میں اسٹیج پلے کے شوز آج بھی ہوتے ہیں مگر ان کے ناظرین کا حلقہ بے حد محدود ہے۔ پلے اب ہائی کلاس سوسائٹی کے ہی کچھ Art -loving لوگ دیکھتے اور پسند کرتے ہیں۔ دراصل پلے کا گہرا رشتہ اب اسکرین سے بن گیا ہے اور ایک طرح سے اسکرین پر دکھائے جانے والے پلے کا ہی دوسرا نام ''فلم'' ہے۔

بالی ووڈ میں فلم نگاری بالعموم تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ کہانی، دوسرا اسکرین پلے یعنی منظر نامہ اور تیسرا مکالمہ، ہر چند کہ کسی فلم کی کامیابی کے لئے اچھی کہانی کا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے تاہم شعبہ فلم نگاری میں منظر نامہ نگاری کی حیثیت اور اہمیت سے کسی بھی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مشاہدے بتاتے ہیں کہ بہت سی فلمیں بہترین اور بامقصد کہانیوں کے باوجود فلم بینوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ناکام رہیں اور باکس آفس پر بری طرح فلاپ ثابت ہوئیں۔ اس کے برعکس کچھ دیگر فلمیں جن کی کہانیاں بالکل عام اور کمزور تھیں مگر اسکرین پلے اچھا اور مضبوط ہونے کے باعث یہ فلمیں شائقین کا دل جیتنے اور سنیما گھروں کے کیش کاؤنٹروں پر دھوم مچانے میں کامیاب رہیں لہٰذا اب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ صرف اچھی کہانی ہی کسی فلم کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہو سکتی بلکہ اچھی کہانی کے

ساتھ ساتھ منظر نامہ کا اچھا اور Well gripped ہونا بھی از حد ضروری ہے۔

ہالی ووڈ کی طرح ہندوستان میں بھی فلمی منظر نامہ نگاری متعدد ارتقائی ادوار سے گزری ہے۔ ابتدائی دور خاموش فلموں کا تھا جب مکالموں کے بغیر فلمیں بنتی تھیں اور اشاروں کی زبان میں فلم کے پردے پر کہانیاں کہی جاتی تھیں۔ اس دور کے فلم بینوں کے لئے محض یہ بات حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ تفریح بخش بھی تھی کہ انہیں پردۂ فلم پر چلتے پھرتے انسان نظر آتے تھے چنانچہ کہانی کی گہرائی و گیرائی نیز منظر نامہ کی پکڑ اور مضبوطی کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ ان دنوں اساطیری کرداروں اور راجہ مہاراجہ کے قصوں کہانیوں پر فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں ''راجہ ہریش چندر'' نام سے پہلی خاموش فلم بنی جس کے خالق دادا صاحب پھالکے تھے لہٰذا دادا صاحب پھالکے کو ہندوستان کا بابائے فلم کہا جاتا ہے۔

ہندوستان میں فلم ''عالم آرا'' سے اسکرین پلے کو زبان ملی۔ یہ پہلی بولتی فلم ١٩٣١ء میں بن کر منظر عام پر آئی جس کے ہدایت کار اردشیر ایرانی تھے۔ عالم آرا سے فلم سازی کے میدان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بہت سی نئی کہانیاں فلموں میں جگہ پانے لگیں۔ منظر نامہ نگاری میں بھی کافی تبدیلی آئی۔ لیلا مجنوں، شریں فرہاد، رومیو جولیٹ اور ہیر رانجھا جیسی لازوال رومانی کہانیوں پر بھی فلمیں بنیں اور کامیاب ہوئیں۔ ناگ ناگن اور بھوت پریت کی کہانیوں کو بھی فلموں کے پردے پر دکھایا گیا۔ ہر چند کہ اس دور کے منظر نامے فنی اور تکنیکی اعتبار سے پہلے کی فلموں کی بہ نسبت بہتر نظر آتے ہیں اس کے باوجود اس زمانے کی فلموں پر موسیقی اور نغمے پوری طرح حاوی رہے۔ فلم میں بارہ پندرہ گانوں کا ہونا عام بات تھی۔ گیت سنگیت فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ اس دور میں کہانی کار منشی کہلاتے تھے۔ یہ بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کا زمانہ تھا جب ہندوستان میں منظر نامہ نگاری اپنی نشو و نمائی کے دوسرے دور سے گزر رہی تھی۔ ایک سپیرا ایک لٹیرا، ناگن، یہودی کی بیٹی، محل، جیلر، دو آنکھیں بارہ ہاتھ، انسانیت، ہم دونوں، بیس سال بعد، انمول گھڑی، انداز، تقدیر، چلتی کا نام گاڑی، اجالا، مدر انڈیا، سادھنا، وہ کون تھی، جاگتے رہو، اناڑی، شری چار سو بیس، آوارہ، غزل، ترانہ، گنگا جمنا، تاج محل، رستم اور سہراب اور کے آصف کی مغل اعظم وغیرہ اس دور کی کچھ یادگار فلمیں ہیں جن کی کامیابی میں اچھی منظر نامہ نگاری کا دخل بھی رہا ہے۔

اس دور میں پردہ سیمیں پر اپنے فلم کا جادو بکھیرنے والے فلم کاروں میں وجاہت مرزا، خواجہ احمد عباس، علی رضا، امان اللہ خاں، کمال امروہی، ابرار علوی، اختر الایمان، اندر راج آنند، ارجن دیو رشک، کوشل بھارتی، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے نام قابل ذکر ہیں۔ بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کے ابتدائی زمانہ میں شہرہ آفاق افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے بھی چند فلمیں تحریر کی تھیں جب وہ بامبے ٹاکیز میں بہ حیثیت مصنف ملازمت کرتے تھے۔ ان دنوں ہدایت کار اور کہانی کار کے علاوہ بڑے بڑے اداکار بھی فلم کمپنیوں کے ذریعے تنخواہ پر رکھے جاتے تھے۔ اسی دور میں معروف کہانی کار منشی پریم چند نے بھی دو ایک فلمیں لکھیں مگر فلم نگاری میں آزادئ قلم نہ ہونے کے سبب منشی جی نے فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

ہالی ووڈ کی طرح ہندوستانی فلم انڈسٹری میں بھی پلے کو اسکرین پلے میں ڈھالنے کی روایت فلموں کے شروعاتی دور سے پائی جاتی ہے۔ فلم مغل اعظم اگرچہ ظاہری طور پر مغل شہنشاہ جلاالدین محمد اکبر کی داستان زندگی کی حقیقی تصویر معلوم ہوتی ہے مگر سچ اس کے برعکس ہے۔ یہ فلم دراصل اپنے وقت کے مشہور ڈرامے سے Inspired تھی۔ یہ ڈرامہ ''انار کلی کا ڈرامہ'' کے نام سے لکھا گیا تھا۔ مغل اعظم کی کہانی کے لئے اس ڈرامہ سے تحریک یا Inspiration لئے جانے کی بات اس لئے بھی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں انار کلی کا کوئی کردار مغل تاریخ کی کتاب میں درج نہیں ہے۔ مغل اعظم کی طرح دیگر بہت سی فلمیں اپنے وقت کے مشہور و مقبول ڈرامے سے Adapt کی گئیں اور باکس آفس پر کامیاب بھی ہوئیں۔ لہٰذا متذکرہ حقائق کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلموں کے ابتدائی دور سے ہی پلے اسکرین کے درمیان ایک مستحکم رشتہ قائم ہو گیا تھا اور پلے کو اسکرین پلے کا روپ دینے کا سلسلہ بھی ہنوز جاری ہے۔ معروف موسیقار اور ہدایت کار وشال بھردواج کی دو فلمیں، مقبول اور اومکارا شیکسپیئر کے ڈرامے ''میک بیتھ'' اور اوتھیلو کے ہی Adaptations ہیں ۱۹۸۵ء میں۔ عالمگیر شہرت کے حامل جاپان کے ہدایت کار اکیرا کوروسارا (Akira Kurosawa) نے بھی شیکسپیئر کے ڈرامہ King Lear پر Ran نام کی فلم بنائی تھی جسے Best Costume کا اوسکار ایوارڈ بھی ملا تھا۔

۷۰ کی دہائی میں اسکرین پلے رائٹنگ کے شعبے میں ایک زبردست انقلاب آیا جب رائٹرز جوڑی سلیم جاوید کی تحریر کردہ فلم ''زنجیر'' ٹکٹ کھڑکی پر کامیاب ہوئی۔ زنجیر امیتابھ بچن کی بھی پہلی کامیاب فلم تھی۔ اس سے قبل سلیم جاوید فلم۔ ''ہاتھی میرے ساتھی'' کا اسکرین پلے لکھ چکے تھے اور اپنے وقت کے سوپر اسٹار راجیش کھنہ کی بہترین اداکاری سے بجی یہ فلم بھی باکس آفس پر چمتکار دکھا چکی تھی مگر زنجیر میں پوری رائٹنگ یعنی اسٹوری، اسکرین پلے اور ڈائلاگ سبھی کچھ انہیں کے تھے لہٰذا اس فلم نے سلیم جاوید کو ایک الگ نام و مقام عطا کیا اور فلم انڈسٹری میں ان کی ایک منفرد شناخت قائم ہوئی۔ زنجیر کے اسکرین پلے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ فلم کے پردے پر ہیرو نے ایک بھی گانا نہیں گایا تھا جب کہ ان دنوں فلم کا ہیرو گانا نہ گائے یہ بات بعید القیاس تھی۔ اس زمانے میں تقریباً ہر فلم کے ہیرو کے حصے میں چھ سات گانے ضرور آتے تھے۔ اس فلم میں دوسری قابل غور بات یہ تھی کہ فلم کے ہیرو امیتابھ بچن کے ستارے گردش میں چل رہے تھے۔ ان کی دس بارہ فلمیں ریلیز ہو کر بری طرح فلاپ ہو چکی تھیں لہٰذا زنجیر کی کامیابی کا راز اسکرپٹ کو سمجھا گیا اور فلم کے Success کی پوری Credit سلیم جاوید کو چلی گئی جس کے وہ حقدار بھی تھے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فلم زنجیر کی اسکرپٹ کی شکل میں رائٹرز کی اس ٹیم نے ایک نئے انداز کا اسکرین پلے پیش کیا تھا جو بے حد کامیاب ثابت ہوا اور اس کے ساتھ فلم نگاری کے شعبے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

ایک کے بعد ایک سلیم جاوید کی تحریر کی ہوئی قریب درجن بھر فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوئیں اور یہ رائٹرز جوڑی کامیابی کا دوسرا نام بن گئی۔ زنجیر کے بعد دیوار، ترشول، دوستانہ، کالا پتھر، ڈان، شعلے، مجبور، یادوں کی برات، شکتی اور کرانتی وغیرہ ان کی یادگار فلمیں ہیں جو بہترین اسکرین پلے کا حوالہ بن چکی ہیں۔ سلیم جاوید کی زیادہ تر

فلموں میں امیتابھ بچن مرکزی کردار میں نظر آئے ہیں اور امیتابھ بچن کو Angry young man کا لقب یا Image بھی ان ہی رائٹرز کی دین ہے۔ سلیم جاوید نے اپنی کامیابی سے یہ ثابت کردیا تھا کہ کسی فلم کا ہٹ ہونا اس فلم کے اسٹار پر منحصر نہیں بلکہ فلم کا حقیقی ہیرو اچھا اسکرین پلے رائٹر ہوتا ہے چنانچہ ان رائٹرز نے معاوضے بھی ہیرو کے برابر لئے۔ سلیم جاوید کے Career میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ان کے معاوضے امیتابھ بچن کے معاوضے کے برابر ہو گئے تھے۔ یعنی کسی فلم کے لئے امیتابھ بچن کو اگر بیس لاکھ روپے ملتے تو سلیم جاوید کی پرائز بھی اتنی ہی ہوتی تھی۔ یہ حقیقت ھی اظہر من الشمس ہے کہ سلیم جاوید کی بے پناہ کامیابی کے سبب ہی اسکرین رائٹرز کے نام سے منشی کا لقب ہٹا اور انہیں فلم انڈسٹری میں بلند مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔ انہوں نے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو باور کرایا کہ درحقیقت اچھی رائٹنگ ہی Film making کی بنیاد ہوتی ہے جس کے بغیر کامیاب فلمیں نہیں بنائی جاسکتیں۔ بہ حیثیت اسکرین رائٹرز جو اسٹارڈم سلیم جاوید نے دیکھا وہ نہ کسی رائٹر نے ان سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس جوڑی کے ٹوٹنے کے بعد ایسی شہرت اور کامیابی کسی کے حصے میں آئی ۔ سلیم جاوید کی فلموں کے Screenplays، بالی ووڈ کے ٹکر کے ہوا کرتے تھے کیوں کہ یہ جوڑ زیادہ تر انگریزی فلموں سے تحریک لے کر ہندی کہانیاں بنایا کرتی تھی۔ اگر چہ ان کے حصے میں غالباً ایک بھی Original فلم نہیں ہے اس کے باوجود سلیم جاوید کا Contribution فلم نگاری کی تاریخ کا ایک اہم اور یادگار باب ہے۔

عصر حاضر میں کرن جوہر ادتیہ چوپڑہ، عباس مستان، مہیش بھٹ، راکیش روشن، پریہ درشن، شمت امین، کمل ہاسن، سنجے لیلا بھنسالی، راج کمار سنتوشی، شنکر اور راجو ہیرانی وغیرہ اچھے اور سلجھے ہوئے Film makers کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ہدایت کار خود لکھتے بھی ہیں اور ان کی فلمیں سنیما کے شائقین کو پسند بھی آتی ہیں، اس کے باوجود منظر نامہ نگاری میں آج وہ بات نظر نہیں آتی جو سلیم جاوید کی Writings میں ہوا کرتی تھی۔ میرا خیال ہے سلیم جاوید کا زمانہ فلم نگاری کا بہترین دور تھا اس کے بعد فلم رائٹنگ کے شعبے میں کوئی ترقی نظر نہیں آتی بلکہ رائٹنگ کا معیار گرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ اشتہاری فلم بنانے والوں کی آمد سے فلموں میں کہانی کہنے کا انداز اور بھی خراب ہوا ہے۔ چند داڑھی اور لمبی چوٹی والے Pseudo Intelectuals جنہیں ایک یا ڈیڑھ منٹ کی اشتہاری فلمیں بنانے میں مہارت حاصل تھی، بالی ووڈ کی چمک دمک سے متاثر ہو کر وہ بھی Film making کے میدان میں کود پڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلموں سے کہانی غائب ہونے لگی اور اوٹ پٹانگ فلموں کی ڈھیر لگ گئی۔ دراصل دو سوا دو گھنٹے کی فیچر فلم کا اسکرین پلے لکھنا ایڈ فلم میکنگ سے نہ صرف مختلف بلکہ بے حد مشکل بھی ہے۔ اشتہاری فلموں سے تعلق رکھنے والے ہدایت کار آر بالکی Exception ہیں جنہوں نے ''چینی کم'' اور ''پا'' جیسی کامیاب فلمیں بنائی ہیں۔

کمرشیل فلموں سے الگ ہندوستان میں آرٹ فلموں کا بھی ایک اپنا وجود ہے اور ان فلموں کو دیکھنے والی مخصوص Audience بھی ہے۔ آرٹ فلمیں چوں کہ کسی مضبوط سماجی یا سیاسی مدعا پر مبنی ہوتی ہیں یا پھر سچے

واقعات پر ایسی فلمیں بنائی جاتی ہیں لہٰذا یہ فلمیں عام شائقین فلم کو شاذ و نادر ہی پسند آتی ہیں۔ ہدایت کار گووند نہلانی کی 'اردھ ستیہ' اور این چندرا کی فلم "انکش" دو ایسی آرٹ فلمیں تھیں جنہیں خواص کے ساتھ ساتھ عام لوگوں نے بھی پسند کیا تھا اور یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئی تھیں۔ آرٹ فلموں کا اسکرین پلے کمرشیل فلموں سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ کمرشیل فلمیں لکھتے وقت مصنف کو "ہیرو کو تالی اور ولن کو گالی" کا فارمولا ملحوظ رکھنا پڑتا ہے جبکہ آرٹ فلم کے اسکرین پلے میں زیادہ سے زیادہ سچائی دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ہر منظر کی تخلیق کے پیچھے Logic کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ آرٹ فلمیں کیش کاؤنٹر پر دھوم نہیں مچا پاتیں تاہم بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے Film festivals میں اپنی موجودگی درج کرانے اور اعزازات جیتنے میں کبھی پیچھے نہیں رہتیں۔ شیام بینگل، گووند نہلانی اور گلزار بالی ووڈ کے ایسے ہدایت کار ہیں جو ہمیشہ اپنی فلموں کے ذریعے کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گلزار چونکہ فلم ساز اور ہدایت کار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادیب بھی ہیں لہٰذا ان کے اسکرین پلے لکھنے کا انداز اوروں سے مختلف ہے۔ ان کی منظر نامہ نگاری میں افسانہ نگاری کا رنگ صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دلکش اور اثر آفرین افسانہ کی طرح اسکرین پر کہانی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فلمیں دیکھتے وقت اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی خوبصورت افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ گلزار اپنی کمرشیل فلموں میں بھی Artistic Values بھر دیتے ہیں جس کے باعث ان کی فلمیں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ہائی کلاس لوگ بھی پسند کرتے ہیں۔ جب کہ شیام بینگل اور گووند نہلانی کی فلمیں خالصتاً آرٹ ہوتی ہیں جنہیں صرف Class Audience ہی دیکھتی ہیں۔

دور حاضر میں بالی ووڈ فلموں کا دائرہ کار وسیع ہو چکا ہے۔ ہندوستانی فلمیں آج لندن امریکہ کے علاوہ فرانس، چائنا اور جاپان جیسے ممالک میں بھی دیکھی اور پسند کی جاتی ہیں۔ ہندوستانی فلموں کی اس مقبولیت کے سبب ہی آج بالی ووڈ کو دنیا کے دوسرے نمبر کی فلم انڈسٹری ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ "The Magic of Bollywood" "Screenplay Writing" جیسی مقبول کتاب کے مصنف گوند شرما کے مطابق ہندوستانی فلم انڈسٹری سال میں تقریباً نو سو (٩٠٠) فلمیں تخلیق کرتی ہے۔ مذکورہ حقائق کی اساس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ تکنیکی اعتبار سے بالی ووڈ ہالی ووڈ سے بہت پیچھے ہے لیکن تخلیقی میدان میں ہماری انڈسٹری دنیا کی کسی بھی فلم انڈسٹری سے کم نہیں ہے۔ حالاں کہ سلیم جاوید رائٹرز جوڑی کا متبادل ابتک پیدا نہیں ہو سکا ہے اس کے باوجود ہندوستانی فلموں کے Screen Plays ہالی ووڈ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ فلم منا بھائی MBBS، لگان نیز دیگر کئی فلموں کی اسکرپٹ ممبئی سے حاصل کر کے Hollywood Archive کے لئے محفوظ کر لی گئی ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر خالد سعید، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد۔۵۰۰۰۳۲

فکشن، الیکٹرونک میڈیا کے تناظر میں

اس عنوان کے کثیر المفہوم ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ مثلاً مجوزہ عنوان کے کلیدی لفظ فکشن سے اسم موصوف کو محذوف کر کے قائل کے لئے اس بات کی گنجائش فراہم کی گئی ہے کہ دنیا کے کسی بھی زبان کے فکشن سے مثالیں دے کر اپنے مخاطبے کو مدلل اور مبسوط بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک تو میرا مطالعہ اس قدر وسیع ہے اور نہ ہی وقت اس بات کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ کچھ ایسی حدیں یا ایسی نشانیاں مقرر کرلوں کہ گفتگو زیادہ پھیل نہ سکے اور ژولیدگی بھی پیدا نہ ہو۔ حسب ذیل نشانیاں مقرر کرلیتا ہوں۔

۱۔ جہاں جہاں بھی لفظ فکشن آئے مراد اردو فکشن ہے۔ یعنی مثالیں اردو فکشن سے دی جائیں گی۔

۲۔ فکشن سے مراد وہ مقبول و معروف قصے کہانیاں جو الیکٹرانک میڈیا کے لیے لکھی نہیں گئیں لیکن جن پر فلمیں بنائی گئیں یا جنہیں ٹی وی پر بھی پیش کیا گیا۔

۳۔ الیکٹرانک میڈیا سے مراد وہ سارے سمعی، بصری اور سمعی بصری آلات یعنی ریڈیو سے کمپیوٹر تک کے ہیں۔

۴۔ اگرچہ فلم کا شمار الیکٹرانک میڈیا میں نہیں ہوتا لیکن فلم اور الیکٹرانک میڈیا پیش کی جانے والی تخلیقات دونوں میں سمعی اور بصری عنصر مشترک ہوا کرتا ہے۔ اس رعایت سے اپنی بات کی وضاحت کے لئے فلموں سے بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان مفروضات کے تعین کے بعد ایک بار جب اس عنوان پر غور کرتے ہیں تو حسب ذیل سوالات ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ اس الیکٹرانک عہد میں فکشن کی معنویت یعنی Relevance کیا ہے؟
۲۔ اس الیکٹرانک میڈیا کے سبب فکشن اور اس کی معنویت پر کس طرح کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟
۳۔ کیا فکشن کو اس الیکٹرانک عہد کے تقاضوں اور ضروریات سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے؟
۴۔ فکشن کے تحفظ، ترویج اور ترقی میں الیکٹرانک میڈیا کو کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟

میری کوشش یہ ہوگی کہ ان سوالوں میں مضمر امکانات و خدشات کا جائزہ لوں۔ جہاں تک پہلے دو سوالوں کا تعلق ہے میرا خیال ہے ان کے پیچھے وہ طرز احساس کارفرما ہے جو آج کل بے حد عام ہے۔ وہ یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے کثرت استعمال نے نہ صرف انسانی ترجیحات کو بدل کے رکھ دیا ہے، بلکہ اسے اس قدر مصروف کردیا ہے کہ موجودہ عہد میں فنون لطیفہ اور خصوصاً قدیم طرز ہائے فنون کے لئے کوئی وقت نہیں بچا۔ لہٰذا ادب لکھنے پڑھنے کی وقعت رہی نہ ضرورت۔ جب کہ میرا احساس ہے بلکہ ایقان ہے کہ شعر و کہانی کا رشتہ کسی عہد سے نہیں انسانی ذات سے قائم ہے۔ وہ شعر و نغمہ ہو کہ کہانی۔ دونوں کا مولکا انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے۔ کائنات اور معاشرے کا لمس پاکر پھلتا پھولتا ہے۔ لہٰذا جب تک روئے زمین پر ایک کلی بھی چٹکتی رہے گی، ایک بھی ستارا افق پر جھلملاتا

رہے گا، ایک بھی انسان باقی رہے گا اور اس کے سینے میں دل دھڑکتا رہے گا، تب تک شعر کہا جاتا رہے گا، کہانی لکھی جاتی رہے گی اور ان سے حظ اٹھایا جاتا رہے گا۔

ممکن ہے میری اس دلیل کو شاعرانہ ترجیح قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ لیکن آپ بچوں بالوں کی اس طویل قطار سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں جو اس آئی ٹی عہد میں بھی ہیری پوٹر کا ناول خریدنے کے لئے رات کے ڈیڑھ بجے سے کتابوں کی دکان کے آگے لگی تھی۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ:

"جوں جوں سائنس ترقی کرتی جائے گی ایجادات کا ظہور ہوتا رہے گا اور انسان جاہلیت سے نکل کر عقلیت کی طرف بڑھتا جائے گا لیکن شعور ادب کی اہمیت ختم نہیں ہوگی۔ نئے ایجادات کے سبب ادب کو نئے موضوعات، اظہار کے لئے نئی تشبیہیں اور نئے استعارے میسر آئیں گے۔"

ان کی بات آج بھی اتنی ہی معنی خیز ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا فکشن کے تحفظ، ترویج اور نئی ترقی کے نئے امکانات لے کر آیا ہے۔ بس ہمیں ان نئے ذریعوں سے فکشن کو ہم آہنگ کرنا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان و ادب میں فکشن پچھلی ڈیڑھ دو صدیوں میں پرنٹ میڈیا کے ذریعے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ جب کہ پچھلی صدی کی غالباً تیسری یا چوتھی دہائی سے یعنی جب سے ہمارے ملک میں ریڈیو سروسز کا آغاز ہوا، فکشن الکٹرانک میڈیا پر پیش کیا جانے لگا۔ اس مختصر مدت میں الیکٹرانک میڈیا ایک انقلاب سے گزرا۔ میرا اشارہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر ایجاد کی طرف ہے۔ اس مختصر مدت میں الیکٹرانک میڈیا نے انسان کے حس و حواس کو تین سطحوں پر متاثر کیا۔ یعنی سمعی سطح پر ریڈیو، آڈیو کیسٹ وغیرہ نے تو صرف بصری سطح پر کمپیوٹر نے اور سمعی سطح پر فکشن کی صدابندی کے ذریعے صرف بصری سطح پر کمپیوٹنگ (جمع کاری) کے ذریعے اور سمعی بصری سطح پر فلم بندی کے ذریعے۔

جہاں تک فکشن کی صدابندی کا معاملہ ہے، آل انڈیا ریڈیو اپنے آغاز ہی سے (یعنی ۱۹۳۶ء) مصروف کار ہے۔ آئے دن ریڈیو پر ہمارے فن کار اپنی کہانیاں اور افسانے پیش کرتے رہے ہیں۔ البتہ ناول کو ریڈیو پر شاید ہی قسط وار پیش کیا گیا ہو۔ دراصل یہ میڈیم کی اپنی مجبوری ہے۔ جس پر گفتگو آگے تفصیل سے ہوگی۔ گرام ریکارڈ کا زمانہ تو اب رہا نہیں۔ لیکن اردو والوں نے آڈیو کیسٹ (صوتی چرخیوں) کا بھرپور استعمال نہیں کیا، سوائے فیض کے جن کے کلام کی صوتی چرخیاں دستیاب ہیں۔ حالاں کہ افسانہ نگار خود اپنی آواز میں یا ان قصہ خوانوں کی آواز میں جو بہتر ڈھنگ سے قصے سنا سکتے ہیں اپنی کہانیوں کو صدابند کر سکتے ہیں، کہانیوں کو قصوں کی قرأت کے علاوہ ان کہانیوں کو ریڈیو یا کیسٹوں پر ڈرامائی انداز میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ فکشن کو ڈرامائی طور پر پیش کرنے کی ایک صورت فلم بندی بھی ہے۔ جس پر تفصیل سے گفتگو ٹیلی ویژن کے باب میں ہوگی۔ فکشن کو الیکٹرانک میڈیا پر پیش کئے جانے کے امکانات اور نتائج کو ان تین فلو چارٹس کی مدد سے ظاہر کیا گیا ہے، جو آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔

صرف بصری سطح پر فکشن کو پیش کرنے میں پرنٹ میڈیا کے علاوہ کمپیوٹر ہمارا معاون ہو سکتا ہے۔ میری مراد انٹرنیٹ پر ویب سائٹس کے مظاہروں سے ہے۔ اس ذیل میں بھی اردو والوں نے اپنی باخبری کا احساس دلایا

ہے۔آپ کی خدمت میں کوئی چالیس ویب سائٹس کی فہرست جو ڈیڑھ دو سال پرانی ہے پیش کی جارہی ہے۔ان میں سے ''اردوستان'' 'اقبال سائبر لائبریری'' اردو تہذیب'' ''اردونیٹ'' اردو ورلڈ'' ''اردو لائف'' اور ''عوض سعید ڈاٹ کام'' پر اردو فکشن دستیاب ہے۔اس معاملے میں اہل حیدرآباد زیادہ باخبر اور باشعور واقع ہوئے ہیں۔مطلب یہ کہ حیدرآباد کے دو فن کار: جناب عوض سعید اور خصوصاً محترمہ جیلانی بانو بہت زیادہ دستیاب ہیں۔عوض سعید صاحب کا تو خیر ان کا اپنا ویب سائیٹ ہے جب کہ جیلانی بانو کی تخلیقات مختلف ویب سائٹ والوں نے منتخب کی ہیں۔اقبال سائبر لائبریری نے ڈپٹی نذیر احمد کے سارے ناولوں کو کمپیوٹر پر چڑھایا ہے تو اردو نیٹ پر کوئی ۲۸ کہانیوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے مثلاً عباس حسینی کی ''میلہ گھومنی'' پریم چند کی ''بڑے گھر کی بیٹی'' منٹو کی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کرشن چندر کی ''ممی اور تارز'' بیدی کی ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' اور عصمت چغتائی کی ''ڈھکوسلہ'' وغیرہ اردو وتہذیب نے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کی پیش کش کو بہتر جانا جن میں سریندر پرکاش، اختر یوسف، حسین الحق، سلام بن رزاق، نصرت ظہیر، صدیق عالم، مشرف عالم ذوقی اور یسین احمد کے نام ہمیں اسکرین پر نظر آتے ہیں۔

کمپیوٹر جیسے الیکٹرانک میڈیا کے استعمال کے معاملے میں اردو والوں نے باخبری کا احساس تو ضرور دلایا ہے۔لیکن فکشن کی پیش کش میں کسی ترتیب و تنظیم اور کسی معیار و مزاج کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔کسی کسی ویب سائٹ (ویدگر) پر تو (کم از کم میری حد تک) بالکل ہی نو واردان ادب کی تخلیقات یا نام پیش کیے گئے ہیں۔بات یہ ہے کہ ذرائع ورسائل کی آسانی سے دستیابی، دولت کی فراوانی اور نام ونمود کے لوبھ نے اگرچہ اچھے برے کے درمیان امتیازات کو ختم کردیا ہے۔لیکن یہ حقیقت بھی سمجھائی ہے کہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ رہنا چاہئے۔

الیکٹرانک میڈیا کا سب سے مقبول ترین روپ فلم بندی ہے۔جس کی مختلف صورتیں ٹیلی ویژن پر پیش کیے جانے والے قسط وار یئے (سیریل) ٹیلی فلم اور مصور فلم (اینی میٹیڈ فلم) وغیرہ ہیں۔چوں کہ فلم سے محظوظ ہونے کے لئے، خواندگی لازمی نہیں لہٰذا بلا لحاظ ناظرین کے ایک وسیع حلقے تک پہنچنے کا بہترین وسیلہ ہے اور بیک وقت ہمارے حسی، سمعی اور بصری حواسات کے علاوہ ہمارے تخیل وتصور اور ہماری فکر ونظر کو بھی راست متاثر کرتا ہے۔ہم واقعات دیکھتے ہی نہیں، سنتے اور محسوس بھی کرتے ہیں۔ان پر سہاگہ یہ کہ قصے کے کردار اپنے وجود عمل سے یعنی اپنے نقش ونگار، اپنی آواز اپنے لہجے، اپنی پوشاک و پیرہن، اپنے آداب نشست و برخواست اور اپنی دل فریب اداؤں کے ساتھ ناظر پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔اسی سبب سے یہ الیکٹرانک ذریعہ ترسیل تحریر کے مقابلے میں بدرجہا موثر اور مجرب ہوتا ہے اور فکشن کی ترویج وفروغ میں بے حد معاون بھی۔لیکن ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ہر ذریعہ ترسیل کے تقاضے اور ضروریات الگ ہیں جس کی وجہ سے فکشن کو ایک میڈیم سے دوسرے میڈیم میں منتقل کرتے ہوئے چند مراحل ومسائل سے گزرنا پڑتا ہے اور خاص طور سے جب تحریری فکشن کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا معاملہ ہونا چاہئے وہ ریڈیائی ڈرامے کی صورت میں ہو یا ٹی وی قسط وار یئے کی یا ٹیلی فلم ہو کہ مصور فلم کے روپ میں اصل تخلیق میں کچھ تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔

فکشن کو فلم کے روپ میں ڈھالنے کے عمل میں سب سے بڑا گھاٹا تو یہ ہوتا ہے کہ ایک بیانیہ صنف کو اپنے بنیادی وصف بیانیہ سے محروم ہونا پڑتا ہے اور قاری کو اپنی تخلیقی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ آپ بھی اس بات کے قائل ہوں گے کہ بیانیہ کی بھی اپنی ایک شان ہوتی ہے۔ قاری کو Involve کرنے کے بیانیہ صنف کے اپنے اوصاف ہوتے ہیں یہ دو عبارتیں ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ ''دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی مگر ذاتی دلیری ان میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی.... تلواریں چمکیں، چھپا چھپ آواز آئی اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے۔ دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دی۔ اپنے بادشاہ کے لئے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انہیں دو آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لئے اپنی گردنیں کٹا دیں'' (ص: ۵۹ غشی پریم چند کے افسانے)

۲۔ ''ادھر حضور سنگھ کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا اور وہ ہمیشہ چارپائی پر بیٹھا کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا۔'' (ص: ۱۱۲ اور رانو کو پٹتے دیکھ کر.... ''چارپائی پر سے لپکا فریاد کے سے انداز میں گالیاں دیتا ہوا..... '' ایک چادر میلی سی ص: ۱۴)

کیا پریم چند کے افسانے کا یہ انجام، کیا بیدی کی یہ تحریر اس طرح سلولائیڈ یا صوری فیتے (Video tape) پر منتقل کی جا سکتی ہے؟ شاید اسی سبب اکثر و بیشتر قصے کہانیاں تحریری صورت میں جتنی موثر اور معنی خیز پائی گئیں ان کی فلم بندی کرنے پر اتنی معنی خیز و موثر نہ رہیں۔ وہ چاہے امراؤ جان ہو کہ گئودان۔ وہ کفن ہو کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، وہ ایک چادر میلی سی ہو کہ سڑک واپس جاتی ہے بہت کم فکشن کے نمونے ایسے ہیں جو فلم یا ویڈیو کے میڈیم میں ڈھل کر بھی اتنے ہی موثر اور معنی خیز رہے ہوں۔

یہ مانا کہ فلم ایک موثر بلکہ موثر ترین میڈیم ہے کہ اس میں کہانی کے واقعات اس قدر شفاف اور اثر انگیز ہوتے ہیں کہ ہم ان کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں جب کہ تحریری بیانیہ میں واقعات کا بیان واقعات کی تصویر کشی، مصنف کی اپنی ساری تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود فلم کی طرح ممکن نہیں۔ یعنی ہر تحریر اپنی انتہائی صورت میں بھی مجرد تصویریں ہی پیش کرتی ہے۔ لیکن یہ اس کا عیب نہیں خوبی ہے۔ آپ ہی بتایئے بیدی کا اندھا حضور سنگھ، تلوکا کے ہاتھوں پٹتی ہوئی رانو کو بچانے کے لئے ڈھنڈلاتے ہوئے بقول بیدی کانوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ''کانوں سے دیکھتے'' کے فقرے کی بلاغت نے قاری کو جو لطف پہنچایا ہے وہ اپنی جگہ لیکن اس فقرے سے تحریک پا کر قاری نے جو اپنے طور پر تصویر بنائی ہے، کیا یہ الیکٹرانک میڈیا کے تخلیقی آزادی بھی عطا کرتا ہے۔ قاری بھی اپنے طور پر ایک منظر کھینچتا جاتا ہے اور اس منظر میں اپنے طور پر رنگ بھی بھرتا جاتا ہے۔ ڈرامہ انارکلی کے گھٹیلے بدن والے اکبر کو پڑھنے کے بعد میرے تخیل نے اکبر کی جو شبیہ تراشی تھی یقیناً وہ ''مغل اعظم'' کے تھل تھالتے اکبر سے مختلف تھی۔ عرض کرنا یہی ہے کہ بیانیہ کے اسی تجریدی وصف کے سبب قاری کو ایک تخلیقی آزادی میسر آتی ہے یہی اس کی معنی آفرینی ہے۔ جب کہ تصویری بیانیہ اپنی بے پناہ قوت سے ناظر کے ہوش و حواس پر کچھ اس طرح اثر انداز

ہوتا ہے کہ اس کے تخیل و تصور کا عمل مفلوج ہو کے رہ جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی آزادی چھن جاتی ہے۔

عرض کرنا یہی ہے کہ فکشن کو ریڈیائی ڈرامے کے طور پر یا ٹی وی کے لیے فلماتے ہوئے فکشن میں تبدیلیاں لازمی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں لیکن حسب ذیل اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ میڈیم کی تبدیلی

۲۔ فن پارے کے خالق کے مدعا و منشا کو نہ سمجھ پانا یا خود فن پارے کی معنویت کی عدم تفہیم

۳۔ Recreation of Recreated Realities یعنی باز تخلیق کی باز تخلیقیت۔

میں اپنی بات کی وضاحت کے لئے شرت چند، کی ناول ''دیوداس'' اور پریم چند کے افسانے شطرنج کی بازی'' کی مثالیں دینا چاہوں گا کہ ان دونوں فن پاروں پر فلمیں بن چکی ہیں اور ''دیوداس'' پر تین اور ''شطرنج کی بازی'' پر ایک۔ میں نے کندن لال سہگل کی ''دیوداس'' نہیں دیکھی البتہ بمل رائے اور بھنسالی کی ''دیوداس'' دیکھی ہیں اور شرت چندر کی ''دیوداس'' پڑھی بھی ہے۔ لیکن ناول کا اثر محو ہو گیا۔ بمل رائے نے ریل کے سفر کے دوران اپنے ساتھی کے اصرار پر دیوداس کی شراب نہ پینے کی قسم کے ٹوٹ جانے کی منظر کشی ریل گاڑی کی تمثیل کی مدد سے جس موثر اور مجرب طریقے سے کی ہے مجھے یاد نہیں کہ شرت چندر نے ویسا ہی منظر لکھا ہوگا۔ ریل کی تمثیل کا منظر بمل رائے کا اضافہ ہے جسے انٹرلیپ تکنک کی مدد سے دیوداس کی داخلی کشمکش کے اظہار کے لئے فلم میں شامل کیا گیا ہے۔ وہ دوست کا شراب پینے کے لئے اکسائے جانا، ادھر انجن ڈرائیور کا پھاوڑے کی مدد سے انجن میں کوئلے ڈالتے ہوئے آگ کو بھڑکانا۔ ادھر دیوداس کے دل میں شراب کی خواہش کا لپکنا، ادھر ریلوے کمپارٹمنٹ کے جال دار بلب سے پروانے کا بار بار ٹکرانا۔ ادھر دیوداس کا ''پینے نہ پینے'' یعنی خواہش اور قسم کی کش مکش میں مبتلا ہو کر تناؤ کا شکار ہونا، ادھر ریل کے ڈبوں کو جوڑنے والی لوہے کی گانٹھوں کا تنا، ڈھیلا پڑنا پھر تنتے جانا، ادھر دیوداس کے باطن میں مچی ہل چل اور چھٹپٹاہٹ، ادھر پٹریوں پر گزرتی ریل کی ڈھڑ ڈھڑاہٹ، ادھر ریل کا پٹری بدلنا اور ادھر دیوداس کا شراب کا جام منہ سے لگانا۔ یہ ساری تمثیل انٹرلیپ تکنک کے سبب دیوداس کی باطنی کش مکش اور خواہش بلکہ علت کے ہاتھوں قسم کے توڑ دیئے جانے کی اذیت کا بہترین تخلیقی اظہار ہے۔ یہ تبدیلی تحریری فن پارے کے ساتھ بددیانتی اور خیانت کا موجب سہی، لازمی ہے اور معنی خیزی اور کیفیت آفرینی کا سبب بھی ہے اس تمثیل کی شمولیت کے سبب فکشن کی اصل میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اس کے تاثر اور معنویت میں اضافہ ہی ہوا ہے لہٰذا ایسی تبدیلی مستحسن ہے۔

سنجے بھنسالی نے بھی اپنی فلم ''دیوداس'' میں ریل سیکوینس کو استعمال کیا ہے لیکن ان جزئیات پر دھیان نہ دے سکے جنہیں بمل رائے نے بے حد آرٹسٹک انداز میں فن پارے کی کیفیت اور معنویت کے فروغ کے لئے استعمال کیا تھا۔ ظاہر ہے وہ تاثر کس طرح قائم ہوتا جو بمل رائے کا خاصہ ہے۔ یہ ایک Sequence ہی کیا بھنسالی کی فلم ''دیوداس'' بھی وہ تاثر نہ چھوڑ سکی جو بمل رائے کی دیوداس کا خاصہ ہے اسے ہم بھنسالی کی عدم فہمی اور

امارت پسندی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

بھنسالی نہ تو شرت چندر کے مدعا و منشا کو سمجھ سکے نہ ہی ناول کی معنوی فضا کو محسوس کر سکے۔ ان کی امارت پسندی اور فلم کو عظیم الشان بنانے کے بوجھ نے ناول کی معنویت کو غارت کیا۔ انہوں نے فلم کے لئے عظیم الشان اور نظروں کو خیرہ کرنے والے سیٹ لگوائے۔ بھاری بھاری پوشاک پہنوائی۔ وہ زرق برق لباس، وہ گھنے پاتے، وہ عالی شان کوٹھیاں، در و دیواروں پر لٹکتے ہوئے زربفت کے پردے حتیٰ کے ٹرین کا ڈبہ بھی کسی عالی شان دیوان خانہ کی طرح سجا سنورا ہوا۔ غرض فلم کی امارت و آرائش نے ناول میں پائی جانے والی بے ساختگی اور سادگی کو صدمہ پہنچایا یعنی بے جا ڈیکور نے ناول کے پاتھوس کو نقصان پہنچایا یقیناً اس طرح کی تبدیلی فکشن کے تئیں ناپسندیدہ قرار دی جائے گی۔

تیسری قسم کی تبدیلی کے لئے پریم چند کا افسانہ 'شطرنج کی بازی' اور ستیہ جیت رے کی فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ اس نے تو قصے کا انجام ہی بدل کے رکھ دیا ہے۔ پھر ایک بار پریم چند کے افسانے کا انجام ملاحظہ فرمایئے۔

> ''دونوں دوستوں نے کمر میں سے تلواریں نکالیں...دونوں عیش کے بندے تھے، بے غیرت نہ تھے قومی دلیری ان میں عنقا تھی۔ مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لیے سلطنت کے لئے قوم کے لئے، کیوں مریں؟ کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں...اپنے بادشاہ کے لئے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انہی دونوں نے شطرنج کے وزیر کے لئے اپنی گردنیں کٹا دیں۔''

جب کہ رے کی فلم میں میر اور مرزا نے اپنی گردنیں نہیں کٹائیں، شطرنج کھیلتے رہے۔ حالاں کہ دونوں کے درمیان بھی مہروں کی ہیرا پھیری پر تکرار شروع ہوئی تھی جو ایک دوسرے کے اسلاف اور ان کے پیشوں تک جا پہنچی اور پھر میر صاحب کی بیوی کی بے وفائی پر آ گئی (یہ رے کا اضافہ ہے جب کہ پریم چند نے اس بات کو مبہم رکھا تھا) جس پر طیش میں آ کر میر صاحب نے تمنچہ نکال لیا۔ پستول تنی ہوئی ہے اور دونوں دوست ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ادھر مسجد سے پرے، سڑک پر گوری پلٹن واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے لیے جا رہی ہے۔ مگر دونوں دوست کو اس کی فکر کہاں؟ میر صاحب تمنچہ تانے گولی داغنے کی دھمکی دے رہے ہیں لیکن داغتے نہیں اچانک اس لڑکے نے جو چھپتے چھپاتے گوری پلٹن کے تعاقب میں لکھنو سے چلا آیا تھا چلایا ''گوری پلٹن آ گئی.....'' گوری پلٹن آ گئی، یہ سنتے ہی میر صاحب کے ہاتھ سے گولی دغ گئی۔ لیکن قریب ہونے کے باوجود بھی نشانہ خطا کیا۔ پھر دونوں بھی مسجد کے کھنڈر کی آڑ میں چھپے نواب واجد علی شاہ کو قید کر لے جاتی ہوئی گوری پلٹن کو دیکھتے رہے۔ فوج چلی گئی دونوں پھر بساط پر آ بیٹھے۔ مہرے جمائے اور چال چلی۔ لیکن اب کی مہروں کی جماؤ کا انداز ویسی نہیں ویسی ہے۔ مہرے کے بساط پر رکھتے ہی کلوز اپ میں شاٹ فریز کیا جاتا ہے۔

کہانی کا یہ اختتام بالکل ہی بدلا ہوا ہے لیکن پریم چند کے افسانے کے انجام سے زیادہ بلیغ ہے۔ پریم چند نے تو یہ بتلایا کہ میر و مرزا میں ملکی و قومی غیرت نہ ہی ذاتی غیرت تو تھی۔ جب کہ ہمیں یہ محسوس کروایا ہے کہ ان میں ذاتی غیر بھی مفقود تھی۔ اگر چہ میر صاحب نے اپنی بیوی پر لگائے گئے الزامات کو سن کر تمنچہ ضرور تان لیا تھا لیکن گولی نہیں داغ سکے۔ گولی دغی ضرور لیکن غیرت مردانگی کے سبب نہیں۔ گوری پلٹن کا نام سن کر دہشت کے سبب، اور اضطرار کے عالم میں۔ اسی لئے آمنے سامنے ہونے کے باوجود نشانہ خطا گیا۔ ہاتھ جو کانپ گیا تھا اور پھر میر و مرزا نے اب کی جوئی بازی جمائی۔ مہروں کی ترتیب کا انداز فرنگی طرز پر تھا گویا یہ انداز استعارہ ہے، مغربی طرز زندگی کو، گوروں کے تسلط کو قبول کرنے کا۔ اسی استعارے کو Freeze کیا گیا اور فلم ختم کر دی گئی۔ اسے ستیہ جیت رے کی تعبیر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ تبدیل شدہ انجام لاکھ معنی خیز سہی اصل قصے میں تحریف ہی تو ہے۔ اصل قصے کے ساتھ کیا یہ خیانت نہیں؟ کیا ہمیں اسے قبول کرنا چاہئے؟

اسے ہم Recreation of Recreated Realities سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ ستیہ جیت رے کی تعبیر Interpritation ہے۔ وہ پریم چند کا فن تھا، یہ رے کا فن ہے۔ ستیہ جیت رے کے اس عمل کو ہم چاہے کسی بھی اصطلاح سے یاد کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ

۱۔ فکشن نویسی ایک تخلیقی عمل ہے جب کہ فکشن کی ڈرامائی پیش کش یعنی فلم بندی ایک باز تخلیقی عمل Recreative process یعنی افلاطون کی اصطلاح میں فکشن اگر "نقل کی نقل" ہے تو فکشن کی فلم بندی "نقل کی نقل کی نقل"۔

۲۔ فکشن ایک انفرادی تخلیقی عمل ہے جب کہ فکشن کی فلم بندی ایک اجتماعی تخلیقی عمل یعنی یہ مصنف، ہدایت کار، کیمرہ مین اور اداکاروں کی اجتماعی تخلیقی سرگرمی ہے۔

۳۔ فکشن کے ذریعہ اظہار قرطاس ہیں تو فکشن کی ڈرامائی پیش کش کے لئے اظہار کے ذرائع رنگ و نور، صوت و نغمہ، عکس و آواز پیکر و سار ہیں۔

۴۔ تحریری فکشن اپنے انتہائی لمحوں میں بھی ابہام و تجرد کا حامل ہوتا ہے جب کہ فکشن کی فلم بندی شفاف اور انتہائی اثر انگیز ہوتی ہے۔

۵۔ فکشن کا یہی تجرد و ابہام قاری کی تخلیقیت کے فروغ کا باعث ہوتا ہے جب کہ فکشن کی فلم بندی اپنی شفافیت اور اپنی بے پناہ قوت اور اثر آفرینی کے سبب قاری کے ہوش و حواس اور تخیل و تصور پر حاوی رہتی ہے۔

لیکن یہ نتائج اس تحریری فکشن کے لیے درست ہیں جو بے حد مقبول و معروف رہا ہو اور جو بصری سمعی میڈیا کے لئے لکھا نہیں گیا۔ میری ساری گفتگو اور ان نتائج کے پیش نظر اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ تحریری فکشن کو الیکٹرانک میڈیا پر نہیں پیش کیا جا سکتا یا نہیں پیش کرنا چاہئے تو عرض ہے کہ میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت و افادیت کا قطعی منکر نہیں۔ میرا معروضہ صرف اتنا ہے کہ فکشن کو سمعی بصری میڈیا پر پیش کرتے ہوئے ان خدشات یا ان نکات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ تحریری فکشن کا اپنا تقدس متاثر نہ ہو۔ لیکن یہ بھی دھیان میں رہنا چاہئے کہ فکشن

تصنیف کرنا اور فکشن کی فلم بندی کرنا دو مختلف عمل ہیں۔ لہٰذا تبدیلیاں بھی لازم ہیں۔ سمعی بصری میڈیا تو ایک انتہائی قوت وار اور اثر انگیز میڈیم ہے۔ اگر ہم اس میڈیم کو استعمال نہ کریں تو یہ ہماری نااہلی ہوگی۔

خصوصاً آج کے عہد میں جب کہ ہماری نئی نسلیں اور ہمارے نوخیز ذہن اردو رسم الخط سے تیزی سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں اور ہم بھی انہیں اردو رسم الخط سے واقف کرانے میں سنجیدہ نہیں ہیں، ان کو اردو زبان و ادب کے ورثے سے جوڑے رکھنے کے لیے الیکٹرانک میڈیا سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اردو فکشن کے شہ پاروں پر خیر سے اچھی بری فلمیں، ٹیلی فلمیں اور اپی سوڈ بن چکے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی مصور فلم Animated film سامنے نہیں آئی، سوائے گلزار کے ''موگلی'' کے جو ایک انگریزی تصنیف 'جنگل بک' کا اردو قالب ہے۔ چوں کہ یہ گلزار بنایا ہوا قسط وار یہ ہے۔ اس مناسبت سے لفظ 'اردو' کا استعمال کر رہا ہوں۔ سرٹی فیکیٹ چاہے کچھ بھی ہو جب کہ ایک اور مصور فلم 'ہنومان' کے لئے اردو کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا۔ اس سخن گسترانہ بات کو چھوڑیے ہمارے فن کار ہمارے نوخیز ذہنوں کے لئے کرشن چندر کی چڑیوں کی الف لیلہ کو سراج انور کے خطرناک جزیرہ، کونسطور اور لبو صحرائی کے قصوں کو یا ابن صفی کے جاسوسی افسانوں کو مصور فلم کے ذریعہ کیوں پیش نہیں کرتے۔ یہ اور اس طرح کی اور بہت سی باتوں پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔

اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں نے اپنے مخاطبے میں امکانات اور خدشات دونوں ظاہر کر دیے ہیں لیکن جب تک انہیں عملاً اختیار نہ کیا جائے بے کار محض ہیں۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ ملک بھر کی اردو اکادمیاں اور NCPUL جیسے اردو کی خدمت گزار اداروں پر مشتمل ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق بنایا جائے اور ایک مشترکہ پروگرام کے تحت ہر ریاست کی اردو اکادمی یا اردو کے خدمات گذار ادارے اور یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبے اپنے اپنے ذمے کچھ پروگرام لے لیں۔ مثلاً کوئی اکادمی قرۃ العین حیدر کے سارے فکشن کو نہ سہی نمائندہ فکشن کی سی ڈیز DVD اور ویب سائٹ کی تیاری اپنے ذمہ لے تو کوئی اکادمی پریم چند کے فکشن کی، کوئی ادارہ بیدی کے فکشن کو الیکٹرانک میڈیا پر منتقل کرے تو کوئی منٹو کے فکشن کو تو اس طرح ہم اردو فکشن کو الیکٹرانک عہد کے تقاضوں اور ضروریات سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں ایک بڑے حلقے کو اردو فکشن سے روشناس کرا سکتے ہیں۔ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں؟

☆☆☆

پروفیسر ایم اے ضیا، شعبۂ اردو گیا کالج، گیا (بہار)

فلمی ادبی عناصر: اردو زبان کی طاقت

"کسی قوم کو ختم کرنا ہو تو اس کی زبان کو ختم کرد" (ویسٹن چرچل)

اردو ایک ایسی زبان ہے جو اپنے بل بوتے اور اپنی توانائی کے سبب زندہ ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں بھی اردو زبان کو سرکاری پشت پناہی نہیں ملی۔ دور برٹش میں بھی اردو کے ساتھ سیاسی نکتہ نگاہ سے سازشیں ہوتی رہیں اور آزادی کے بعد بھی سرکاری سطح پر بے اعتنائی برتی گئی۔

کوئی بھی زبان کو طاقت بخشنے کا کام اسے توانائی دینے کا کام اسے عوام میں مقبول رکھنے کا کام اس کا ادب ہی Resource ہوتا ہے۔ اگر کسی زبان کا ادب کمزور پڑ جائے تو اس زبان کی مقبولیت دھیرے دھیرے کم ہو جاتی ہے کیونکہ تازگی و توانائی ادب کے ذریعہ ہی زبان کو عطا ہوتی ہے۔ اردو زبان میں اور بالخصوص اس کی شاعری میں ادبی عناصر نے جو رول ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ اردو شاعروں نے اور فنکاروں نے کبھی بھی اردو زبان کو کسی محدود دائرہ میں قید نہیں ہونے دیا۔ مقامی بولیوں سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکلوں عوامی بول چال ترکی زبان کے الفاظ فارسی اور عربی زبان سے استفادہ کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ اتنا کشادہ رکھا کہ دنیا کی جتنی زبانیں موجود ہیں ان کے الفاظ کو اپنے اندر پوری عنائیت کے ساتھ سمو لیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان کا حصہ ہیں جس کے سبب برصغیر میں بھی اس کی مقبولیت کبھی کم نہیں ہوئی۔ مخالفین بھی اس زبان کی قوت کے مداح ہیں۔ اب تو بین الاقوامی سطح پر بھی اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں بیشتر علاقائی زبانیں سوائے ملیالم کنڑ، اور تیلگو جیسی زبانوں کو چھوڑ کر سبھی کی ماں سنسکرت ہے اور اردو جو کھڑی بولی سے عالم وجود میں آئی ہے اس کی ماں بھی سنسکرت ہے۔ اس زبان میں اس کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ جس بھی علاقہ کا مرکزی وزیر یا ایم پی ہو وہ ایوان سیاست میں اردو زبان کے اشعار کو استعمال کر کے اپنی تقریر کو موثر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

جب تک کسی زبان کو عوام قبول نہ کرے وہ محض سرکاری پشت پناہی سے مقبول نہیں ہو سکتی۔

حیرت اس بات کی ہے کہ جب فلمیں شروع ہوتی ہیں اور اس میں لکھا رہتا ہے کہ Language of the Film -Hindi Feature Film حالانکہ ۹۹ فیصد ہندی فیچر فلم لکھے ہوئے فلموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی زبان اردو ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا لکھنے میں تجارتی نکتہ نگاہ کا عمل دخل ہو لیکن ایسی بات گمراہ کن بھی ہیں کیونکہ اسکرپٹ، ڈائیلاگ اور اس کے گیتوں کو اگر ہم دیکھیں تو سارے کے سارے فنکارانہ کاوشیں اردو زبان کے سہارے کی جاتی ہیں۔ پھر ہندوستان کے طول و عرض میں مقبول گیتوں کو گنگنانے والے گانے والے لوگ سب کے سب بہ آسانی اردو الفاظ کو بڑے ہی سلیقہ سے گاتے ہیں اور بعض گانوں کے مصرعے تو اتنے مقبول ہو جاتے ہیں کہ عوام کی گفتگو کی زبان بن جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کوئی زبان اپنے ادب کے سہارے ہی توانائی پاتی ہے تو یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان بھی اپنے ادب کے سہارے ہی مقبولیت تک پہنچی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عوام کو اپنے سانچہ میں ڈھالنے میں فلمی ادبی عناصر کا سب سے اہم رول ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اردو زبان و ادب کو فلمی ادبی عناصر میں جس قدر مقبول بنانے میں اپنا کردار ادا کیا وہ کسی بھی ایجنسی نے وہ کار ہائے نمایاں انجام نہیں دیا۔

فلموں کے ادبی عناصر کی مقبولیت کا اندازہ شعلے کے مکالموں سے لگایا جا سکتا ہے۔ جتنے ساؤنڈ ٹریک شعلے کے مقبول ہوئے وہ سلیم جاوید کے اردو ڈائیلاگ کا کرشمہ اور آج بھی اس کے ڈائیلاگ عوام میں اس قدر مقبول ہیں کہ جا بجا موقع بہ موقع اس کا استعمال ہوتا ہے اور اس میں کوئی فنی جھول نہیں ہے۔ فلم کے بنانے میں فنی جھول ہو سکتا ہے جیسے شعلہ میں ویرو کا پانی کی ٹنکی پر کھڑا ہو جانا اور وہاں سے اپنی خودکشی کا اعلان کرنا جبکہ گاؤں میں بجلی نہیں تھی تو پانی کی ٹنکی کیسے کام کر سکتی تھی اور اس کی کیا ضرورت تھی لیکن اس کے باوجود ویرو کے ڈائیلاگ اپنی مقبولیت کم نہیں کر پاتے۔ اس لئے مکالمہ نگار سین کے مطابق مکالمہ لکھتا ہے یہ فلم پروڈیوسر کا کام ہے کہ فلمی خامیوں پر نظر رکھے۔

اردو شاعری بالخصوص فلمی شاعری کے مصرعہ بھی عام طور پر زبان زد عام ہو جاتے ہیں جیسے میرا گاؤں میرا دیش جیسی فلم کا یہ مصرعہ: مار دیا جائے یا چھوڑ دیا جائے یا پھر پردہ نہیں جب کوئی خدا سے بندوں سے پردہ کرنا کیا۔ یا پھر یہ شعران کو جو ہے پسند وہی بات کہیں گے۔ وہ دن کو کہیں رات تو ہم رات کہیں گے وغیرہ وغیرہ بہت سارے ایسے مصرعے اور اشعار ہیں جن کی مقبولیت اتنی ہے کہ زبان زد عام ہوگئی ہیں۔

ہندوستانی فلموں کا ایک سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ فلم ریلیز ہونے کے پہلے ہی ان کے گیتوں کی مقبولیت کو خود بخود منزل مقصود تک عوام پہنچا دیتی ہے۔ اردو کی خاصیت یہ رہی ہے کہ اس کے اندر خود اتنی توانائی ہے اور اتنی وسعت ہے کہ اردو عوام سے کٹ کر نہیں رہ سکتی اور عوام اردو سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ اس کا دامن اتنا کشادہ ہے کہ اس کے اندر انگریزی مصرعے بھی ضم ہو جاتے ہیں اور اس کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ اور ان مصرعوں میں اجنبیت کا احساس نہیں رہ جاتا۔ ابھی تو ریمکس گیتوں میں انگریزی مصرعوں کی پیوند کاریاں نیا ذائقہ دے رہی ہیں اس سے قبل بھی انگریزی مصرعے شعروں کی جان بن جاتے تھے جیسے یہ گیت کا حصہ بار بار یہ دن آئے بار بار یہ دل گائے، تم جیو ہزاروں سال، ہے یہی میری آرزو ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ''آرزو'' اور ''یو'' کا قافیہ بڑا ہی خوبصورت لگتا ہے۔

ابتدا ہی سے مکالمہ نگاری میں اختر الایمان ہوں کہ ڈاکٹر راہی معصوم رضا تمام مکالمہ نگاروں نے اردو کی صناعی و غنائی فنکارانہ ادبی پہلوؤں کو اپنے مکالمہ نگاری میں اہمیت دی ہے اور اس لئے جب شطرنج کے کھلاڑی بنانے والے ڈائریکٹر نے جاوید ہاشمی کو بلایا اور کہا کہ آپ اس فلم کا ڈائیلاگ لکھیں تو وہ پریشان ہوگئے اور انہوں نے عرض کیا کہ میں نے ڈائیلاگ کبھی لکھا نہیں تو ڈائریکٹر نے کہا کہ ارے یار اردو جانتے ہو نہ مکالمہ لکھ لو گے جاؤ۔ یہ کام تمہیں دیا۔ اس دن سے وہ مکالمہ نگار ہو گئے تو فلمی ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں کی بھی عام رائے تھی کہ اردو جاننے والے لٹریری اعتبار سے اس قدر واقف کار ہوتے ہیں کہ ان سے اچھے مکالمے اور گیت لکھوائے جا سکتے ہیں۔

فلمی گیتوں میں جو نام بہت زیادہ مشہور ہوئے ان کے گیتوں کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن جو نام بہت مشہور نہیں ہوئے ان کے گیتوں کی بھی مقبولیت کم نہیں رہی اور تمام گیت کاروں کا پس منظر اردو ماحول رہا ہے۔ اردو

شاعری کے تانے بانوں کے درمیان شاعری کی ہے۔ کہیں کہیں تجربے بھی کئے ہیں اور نیا ذائقہ نئے لفظوں کی ترتیب نئی معنویت سے آشنا بھی کرایا ہے یہ ساری چیزیں بغیر ادبی فنکارانہ صلاحیتوں کے ممکن نہیں تھی۔ ہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعروں نے لکیر کا فقیر بننے کی کوشش نہیں کی بلکہ عوام میں مقبولیت اور سین کی مناسبت کو اولیت دی ہے۔

فلم میں ادبی عناصر کا یہ بھی عالم ہے کہ مخدوم محی الدین کی نظم ''ایک چمیلی کے منڈوے تلے'' جو ایک آزاد نظم ہے اسے بھی موسیقی کی ترنگوں میں اس قدر ڈوبا دیا ہے کہ سننے والا یہ احساس ہی نہیں کرسکتا کہ یہ آزاد ہے یا پابند۔ حسرت موہانی کی غزلیں ان کی مشہور غزل ''چپکے چپکے رات دن آنسو بہانہ یاد ہے۔ بہت ہی مقبول ہوئی۔ اور فلم ''غالب'' میں غالب کی غزلوں کو موسیقی نے مزید اسے عوام میں مقبول کردیا۔ راجہ مہدی علی خاں نے بھی بھرپور ادبی انداز کی غزلیہ مثلث لکھی اور مصرعے اتنے چست درست رہے کہ آج بھی وہ زبان زد عام ہیں۔ میں طوالت کے ڈر سے چند اشعار تک اپنی بات محدود رکھوں گا اس لئے ان کا یہ شعر مجھے غم بھی ان کا عزیز ہے کہ انہی کی دی ہوئی چیز ہے۔ شکیل بدایونی نے بھی اپنی فلمی شاعری میں ادبی عناصر کو اپنایا اور برتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے بھی حتی المقدور کوشش کی ہے ان کی فلمی گیت کے یہ ٹکڑے وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن، اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا بہتر' چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں یا یہ غزل یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا'' اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا جس طرح سے تھوڑی سی ترے ساتھ کٹی ہے باقی بھی اسی طرح گذر جائے تو اچھا ایسے تو تم ہی نے مجھے برباد کیا ہے الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا۔ شیلندر، اندیور، قمر جلال آبادی اور جی ایس کوہلی نے بھی خوبصورت ادبی پیرائے کے گیت لکھے ہیں۔ شیلندر نے سادگی میں جس انداز سے باتیں کہیں ہیں وہ دل کو چھولیتی ہیں اندیور کا یہ گیت میرا دل کھلا ہے کھلا ہی رہے گا تمہارے لئے۔ گلزار کی یہ غزل جو آپ اتنا مسکرا رہے ہیں ہے کونسا غم جو چھپا رہے ہیں۔ گلزار نے بچوں کے لئے بھی نادر تحفے دیئے ہیں جیسے ان کا یہ گیت جنگل جنگل بات چلی ہے پتہ چلا ہے۔ چڈی پہن کے پھول کھلا ہے پھول کھلا ہے۔ جاوید اختر نے بھی خوبصورت گیت لکھے ہیں۔ ان کے والد جاں نثار اختر نے بھی فلمی گیت لکھے تھے۔ آنند بخشی سمیر وغیرہ نے بھی خوبصورت گیت لکھے ہیں۔ شہریار نے امراؤ جان ادا میں سادگی کے ساتھ غزل کہنے کا ادبی پیرایہ جو اپنایا ہے اس سے اردو شاعری کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

تو میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اردو جب بھی مشکل حالات سے گذرتی رہی ہے اس نے نئے نئے راستے تلاش کرلئے ہیں عوام کے دلوں میں اترنے کے لئے ایک زندہ زبان کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ عوام کے دلوں پہ راج کرے۔ اور آج بھی سرکاری بے اعتنائی کے باوجود فلم کے ذریعہ اردو زبان کی جو ترویج و اشاعت ہو رہی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کے اندر اتنی Potentiality ہے کہ نا مساعد حالات میں بھی یہ زندہ رہ سکے۔ فلم والوں نے جانے انجانے طور پر اردو زبان و ادب کو توانائی بخشی ہے اور فلموں میں اردو کا ایک اپنا مقام ہے اور فلمیں اردو کے بغیر مقبول عام ہو ہی نہیں سکتیں اور اس زبان کو مٹانے کی سازش کرنے والوں کو بھی اس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اردو قوم اور اس کا کلچر کل بھی فروغ پا رہا تھا اور آج بھی فروغ پا رہا ہے۔

☆☆☆

نینا جوگن، کوہسار، بھیکن پور۔۳، بھاگلپور۔ 812001 (بہار)

بہار کی ایک میتھلی فلم

صوبہ بہار کو ہمیشہ سے پچھڑا مانا جاتا رہا ہے۔ جھارکنڈ کے الگ ہوجانے کے بعد یہ ریاست کئی معنوں میں پچھڑ گئی ہے۔

لیکن اکیسویں صدی میں فلم کی صنعت کی طرف توجہ دی جارہی ہے۔ سابق وزیر اعلیٰ لالو پرساد اور موجودہ چیف منسٹر نتیش کمار نے الگ الگ موضوعات اور سبجکٹ پر فلمیں بنانے کی طرف خصوصی دھیان دیا ہے۔ گھریلو، سماجی اور تاریخی فلم بنانے کے لئے انہوں نے ہمت افزائی کی ہے۔

گیتوں بھری بہار کی ایک فلم ''اگنارے مور کتے گیلا'' ہے۔ یہ بہار کے مشہور بھگت کوی ودیا پتی کی زندگی پر مرکوز ہے۔ یوں تو بہار میں زیادہ تر فلمیں بھوجپوری میں بنتی ہیں۔ کچھ ہندی میں بھی بن رہی ہیں۔ لیکن فلم ''اگنارے مور کتے گیلا'' میتھلی زبان میں بنی ہے۔ بہاری فلمی صنعت کی یہ سب سے بڑے بجٹ کی فلم ہے۔ اس کی لاگت ستر لاکھ سے زیادہ ہے۔ مہورت ممبئی میں ہوا جب کہ شوٹنگ کے لئے لاکھوں روپے کے سیٹ مدھوبنی کے بنی پٹی کے گاؤں غوث نگر اور کھیرہر میں لگائے گئے۔ آخری شوٹنگ پٹنہ کے دیدار گنج میں ہوئی۔ اس میتھلی فلم کو ارپنا فلمس اور اُگنا انٹرٹینمنٹ نے مل کر بنایا ہے۔ سنتوش بادل اس کے ڈائرکٹر ہیں۔ اس سے پہلے سنتوش کئی کامیاب سیریل بنا چکے ہیں۔ کیونکہ ساس بھی کبھی بہو تھی، لٹی پارٹی، ایک محل ہو سپنوں کا ''قیامت'' ''کہانی گھر گھر کی''، کسم وغیرہ میں ان کے تجربے بولتے ہیں۔ فلم ''اگنا اے مور کتے گیلا'' کو سجانے سنوارنے میں انہوں نے پوری دلچسپی دکھائی ہے۔ فلم کے ہر منظر، ہر سین پر ان کی باریک بین نگاہ رہی ہے۔ تمام اداکاروں اور آرٹسٹوں سے خوب خوب کام لیا ہے۔ موسیقی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس فلم میں گیارہ گیت ہیں جن میں دس گیت ودیا پتی کے لکھے ہوئے ہیں جب کہ شادی کا ایک گیت ابھیراج جھا کا ہے۔ اس فلم کے موسیقار گیانیشور دوبے اور سریش یہ نند ہیں۔ ادت نارائن، دیپا نارائن، ممتا راجے کے ساتھ دونوں موسیقاروں نے بھی گیت گائے ہیں۔ ممبئی کے معروف کیمرہ مین آرآر پرنس نے کہانی کے مطابق فوٹو گرافی کی ہے۔ پرنس کا آبائی وطن پٹنہ ہے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر سنتوش بادل نے فلم کی کہانی پر دس سال محنت کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ودیا پتی کی بھکتی سے خوش ہوکر بھگوان شیو اگنا کے بھیس میں نوکر بن کر اپنے بھگت کی سیوا میں لگے رہے تھے۔ اس فلم کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس کے سارے اہم کردار بہاری ہیں۔ بیگوسرائے کے رہنے والے پھول سنگھ ودیا پتی بنے ہیں۔ ہیروئن یعنی ودیا پتی کی بیوی کا رول دربھنگہ کی رہنے والی ممتا راجے نے کیا ہے۔ ممتا راجے گلوکارہ ہے لیکن اس فلم میں ہیروئن بنی ہے اور دو گیت اس نے خود گائے ہیں۔ پٹنہ کے دیپک سنہا کا رول بھی اس فلم میں اہم ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

ادبی اوصاف سے مزین فلمی جریدہ: شمع

رسالوں کا جاری رکھنا کل بھی مشکل کام تھا اور آج بھی مشکل کام ہے۔ میں بحیثیت اعزازی مدیر تمثیل نو اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ الکٹرونک میڈیا کے آجانے کے بعد یہ کام اور بھی مشکل ہو گیا ہے لیکن آج بھی ہندوستان میں مختلف زبانوں میں اخبارات و رسائل مختلف نوعیت کے شائع ہوتے ہیں اور انہیں مقبولیت بھی حاصل ہوتی ہے یہاں تک کہ ویب سائٹ پر بھی چند رسائل کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔ رسالہ میں سب سے اہم پہلو رسالے کے مزاج کو برقرار رکھنا ہے مگر دلچسپی کے لئے مرچ مسالہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے بیشتر اخبارات و جرائد فلمی کالم اور صفحات بھی الگ سے رکھتے ہیں کیونکہ فلموں سے عوام کا رشتہ جڑا ہوا ہے اور ہندوستان میں فلم سے بڑا تفریح کا ذریعہ کوئی اور دوسرا نہیں ہے۔ اس کو ہر طبقہ کے لوگ دلچسپی سے دیکھتے ہیں اور تناؤ کو دور کرنے کے لئے یہ تفریحی ذریعہ بہت ہی مقبول ہے۔

اردو میں بھی تقریباً تمام اخبارات و رسائل فلموں سے اہم خبریں، تبصرے اور ان میں کام کرنے والے ہیرو ہیروئن کے فلمی کردار سے لیکر ان کی ذاتی زندگی تک کی اطلاعات صفحوں پر بکھیرتے رہے ہیں فلمی گپ شپ، افواہیں آپسی چشمک اور بدلتے ہوئے سماجی پس منظر پر اخبارات و جرائد بہت ہی گہرائی سے لکھتے رہے ہیں۔ ان ساری چیزوں میں دلچسپی کے مواد کی کمی نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کے فلمی گپ شپ محض اشتہار بازی ہوا کرتے ہیں لیکن اس میں کتنا افسانہ اور کتنی حقیقت ہوتی ہے اس کا اندازہ قارئین بھی بخوبی لگا لیتے ہیں۔ فلموں کے کردار سماج میں رول ماڈل کی حیثیت سے بھی ابھرتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی فلموں میں اس بات کا لحاظ خصوصی طور پر رکھا جاتا ہے کہ اس میں ٹریجڈی کم اور کمیڈی زیادہ ہو۔ تقریباً تمام فلموں کا موضوع سماج ہوتا ہے اور سماج میں سب سے حاوی پہلو عشق و محبت کی داستان ہوتی ہے جس میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہوتی ہے۔

اردو میں فلمی میگزین میں ''شمع'' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اور معیاری اردو میں کوئی فلمی جریدہ نہیں نکلا۔ یوسف دہلوی اور بعد میں ان کے صاحبزادوں یونس دہلوی، ادریس دہلوی، اور الیاس دہلوی نے ''شمع'' کو فلمی جریدہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ادبی انداز اور عوامی مقبولیت کے پہلوؤں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

شمع میں دو چار کہانیاں ہی آتی تھیں لیکن وہ کہانیاں ادبی لحاظ سے بھی معیاری ہوتی تھیں اور دوسرے جرائد کے مقابلہ میں وہ کسی طرح کمزور اور مقبولیت کے لحاظ سے کمتر بھی نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ تازہ بہ تازہ اور نئے موضوعات پر جتنی کہانیاں ''شمع'' میں شائع ہوئیں اس کی مثال کسی دوسرے فلمی اور ادبی رسالے میں نہیں ملتی۔ فلمی تبصرے بھی ناپ تول کر شائع کئے جاتے تھے۔ تکنیکی پہلو سے لے کر ادبی پہلو تک شمع میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا بلکہ

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ فلمی جرائد میں ''شمع'' ایک صف اول کا میگزین شمار کیا جاتا رہا۔ اس کا شعری پہلو بھی کسی بھی ادبی جرائد کے مقابلہ میں معیار و مزاج کے اعتبار سے بلند تھا۔ ''شمع'' کے اداریے بھی اپنے آپ میں ادبی چاشنی کی مٹھاس رکھتے تھے۔ سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ شمع میں شائع ہونے والے کراس ورڈس جسے ''معمہ'' کے نام سے جانا جاتا تھا اس کے ہر حرف، جملے اور لفظ ادبی انداز کے ہوتے تھے جو کسی ادبی کتاب سے ماخوذ ہوا کرتے تھے۔ اور اس کا کمپائلر اس قدر ذہین ہوتا تھا کہ مترادف الفاظ اس قدر بن سکتے تھے اور دیکھنے میں بھی خوبصورت لگ سکتے تھے ایسی بھول بھلیاں پیدا کرنا ایک ذہین ادیب اسکالر کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ اس لئے شمع کے معمے بھی ادبی معیار و مزاج کے حامل ہوا کرتے تھے۔ ''شمع'' میں سوال و جواب کا کالم بھی ہوتا تھا جس میں لطیفوں کو اس طرح پرویا جاتا تھا کہ بہت سے قارئین سب سے پہلے ان ہی صفحات کو پڑھتے تھے۔ ایک زمانے میں اس رسالے کی اشاعت ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

''شمع'' میں شائع ہونے والی خبریں جو فلمی دنیا سے تعلق رکھتی تھیں ان کو دیکھنے سے کسی حد تک بھی بازاری نہیں لگتے بلکہ ایسا لگتا تھا کہ نجی زندگی سے لے کر سماجی زندگی تک تمام خبریں کل کی تاریخ بن جائیں گی۔ مختلف اداکاروں فلم کا روں اور فلم سے جڑے گیت کاروں، موسیقاروں، کیمرے کے کام کرنے والے اشخاص سے ملاقاتیں ایک نیا پہلو سامنے لاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب نام بڑا ہو جاتا ہے تو وہ کسی حصار میں قید نہیں رہتا بلکہ اس کی نجی زندگی بھی عوامی ہو جاتی ہے جس سے اس کی الجھنیں بڑھ جاتی ہیں۔ آزادی چھن جاتی ہے اور اسے مجبوراً ہر کچھ قبول کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسی صورت میں وہ نامہ نگاروں کالم نگاروں انٹرویو لینے والوں کو وہ ساری باتیں بتانے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے اس کی نجی زندگی کا تعلق ہوتا ہے اس کا سب سے بڑا پہلو اور اہم حصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی حصے سے اور برصغیر کے کسی گوشے سے بھی جو فنکار آتا ہے وہ لازماً طور پر اپنی زندگی کی شروعات جدوجہد کے طور پر کرتا ہے وہ پیدائشی بڑا نہیں ہوتا اسکی زندگی میں بہت سارے نشیب و فراز آتے ہیں اور اس سے عوام انسپائر ہوتی ہے اور اس کا حوصلہ جدوجہد کرنے کے لئے بڑھتا ہے یہ پہلو ''شمع'' جیسے جرائد نے بخوبی Potrait کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک معرکتہ الارا کارنامہ ہے۔ شمع میں فنکاروں کی یوم پیدائش ان کے پتے تفصیلات اور ان کے مختصر تعارف بھی ہر مہینے شائع ہوتے تھے۔ جس سے عام لوگ کو بھی سلبر ٹیز سے رابطہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ جیسا کہ فلموں سے انسپائر ہونے کی بات میں نے کہی ہے فلموں سے انسپائر ہونا اور ذاتی زندگی سے انسپائر ہونے میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ انسان مقامات کی بلندیوں پر جب پہنچتا ہے تو اس کے سامنے اس کے ماضی کے دشوار گذار مرحلے بھی ہوتے ہیں جسے وہ یاد کر کے ملول بھی ہوتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے ہندوستان میں فلم انڈسٹری میں آج کے دنوں میں وراثت میں نام و شہرت حاصل ہونا عام سی بات ہے لیکن ابتدائی زمانہ میں فنکارانہ صلاحیت تجربے کا ملکہ بلندی تک پہنچانے کے لئے ذرائع ہوا کرتے تھے۔ ٹرائل اینڈ ایرر تھیوری کا بھی سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ گلیمر کی دنیا اس قدر باہر سے دلکش نظر آتی ہے۔ اس چمک دمک میں کتنے فنکار گم ہوگئے اور کتنے لوگ اپنی زندگی تباہ کر چکے کیونکہ کامیابی کے لئے محض ٹیلنٹ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ زبردست جدوجہد کے ساتھ ساتھ Tactsful dealing کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ غم ہو ر پراتا اور بے جا خودداری انسان کو

کبھی کبھی گمراہ بھی کر دیتی ہے اور مناسب تقاضوں کو نظر انداز کر کے ایک اعلیٰ فنکار بھی ناکام ہو جاتا ہے۔ فنکار کے لئے اس کا Self Satisfaction اور اپنی ذات کی تسکین کا مسئلہ بھی ہوتا ہے لیکن وقت کے تقاضے اس سے دوسرے کام بھی کروا لیتے ہیں اگر شخصیت میں یہ لچیلا پن موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں ایک بڑا فنکار بھی دشواریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''شمع'' نے ان باتوں کی طرف بھی عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ فلم کاروں کو سمت متعین کرنے میں مدد دی ہے۔ عوام کے تقاضوں کو بتانے کی کوشش کی ہے کہانیوں میں ڈایلاگس میں اسکرین پلے میں اسکرپٹ میں جو جھول موجود ہوا کرتے تھے اس کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش بہت ہی خوبصورتی سے کی ہے۔ پروپگنڈہ اشتہار بازی، اسٹنٹ کے پیچھے جو منفی اور مثبت پہلو ہوا کرتے تھے اسے بھی قاری تک پہنچانے میں شمع نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

فلمی جرائد میں شمع کے مقابلہ میں اردو میں اس قدر جاندار و شاندار رسالہ اب تک شائع نہیں ہوا جس اصطبل پر بھی ''شمع'' رکھا جاتا تھا وہاں ''شمع'' کے پروانے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے تھے۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت ''شمع'' نے ہندی میں بھی ایک رسالہ ''سشما'' کے نام سے نکالا لیکن اسے مقبولیت اس قدر حاصل نہیں ہو سکی جو اردو شمع کو حاصل تھی۔ ایسے شمع پبلی کیشن نے خواتین کے لئے'' بانو'' اور بچوں کے لئے'' کھلونا'' اور بروں کے لئے'' آئینہ''، ''شبستاں'' (ڈائجسٹ) اور'' مجرم'' جیسے دیدہ زیب اور مقبول رسالے بھی نکالے۔ لیکن تمام رسالوں کے مقابلہ میں ''شمع'' ادبی اعتبار سے اور تمام لحاظ سے منفرد اور دلکش جریدہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا سرورق کافی جاذبیت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا تھا کہ کتابت وطباعت سب ایک ماہر مدیرانہ ٹیم کی باصلاحیت کوششوں کا نتیجہ لگتی تھی ایسے جرائد اب اردو میں ناپید ہیں جو ہر جہت سے خوبصورت اور معیاری ہوں۔ اس کا سرورق مشہور مصور اندر جیت بنایا کرتے تھے۔ یہ وہی اندر جیت ہیں جو پنجابی شاعرہ امریتا پریتم کے ساتھ تا عمر رہے۔ ''شمع'' کے کارناموں کو اردو کی ادبی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اردو فلمی جرائد میں یہ صف اول کا رسالہ تھا اور اس نے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے اور اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

فیاض احمد وجیہہ، (جواہر لال نہرو یونیورسٹی)، نئی دہلی

ہندوستانی فلموں میں ادبی عناصر

کسی بھی فن پارہ میں ادبی عناصر اور ادبی احساس (Literary sense) کا مفہوم کیا ہے؟ اس بنیادی سوال کے دائرہ کار میں ہی اس مضمون کی Thesis کو روشن کرنا مقصود ہے۔ ادب کے مختلف النوع اسالیب بیان کی طرح فلم بھی ایک سماجی فن پارہ ہے، اور یہ بات بے حد روشن ہے کہ سماج ایک Given reality ہے۔ چنانچہ ادب کا کوئی بھی امتیازی اسلوب ہو، وہ اپنے تخیل کی راست گوئی کو منہا کر کے کسی فکری دائرہ کی تعمیر نہیں کر سکتا (؟)۔ دراصل یہ فکری دائرہ انسان، سماج اور اس عہد کی سائیکی کی تجریدی مصوری ہے، جس میں زندگی کی علامتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ادب اپنے امتیازی اسلوب میں انہی علامتوں کو نئے نئے معانی پہناتا ہے، فلم بھی فنون لطیفہ کی اس خوبی کا سب سے مؤثر اور طاقتور اسلوب ہے۔ ہندوستانی فلموں نے زندگی کی علامتوں کو کس اسلوب اور انداز میں معنی پہنایا ہے (؟)، اس کے دائرہ اثرات میں کتنی وسعت اور آفاقیت ہے (؟) بعض ایسے ہی امور کے تجزیہ وتعارف میں Literary sense کو بہ خوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دراصل فلم میں ادبی احساس کی تشکیل، فنون لطیفہ میں تخلیقی بھید واسرار سے الگ کوئی نامیاتی شے نہیں ہے۔ اس کی ادبی تھیوری بھی تخلیقی متون کی شعریات سے کم وبیش متعلق ہے۔ فنون لطیفہ کے اکثر اسالیب بیان ہی کی طرح جب کوئی بیانیہ اس مؤثر اسلوب میں منقلب (Appear) ہوتا ہے تو بادی النظر میں گمان گزرتا ہے کہ یہ حقیقی دنیا کا ہو بہو اظہار نہیں ہے۔ بعض ایسے ہی مقام پر Given reality اور Interpreted reality کا وصل وفراق بیانیہ کے قالب میں روشن ہوتا ہے، اور احساس جمال کی منطق میں زندگی کا حقیقی رنگ نئے علاقوں میں تیر کر ایک حقیقی نقطہ بن جاتا ہے۔ رنگ وروشنی کی Metaphysics میں کرداروں کا تفاعل اور ناظرین کا تہذیبی متن اس احساس کو ہمہ گیر بناتے ہیں۔ دراصل فلم ایک بیانیہ آرٹ یعنی Plurimedial fictional narrative ہے (بیانیہ کے ان حدود میں Documentary film شامل نہیں ہے، اس کے لیے ادبی تنقید میں ایک الگ اصطلاح Plurimedial non-fictional narrative مستعمل ہے)، جو اپنے مؤثر اسلوب میں زندگی کے گہرے سے گہرے رنگ کو عام ناظرین کی سائیکی میں بھی شامل حال کرتا ہے۔ تخلیقی بیانیہ کی طرح اس کا بھی ایک Visible sense ہوتا ہے جو اس کو مرتب کرتا ہے، اور اس کے Invisible sense کی تعبیر بھی کرتا ہے اس میں ناظرین کے تہذیبی متن کا دخل ہی اس کے غیاب کو سیاق فراہم کرتا ہے۔ یہاں ہم بیانیہ کے ایک پورے پروسس کو نظر انداز نہیں کر سکتے چوں کہ:

"When we say we'understand'a narrative we mean that we have found a satisfacatory

relationship or set of relationships between these two worlds"

یعنی حقیقی اور فکشن ورلڈ کا وصل و فراق......، اس طرح انداز ہ ہوتا ہے کہ زندگی کا حقیقی رنگ بیانیہ کی تہوں میں لپٹا ہوتا ہے۔ اور ان تہوں کو کھولے بغیر کسی بھی آرٹ کے معنی و مفہوم کا تعین ممکن نہیں ہے۔ سعادت حسن منٹو نے ۱۹۴۲ء کے آس پاس یہ بات کہی تھی کہ، ''ہندوستان میں ابھی تک آرٹ کے صحیح معانی پیش نہیں کیے گیے''۔(2) کئی معنوں میں یہ بات اب بھی درست ہے، لیکن اس عرصئہ حیات میں ہندوستانی فلموں نے اپنے قالب کو اور زیادہ روشن اور مستحکم کیا ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں بعض ایسی فلمیں بھی موجود ہیں، جو آرٹ کے معانی کے تعین میں بے انتہا اہمیت رکھتی ہیں۔ بالخصوص نئی نسل کی تر و تازگی اور تخلیقی جدت نے ادب اور آرٹ کے صحیح تناظر کو پیش کیا ہے، اس نقطہ نظر کی تفصیل اور وضاحت سے پہلے چند اور پہلوؤں کو نشان زد کرنا ضروری ہے۔ میں نے جس تر و تازگی اور تخلیقی جدت کی بات کہی ہے، اس کو منٹو کے ہی ایک خیال کی روشنی میں دیکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں ٹھیٹ ہندوستانی فلم بننے چاہئیں۔ ہمارے وہ سوشل فلم جو آجکل سینکڑوں کی تعداد میں سینماؤں کے پردے پر چلتے ہیں۔ کیا ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں؟ اس کا جواب موٹے قلم سے یہ ہونا چاہیے 'نہیں' آپ ان فلموں میں کبھی 'ہندوستانیت' کو امریکی لباس میں دیکھتے ہیں اور کبھی امریکہ دھوتی کرتے میں نظر آتا ہے، جو بے حد مضحکہ خیز ہے، ان کو سوشل فلم کہا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح ہر ایکٹر خود کو آرٹسٹ کہتا ہے''۔

یہاں ٹھیٹ ہندوستانی فلم سے وہی Literary sense مراد ہے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ میں یہاں چند فلموں کے نام ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس کے بعد قارئین خود فیصلہ کرلیں گے کہ منٹو کے اس قول کی تعبیر میں ہندوستانی فلم کا دامن آج بھی تنگ ہے یا نہیں(؟) A wednesday، لگان، رنگ دے بسنتی، سودیش، ویرزارا، فراق، پاپ، بلیک اینڈ وہائٹ، جس دیش میں گنگا رہتا ہے، اوم کارا، رین کوٹ ---- یہ فلمیں اپنے سماجی سروکار اور ٹھیٹ 'ہندی' سروکار کی وجہ سے لینڈ مارک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن آج بھی ایسے فلموں کی بہتات ہے، جن کے پیش نظر منٹو نے 'ہندی تہذیب' کے آگے سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ فارمولہ فلموں کا نظریہ اور غور و فکر کا فقدان ہی ایسی بعض مضحکہ خیز صورتحال کا باعث ہے۔ مشہور و معروف فلم 'امراؤ جان' کے ہدایت کار سید مظفر علی نے بھی جواہر لال نہرو یونیورسیٹی (4) میں پبلک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا تھا اور فلموں کے سماجی سروکار کو اپنے نقطہ نظر کی روشنی میں مرتب کرتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ حرص و طمع کی منطق اور فارمولہ فلموں کے صارفی نظریہ میں اس کا ادبی جمال اور حسن کہیں کھو گیا ہے۔ نئے آئیڈیاز اور کلاسکی متون کی اکثر فلم کاروں کے نزدیک کوئی قدر نہیں

ہے۔زندگی کے معنیاتی حوالوں پر غور کیے بغیر فقط اپنے ناظرین کی برہنہ خواہشات کو Cash کرنا ہی ان کا اصل مقصود ہے۔روح کی سیرابی کے لیے مغربی دنیا 'رومی' کی روحانیت میں پناہ لے رہی ہے،اور ہمارے ہاں نہ اصل زندگی سے کوئی سروکار ہے اور نا ہی تصوف کے فکری حوالے کی پیشکش کی کوئی کوشش (واضح ہو کہ ان دنوں سید مظفر علی ''رومی'' کے تصورات ونظریات کو فلم کے مؤثر اسلوب میں ڈھالنے میں مصروف ہیں)۔انہوں نے اپنی فلموں میں ادب اور زندگی کے حسین امتزاج کو ہمیشہ ایک تہذیبی سیاق میں پیش کیا ہے۔مظفر علی کی ہدایت کاری کا نمونہ کم وبیش ان کی دو فلموں 'امراؤ جان' اور 'انجمن' میں ناظرین ملاحظہ کر چکے ہیں۔مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا پر تین فلمیں بنائی گئیں،لیکن 'مہندی' (پشپا پکچرز) اور حالیہ ریلیز 'امراؤ جان' میں ناول کی روح دو فیصدی بھی موجود نہیں ہے کیوں (؟) مظفر علی کی 'امراؤ جان' سے ہم کہیں کہیں اختلاف ضرور کر سکتے ہیں،لیکن اس کے ادبی حسن اور مجموعی آہنگ میں ناول کی روح کو شدید طور پر محسوس کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس فلم کی تشکیل میں ناول نگار کے نقطہ نظر کو ہر ہر سطح پر نمایاں کرنے کی صد گونہ کوشش کی گئی ہے۔ریکھا،نصیرالدین شاہ،اور فاروق شیخ وغیرہ کی لاثانی اداکاری کے علاوہ،وہ تمام نقوش جو اس تہذیب کی یادگار ہیں ان کو بھی اس فلم میں مستحکم کرداروں کے طور پر قائم کیا گیا ہے۔نئی شاعری کے مشہور شاعر شہریار نے کرداروں کی روح میں اتر کر نغمے لکھے اور شہرہ آفاق فن کارہ آشا بھونسلے نے لفظوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے ادبی حسن کو نکھار دیا،اس لیے یہ فلم بھی ناول کی طرح ہی کلاسک میں شمار کی جائے گی۔اسی ناول پر بنائی گئیں مذکورہ دو فلمیں کسی کو اب یاد بھی نہیں رہ گئی ہیں،حالیہ 'امراؤ جان' کے ناظرین اس نقطہ کو بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں کہ فارمولہ فلموں کا نظریہ اور بھدی تقلید کے جراثیم نے ایک ہی فن پارہ کے دوسرے اسلوب کو کتنا مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔مظفر علی کی ہی فلم 'انجمن' (شبانہ اعظمی اور فاروق شیخ) میں ان کے زندگی کو دیکھنے کا نظریہ بہت واضح ہے،عورتوں کی بغاوت میں ترقی پسند شعریات کی تعبیر وتصریح ضرور نظر آتی ہے لیکن زندگی کو فطری صورت میں گامزن کرنے کی کوشش کسی نام نہاد نظریہ کی ترجمانی سے زیادہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کا عمل ہے۔میرے خیال میں یہی اس فلم کی ادبی جمالیات ہے۔ان حوالوں سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ادب اور آرٹ کے نظریہ سے بھی فلمیں بنائی جا رہی ہیں،لیکن ایسے ہدایت کار زیادہ ہیں جن کو ادب کے صحیح تصور سے کوئی غرض نہیں ہے۔مظفر علی ایسے بعض ہدایت کار اس رمز سے آگاہ ہیں کہ فلم کے ذریعہ تماشائی سماج کے ذہن ودل سے بہ خوبی مکالمہ کیا جا سکتا ہے۔دراصل فلم اپنے جداگانہ اسلوب میں تفریح اور تربیت دونوں کا بے حد مؤثر وسیلہ ہے،اس لیے اس سے بے پناہ کام لیے جا سکتے ہیں۔ان باتوں کی طرف منٹو نے بھی بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے:

> ''فلم کے عالمگیر اور ہمہ رس اثر کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی عوام کے اذہان کو بیدار کرنے کے لیے ایسی فلموں کی ضرورت ہے جو کوئی نئی بات سکھائیں اور جن کو دیکھ کر تماشائی تفریح حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سینما ہال سے باہر نکلتے وقت

اپنے دماغوں کی آغوش میں غور وفکر کے جراثیم بھی لیتے جائیں"۔

بہت واضح انداز میں منٹو نے فلم کے دائرہ اثر میں اس نقطہ کو روشن کیا ہے کہ غور وفکر کے جراثیم سے ہی ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے گا۔ دراصل وہ ہماری فلموں میں ایک نوع کا Literary sense چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے ادبی ذوق کی بحالی کے لیے یہ مطالبہ بھی کیا:

"اگر پبلک میں پست مذاق کے لوگ موجود ہیں تو اس کے ذمہ دار ہمارے پروڈیوسر ہیں جو مذاق کی پستی کی طرف لے جاتے ہیں...... جادو کے لایعنی قصے اور پریوں کی فرضی کہانیوں میں اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ ہمارے پروڈیوسر سمجھتے ہیں۔ پبلک ایسی فلم چاہتی ہے جن کا تعلق براہ راست ان کے دل سے ہو۔ جسمانی حسیات سے متعلق چیزیں زیادہ دیر پا نہیں ہوتیں مگر جن چیزوں کا تعلق روح سے ہوتا ہے، دیر تک قائم رہتی ہیں"۔

یہاں منٹو نے پست مذاق اور جسمانی حسیات کے تصور میں پروڈیوسر کے اس ذہنی رویہ کو بھی نشان زد کیا ہے، جس کی موجودہ تعبیر میں ہم فارمولہ فلموں کو ہندوستانی پردہ پر رنگ اور روشنی کی بیہودہ صورت میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ یہاں مشرق کی طہارت ہے اور نہ ہی جنسی جمال کا تخلیقی اظہار، ایسی فلمیں سماج اور معاشرہ کو کس طرف لے جارہی ہیں (؟) یہ ایک اہم سوال ہے۔ جنسی جمال کے اظہاریہ میں اگر 'پاپ' ایسی کوئی فلم بنتی ہے تو بے ساختہ منٹو کے پانچ دن کے پروفیسر کی یاد آتی ہے، جس میں فطری تقاضوں کی نفی کے تصور پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ اسی طرح "رام تیری گنگا میلی" کی اداکارہ جب اپنے شیر خوار بچے کو چھاتی کھول کر امرت کی بوندیں پلاتی ہے تو مجھے اس روسی افسانہ نگار کے فن کی یاد آتی ہے، جس میں ایک عورت اپنی ممتا کے درد سے بے قابو ہو کر اس اجنبی نوجوان کے منھ میں اپنی چھاتی ڈال دیتی ہے، جو اس کو بہت دیر سے ایک نوع کی بے چینی میں مبتلا دیکھ کر اپنے اندر کے حیوان کو دلاسا دیتا ہے۔ اور اس عجیب وغریب حادثہ کو جب وہ کوئی معنی پہنانا چاہتا ہے تو اس کی قلب ماہیت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ عورت اپنا بچہ گھر بھول آئی ہے، اس لیے اس نوجوان کی بے حد شکر گزار ہے اور اپنی اس غلطی کے لیے معافی کی طلب گار بھی۔ یہاں اس نوجوان کی سائیکی میں ناظرین کی ننگی آنکھوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ اس آئینہ میں بہ طور اداکارہ اس ہندوستانی عورت کا چہرہ کتنا پرنور نظر آتا ہے، اس کو ناظرین بہ خوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ کسی بھی فلم کا ادبی جمال اس کو زندگی کے کن تناظرات میں متشکل کر سکتا ہے، یہ محض اس کی ایک مثال ہے اور ایسی متعدد مثالیں ہماری بعض بہترین فلموں میں موجود ہیں۔ یہاں کسی فلم کا تجزیہ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ ہماری فلمیں اپنے Literary sense کی وجہ سے ایک نئے آفاق کی جستجو میں کتنا اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ ہندوستانی فلم میں ایک الگ طرح کے اسلوب کو قائم کرنے والے ممتاز اداکار عامر خان نے علاقائی اسلوب کی نمائندگی کرنے والے معروف اداکار، روی کشن کو انٹرویو (7) دیتے ہوئے بعض ایسے ہی پہلوؤں

کو روشن کیا تھا، انہوں نے خاص طور سے اس بات پر زور دیا تھا کہ میں فلم محض تفریح کے لیے نہیں کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ عوام کو کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملے، وہ میری فلموں سے کچھ لے کر اپنے گھر جائیں۔ منٹو نے بہت پہلے ہندوستانی فلموں سے یہ توقع قائم کی تھی:

> ''ہمیں اس وقت ایسے فلم درکار ہیں جو ہمیں کچھ سکھائیں۔...... ہمیں اپنی زبان سے پیار کرنا سکھایا جائے۔ ہمیں اپنے وطن سے پیار کرنے کا سبق دیا جائے۔ ہمیں محبت کے حقیقی معنوں سے آشنا کرایا جائے، ہمارے سامنے کتاب انسانیت کے اوراق کھولے جائیں''۔

ہندوستانی فلموں میں اس نظریے کی ترجمانی کرنے والے ایک بڑے فن کار عامر خان ہیں۔ ان کی اکثر فلمیں زندگی کی تفسیر میں ادبی جمال کا حسن پیش کرتی ہیں۔ میں یہاں صرف چند فلموں کے سیاق کو ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ''رنگ دے بسنتی'' کا بیانیہ اپنی اصل صورت میں ہندوستان کی تاریخ آزادی کے بعض ایسے ہیرو کی کہانی ہے جن کو تاریخی متون میں بھی ہر ہر سطح پر نظر انداز کیا گیا ہے، اس کی اصل اسپرٹ اور کرداروں کے تفاعل کو آج کے سیاسی اور سماجی حالات سے، ہم آہنگ کر کے نہ صرف آزادی کے ان دیوانوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے بلکہ موجودہ دور میں اس کی معنویت اور اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ''منگل پانڈے'' کے کردار میں بھی عامر خان نے یہ کوشش کی ہے کہ اس دیوانے کی قربانی کو نئی نسل اپنے سینے سے لگائے، چوں کہ ہندوستانی تاریخ میں ان کو صحیح جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اسی طرح ''لگان'' میں جدوجہد آزادی کو ایک نئے رنگ یعنی کرکٹ میچ کے مقابلہ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے، اس فلم میں چھوا چھوت ایسی لعنت کو بھی Discus کیا گیا ہے اور انسانی عظمت واعتماد کے ترانے بھی گائے گئے ہیں۔ ''تارے زمین پر'' معصوم ذہنوں کو حوصلہ عطا کرنے والی ایسی فلم ہے جو علم و ہنر کے فطری اسلوب کو پیش کرتی ہے۔ ان کی حالیہ فلم ''تھری ایڈیٹس'' بھی ان کے نقطہ نظر کی ترجمانی میں ہندوستانی فلم کا ایک نیا موڑ ہے۔ مزاحیہ اسلوب میں بنائی گئی اس فلم میں زندگی کے بے حد گہرے اور ہمہ گیر حوالے اس طور پر در آئے ہیں کہ ادب کے شاہ کار مزاح پاروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مزاح میں زندگی کے کتنے گہرے دکھ ہوتے ہیں۔ انسان کی ذہنی آزادی اور فطری زندگی اس فلم کا مرکزی نقطہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کس طور پر زندگی کا حوالہ بنتی ہیں، اس فلم میں اس کے تشخص کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے آرٹ کے صحیح معانی کو یہ فلمیں قائم کرتی ہیں۔ زندگی کو ایک اور نئے اسلوب میں پیش کرنے والے فن کار شاہ رخ خان کا نقطہ نظر بھی اس باب میں بے حد روشن ہے کہ فلمیں محض چند ساعتوں کی تفریح نہیں (؟) بلکہ زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک روشن اسلوب ہے۔ ان کی فلمیں عشقیہ اقدار اور حسن وعشق کی منطق میں بعض دفعہ کتھارسس کے عمل کو ناظر کی آنکھوں میں روشن کر دیتی ہے تو بعض مرتبہ حوصلہ بھی عطا کرتی ہے۔ اس تعلق سے کم وبیش ان کی دو فلمیں ''دیوداس'' اور ''محبتیں'' یادگار ہیں۔ ان کے ہاں محبت اور پریم کی ایک الگ معنیاتی فرہنگ وضع ہوئی ہے۔

اس حوالے سے ان کی فلمیں ''دل والے دلہنیا لے جائینگے''، ''دل تو پاگل ہے''، ''کچھ کچھ ہوتا ہے''، ''اوم شانتی اوم''، ''دل سے''، ''رب نے بنادی جوڑی''، ''پردیس'' اور ''کبھی خوشی کبھی غم'' کے تناظرات کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے اسلوب میں نیا رنگ بھرنے والی کئی فلمیں ایک نوع کے ادبی احساس کی زائیدہ ہیں۔ ''سودیش'' میں اپنے گاؤں اور ملک کے تعلق سے جس تعمیری سوچ کو پیش کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کتنی حساس ہے۔ اپنی کاویری اماں کے گاؤں میں چند دنوں کے لیے مقیم امریکہ میں Nasa میں کام کرنے والا نوجوان ہندوستان کے مسائل، مثلاً بجلی، ٹیلی مواصلات اور تعلیمی پسماندگی وغیرہ کو دیکھ کر جن باتوں کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور اس کی قلب ماہیت ہوتی ہے وہی دراصل اس کا ادبی اور سماجی سروکار ہے۔ ''ویر زارا'' ایسی فلم میں حسن و عشق کا بے حد انوکھا تصور ہے۔ اس میں جسمانی عشق کے بہ جائے روحانیت کا عظیم فلسفہ نظر آتا ہے۔ دراصل تقسیم نے افسانہ اور ناول کی طرح ہماری فلموں کو بھی کئی موضوعات دیے، لیکن اکثر فلمیں جس نقطہ نظر کی ترجمانی میں بنائی گئی ہیں، وہ انسانی جذبات کی صحیح عکاس نہیں ہیں۔ ان میں ایک نوع کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی بے جا مداخلت ہے اور بعض فلموں میں 'ہیرو ورشپ' کے رومانی تصور کو نمایاں کرنے کی غیر فطری کوشش کی گئی ہے۔ ایک موقع پر ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے فلموں سے یہ مطالبہ کیا تھا:

''ہمارے فلم سازوں کو ہندوستانی قصوں کہانیوں پر مبنی فلمیں بنانی چاہئیں۔ ایسی فلمیں جو ہمارے ملک کی صحیح نمائندگی کریں اور صحیح تصویر پیش کرسکیں۔''

عرض یہ کرنا ہے کہ ہمارے فلم سازوں نے ادبی احساس سے الگ ایک ایسی دنیا بسائی ہے، جس میں انسانی عظمت کے سروکار معدوم ہیں۔ مشترکہ تہذیب کو مستحکم کرنے کے بہ جائے نئی نسل کے ذہن کو پراگندہ کیا جارہا ہے۔ ایسے ماحول میں 'ویر زارا' کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے، چوں کہ اس میں دلوں کی سرحدوں کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انسانی عظمت کے فلسفہ میں سرحدوں کی نفی کرتے ہوئے ایسے گیت بنے گئے جو ہر طرح کے سیاسی اور نام نہاد مذہبی نظریات سے بلند ہیں۔ اس فلم میں جاوید اختر کی اس نظم نے اس نقطہ نظر کی عمدہ ترجمانی کی ہے:

میں قیدی نمبر ۷۸۶ جیل کی سلاخوں سے باہر دیکھتا ہوں/ دن مہینے سالوں کو یگ میں بدلتے دیکھتا ہوں/ اس مٹی سے میرے باؤجی کی کھیتوں کی خوشبو آتی ہے/۔۔۔/۔۔۔/ یہ بارش میرے ساون کے جھولوں کو سنگ سنگ لاتی ہے۔۔۔/ وہ کہتے ہیں یہ تیرا دیش نہیں/ پھر کیوں میرے دیش جیسا لگتا ہے/ وہ کہتا ہے میں اس جیسا نہیں/ پھر کیوں مجھ جیسا وہ لگتا ہے/۔۔۔ وہ کہتے ہیں میرا دیش اس کا نہیں/ پھر کیوں میرے گھر وہ رہتی ہے۔۔۔ الخ

۔اس فلم کے ادبی تناظرات میں حسن و عشق کا روحانی نظریہ انسانی سماج کی سالمیت کے ہر ہر پہلو کا روشن زاویہ ہے۔ اسی طرح ''چک دے انڈیا'' میں حب الوطنی کے بہ ہر پہلو اقلیتی طبقہ کے انسان کی اس صورت کو پیش کیا گیا ہے، جس کے چہرہ پر 'غدار' لکھ دیا گیا ہے۔ یہ فلم ان افکار و خیالات کی کتھارسس ہے۔ جس میں ایک طبقہ دوسرے اقلیتی طبقہ کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شاہ رخ خان نے اپنے اس نقطہ نظر کو اور پھیلاتے ہوئے ''مائی نیم از خان

''ایسی فلم بھی بنائی ہے، ان کے مطابق میں اپنی اس فلم کے ذریعہ مسلمانوں کی جو اسٹیریو ٹائپ امیج بنا دی گئی ہے اس کو توڑنا چاہتا ہوں...... مٹھی بھر لوگوں کی وجہ سے ایک بہترین قوم کو ہدف ملامت بنائے جانے کی گہری سازش چل رہی ہے۔(10) اس فلم میں حجاب کے اسلامی تشخص اور بعض ایسے انسان جو انسانی عظمت کے فلسفہ میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کی روشنی میں شرم وحیا کے فطری اظہار کو بھی بحال کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ ان حوالوں کا مقصود عامر خان یا شاہ رخ خان کو Icon بنا کر پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ہماری فلموں میں Literary sense کا گزر کس طور پر (؟) ہوا ہے، اس کے بعض رخوں کو محض نشان زد کرنا ہے۔ ناظرین بعض ایسے ہی رخوں کو ہماری ان فلموں، مثلاً رین کوٹ، لیجنڈ آف بھگت سنگھ، وواہ، ٹریفک سگنل، بیچ تھری ہیلہ بول، سکندر، ہم ساتھ ساتھ ہیں، تارے زمیں پر، ہم آپ کے ہیں کون، راجا ہندوستانی، لائف ان اے میٹرو، یہ میرا انڈیا، اپ ہرن، گنگا جل، اجازت، حاصل اور منور ماوغیرہ میں بہ خوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ میں نے قدیم اسلوب کو خاطر نشان نہیں رکھا ہے، چوں کہ اپنے ناظرین سے بھی یہ فلمیں یک گونہ التفات چاہتی ہیں۔ لیکن میں چند فلموں کے تعارف کو ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس سے فلموں کے ارتقائی اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ہماری فلموں کے ارتقائی اسلوب اور ڈھنگ کی تفہیم اس رو سے بھی ہو سکتی ہے کہ ہم بعض نمائندہ حوالوں کو یہاں ایک تسلسل میں پیش کردیں، چنانچہ ہم اس باب میں سب سے پہلے عورت کی تصویر ملاحظہ کرتے ہیں۔ امر جیوتی، دنیا نہ مانے، جہیز، صبح کا تارا، براج بہو، پری نیتا، یہودی کی لڑکی، مدر انڈیا، مرچ مسالہ، سوامی، ان پڑھ، صاحب بیوی اور غلام، نکاح، پرکھ، پاکیزہ، منڈی، موسم، طوائف، اور پریم روگ محض چند مثالیں ہیں، جس میں عورت کی کئی تصویریں ہیں۔ کہیں جہد مسلسل ہے تو کہیں پدری سماج کی مطلق العنانیت ہے۔ کبھی یہ عورت باغی ہے تو کبھی ایثار و وفا کی دیوی، غرض ''عورت'' اور انسان کے بیچ کی دوری کو کم کرنے کی ایک اچھی کوشش ان فلموں میں نظر آتی ہے۔ شیام بینگل کی فلم ''منڈی'' (۱۹۸۳ء، غلام عباس کے افسانہ 'آنندی' پر مبنی) میں اس طوائف کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے، جس کو یہ مہذب سوسائٹی حاشیے میں بھی جگہ دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ ناری نکیتن اور بعض دوسرے سیاسی اور سماجی اداروں کی نفی اور ان کی مصنوعی سوچ کی اصلیت میں یہ فلم بہت کچھ کہتی ہے۔ یہ پریم چند کی فکر سے توانائی حاصل کرتی ہے تو منٹو کے فن کے باطن کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ قلی قطب شاہ اور بہادر شاہ ظفر کی تخلیقی سائیکی نے اس کے بیانیہ کو یادگار بنا دیا ہے۔ محبوب کی شہرۂ آفاق فلم ''مدر انڈیا'' میں عورت کا باطن اور دیہی زندگی کا گھاؤ اس طرح حل ہو گئے ہیں کہ کوئی بھی ناظر اس کو بھلا نہیں سکتا۔ اس فلم کا بے حد مشہور نغمہ ہندوستانی عورت کے باطن کو اس طرح پیش کرتا ہے۔

دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا/جیون ہے اگر زہر تو پینا ہی پڑے گا/گر گر کے مصیبت میں سنبھلتے ہی رہیں گے/جل جائے مگر آگ پہ چلتے ہی رہیں گے/غم جس نے دیے ہیں وہی غم دور کرے گا/عورت ہے وہ عورت جسے دنیا کی شرم ہے/سنسار میں بس لاج ہی ناری کا دھرم ہے/زندہ ہے جو عزت سے وہ عزت سے مرے گا/مالک ہیں ترے ساتھ نہ ڈر غم سے تو اے دل/محنت کرے انسان تو کیا کام ہے مشکل...... اسی طرح

راج کپور کی لاثانی فلم ''پریم روگ'' میں بیوہ عورت کی سائیکی کو معنی پہنانے کا انداز ناظرین کی آنکھوں میں آج بھی زندہ ہے۔اس کے علاوہ کئی ایسی فلمیں ہیں جو عورت کی روایتی تصویروں کو توڑتی ہیں، اور ان کے جسم و جان میں حرارت پیدا کرتی ہیں۔دراصل ہندوستانی فلموں کو ایک خاص تسلسل میں ملاحظہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ پریم چند اسکول کے موضوعاتی تنوع اور اصلاحی نقطہ نظر سے اس آرٹ کو فیض حاصل ہوا ہے۔اس کے برعکس آج کے سنیما میں نسائی رنگ موضوعات کو بہت زیادہ اعتبار حاصل نہیں ہے۔ماڈرن معاشرہ کی عورتوں کے مسائل پر ایک اچھی فلم ''اُپس'' آئی تھی، ''پاپ'' ایسی فلم میں مذہبی عقیدہ کے نام پر فطری خواہشات کو کچلنے کی کوشش میں 'گھاؤ کی منطق' نظر آتی ہے۔عورت کے باطن اور اس کے دکھ کو پیش کرنے میں سب سے اہم فلم ''لجا'' ہے۔اس میں موضوعاتی تنوع کے بہ ہر پہلو عورت اور اس کا دکھ ہے۔ضعیف العقیدہ سماج اور حاشیائی کرداروں کی کہانی بھی اس کو ایک سیاق عطا کرتی ہے۔اس میں عورت جب روایتی خول سے باہر نکلتی ہے تو اس کو بے حیا قرار دے کر ان کی زندگی کو عذاب کر دیا جاتا ہے۔یہی عورت جب اپنے وجود کو ''ننگا'' کر کے لجا اور شرم کی فطری تعریف وضع کرتی ہے، تو یہ معاشرہ بیہودگی کی حد تک ننگا نظر آتا ہے۔لیکن ادبی احساس سے معمور ایسی فلمیں بہت کم ہیں، اکثر فلمیں ایسی ہیں جس میں اداکارائیں خود کو بیوٹی کوئن ثابت کرنے کے لیے اپنے بدن کا بھدا پن دکھاتی ہیں۔ان کے ہاں زندگی کا کوئی مخصوص نقطہ نظر نہیں ہے۔مابعد صورتحال میں بھی عورت کا کوئی توانا کردار نظر نہیں آتا، البتہ بعض فلموں میں مرد حاوی سماج کی نفی کی گئی ہے۔ان فلموں میں کوئی تعمیری سوچ بار نہیں پا سکی ہے، چوں کہ ہندی سیاق کے بہ جائے مغرب کی ظاہرداری اس میں شریک ہے۔اگر عورت کے پاس خوبصورت جسم ہے تو اس کے اندر کا گھاؤ بھی نظر آنا چاہیے۔ان اعتراضات کے باوجود امید افزا بات یہ ہے کہ ہندوستانی فلموں میں حقیقی انسان کی واپسی ہوئی ہے۔متنازعہ فلم "Water" کا بیانیہ ناظرین کو یاد ہوگا۔تانیثی آگہی کے باب میں یہ بے حد خوبصورت فکری مظاہرہ ہے، ہندو سماج میں بیوہ عورت کا دکھ اور گاندھی کا نقطہ نظر اس طرح حل ہوئے ہیں کہ مذہب کی فطری تعریف وضع ہو گئی ہے۔اس میں مغربی تہذیب کا انسانی سروکار بھی ایک اہم تناظر ہے۔ نئے اسلوب کی فلموں میں "Bawandar" کا بیانیہ بھی تانیثی آگہی کو اس کے ٹھیٹ پس منظر میں نہ صرف پیش کرتا ہے، بلکہ عورت کی زخمی روح کی مزاحمت میں صدیوں کے پدرانہ جبر کی نفی کرتے ہوئے مسلسل احتجاج کا استعارہ بھی بنتا ہے۔اس نوع کی فلمیں ہندوستانی سنیما کے اسلوب کو قائم کرتی ہیں، اور یہ احساس دلاتی ہیں کہ زندگی مسلسل جنگ کا نام ہے۔علاقائی اسلوب کی فلموں میں سطحیت اور بھدا پن ضرور ہے، لیکن اس میں زندگی کا حقیقی رنگ بھی ہے۔ان فلموں کی سطحیت میں مین اسٹریم سنیما کا بہت زیادہ دخل ہے، مگر گھر اور خاندان کا دیہی سیاق اس کے روشن مستقبل کا اشاریہ ہے۔علاقائی اسلوب کے موضوعات سے مین اسٹریم سنیما کو درس لینا چاہیے، دراصل "Western canon of aesthetics" سے ایک نوع کا بُعد نہایت ضروری ہے۔اگر اس جمال سے کچھ لینا ہی ہے تو اس کے ادبی احساس کو اپنے طور پر بروئے کار لایا جائے۔سائنسی فکشن میں شاید ان کی برابری ممکن نہیں ہے، لیکن انسانی عظمت کے کئی ایسے سروکار ہیں جن میں ہمارے ہاں ان سے زیادہ امکانات ہیں۔

قدیم اسلوب کی فلموں کا ایک توانا پہلو یہ بھی ہے کہ تفریح کے متوازی سماجی، تاریخی اور عمرانی حوالوں کو

اکثر خاطر نشان رکھا گیا ہے۔ دو بیگھہ زمین، نیا دور، بوٹ پالس، پیاسا، آنند، ندیا کے پار، دوستی، کھلونا، میرا نام جوکر، مغل اعظم، نکاح، رام اور شیام، مدھومتی، آدمی، راجا اور رنک اور کئی ایسی فلمیں ہندوستانی سنیما کو اعتبار بخشتی ہیں۔ دلیپ کمار کی نیا دور کو دوام حاصل ہے، چوں کہ آدمی اور انسان کی جنگ میں ٹھیٹ ہندی مسائل اور حقیقی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس اسلوب کی بعض فلموں میں ترقی پسند شعریات کے اکثر زمینی حقائق ناظرین کو متوجہ کرتے ہیں۔ 'نفسیاتی اور تصوراتی تفریح' کو اول تو قبول کرنا ہی محال ہے، حقیقی زندگی میں اس کے مضر اثرات کا نتیجہ ہم اپنے آس پاس دیکھ سکتے ہیں۔ میڈیا عوامی شعور کو کسی بھی طور پر استعمال کرے، اینگری ینگ مین اور ہیرو ورشپ کے خیالی تصور کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ آج بھی باغبان اور بلیک، ایسی فلمیں ہی اپنے ادبی اور سماجی سروکار کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔ قدیم اور جدید اسلوب کی منطق کو ندا فاضلی کے ایک خیال کی روشنی میں پیش کیا جا سکتا ہے:

> "دلیپ کمار، راج کپور، شمی کپور، دیو آنند سب اس عہد کی پیداوار تھے جب فن اور تجارت میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ یہی وصف اس دور کی موسیقی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔...... بات دراصل یہ ہے کہ شخصیات کے ظہور کے لیے جو معاشرہ اور معاشرتی اقدار چاہیے ہوتی ہیں، وہ ہر دور کے نصیب میں نہیں ہوتیں۔"

ان باتوں سے جزوی طور پر اتفاق کیا جا سکتا ہے، چوں کہ فن اور تجارت میں آج بھی فرق ہے۔ فن کی حرمت وہاں مجروح ہوئی ہے جہاں جنسی بیہودگی نے ناظرین سے فکر و شعور کا دامن چھین لیا ہے۔ ایسی فلمیں بھرمار ہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہماری فلموں سے فن غائب ہو گیا ہے (؟) فن کا دائرہ اور وسیع ہوا ہے۔ قدیم اسلوب کی فلموں کا ایک سیاق ضرور ہے، لیکن اس کی معنویت روز افزوں اس لیے ہے کہ جدید اسلوب کی فلمیں اسی تسلسل میں زیادہ ہمہ گیر ہیں۔ رہی بات شخصیات کے ظہور کی تو یقین مانیے کہ قدیم اسلوب کے اکثر اداکاروں کے ہاں کرداروں کی حقیقی نفسیات کا فقدان نظر آتا ہے، اس میں Style of narration بھی شامل ہے۔ دلیپ کمار کے عہد میں چند اداکار ہی ایسے ہیں جن کے ہاں Psychology of character کی توانا صورت ہے۔ نئی نسل نے بڑی حد تک اس کمی کو پورا کیا ہے۔ قدیم اسلوب کی موسیقی میں انسان اور زندگی کا حوالہ زیادہ گہرا ہے، عصری سنیما میں اس رو سے زوال یقیناً ہوا ہے، اکثر فلمیں ایسی ہیں جہاں موسیقی و نغمہ بیانیہ کی تعمیر سے زیادہ ایک قسم کی بے تعلقی کو راہ دیتے ہیں۔ لیکن ہماری اچھی فلمیں اس باب میں بھی ہمیں مایوس نہیں کرتی ہیں۔ اس تعلق سے یہاں ایک ایسی فلم کا ذکر مقصود ہے، جس کے لسانی ملاحظات کو بالعموم محسوس نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ٹھیٹ ہندوستانی فلم "اوم کارا" ہے، جس میں راجستھان کے پس منظر اور پیش منظر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لسانی ملاحظات اور Psychology of character کے اکثر متعلقات میں یہاں کا ثقافتی کردار اپنے حقیقی رنگ میں زندہ ہو گیا ہے۔ گالیوں کے فطری اظہار میں کرداروں کا وجودی نشان موثر اسلوب میں نظر آتا ہے۔ گلزار کے نغمہ۔ زباں پہ لاگا لاگا رے نمک عشق کا اور بیڑی جلئی لے جگر سے پیا...... اپنے ادبی اور ثقافتی سروکار کی وجہ سے بہت اہم نظر آتے ہیں۔ راجستھانی لب و لہجہ میں اس کا بیانیہ ہر اعتبار سے فن کے قالب کو روشن کرتا ہے۔ 'مہندی

میں یہ حال ہے تو شادی میں کی ظلم ڈھائے گی میری بہن/ جانور پال رکھا ہے تو نے اپنے اندر......' ان دو مثالوں سے یہ واضح کرنا ہے کہ اس کا تہذیبی متن کتنا وسیع ہے۔ اس کو کاج، دیہہ، ٹانگ، ڈر، ٹول، کتے من ایسی لفظیات کے تناظر میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گلزار نے اپنے نغمہ (جو بہ ظاہر بھدا معلوم ہوتا ہے) میں 'ہو جا پڑوسی کے چولہے سے آگ لئی لئے اور شہد چٹادے ایسے تہذیبی متون کو شامل کر کے ایک نوع کے ادبی احساس کی تشکیل میں صد گونہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اس ادبی احساس میں صدیوں پرانی تہذیب کا نقشہ ابھر گیا ہے۔

جدید اسلوب کی بعض نمائندہ فلموں میں اس نوع کی فلموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، چوں کہ ان میں عصری سائیکی کا حد درجہ خیال رکھا گیا ہے۔ اس تعلق سے نندتا داس کی فلم "فراق" فن و فکر کی تجسیم کی چیدہ مثال ہے، یہ فلم گجرات Genocide اور اس کے بعد کی سائیکی کو مؤثر اسلوب میں پیش کرتی ہے۔ اقلیتی طبقہ کے الگ الگ نمائندوں پر اس کے اثرات کس طور پر مرتب ہوئے یہ فلم اس کا خالص ادبی اظہار ہے۔ ایک معصوم بچہ کے کردار کو اس میں علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس فلم کے مندرجات کو سمجھے بغیر اس پر یہ اعتراض کیا کہ ایک خاص زاویہ سے (مذہبی) اس کو بنایا گیا ہے، لیکن اس میں بہت واضح طور پر انسان دوستی کا ثبوت (ایک خاص طبقہ کی عورت کی ممتا میں ایک غیر مذہبی بچہ کی تصویر ا، رولی دکنی کے مزار کے انہدام کی منطق میں اس کو بالخصوص محسوس کیا جا سکتا ہے۔) دیا گیا ہے۔ اس فلم میں کہیں بھی کسی مذہب کو زیر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ مذہبی جنون کے سیاسی نشہ کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس فلم کے Metaphor اور ادبی شعریات کی داد دیتے ہوئے کہنا چاہیے کہ آرٹ کے صحیح معنی کی یہ تعبیر ہے۔ اس کے مرکزی رول میں جادو جگانے والے شہرہ آفاق اداکار نصیر الدین شاہ نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ 'فراق فلم کو صرف ایک ہی زاویے سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ایک انسان دوست فلم ہے۔'

"بلیک اینڈ وہائٹ" ایسی فلم ملک و سماج میں ناسور بن رہے 'دہشت گردی' کے جراثیم کی بیخ کنی کی کوشش ہے۔ اس میں حبیب تنویر جنہوں نے ایک شاعر اور ادیب کا رول کیا ہے، جب اپنے گھر کی چہار دیواری میں اس جراثیم کو دیکھتے ہیں تو صدمہ سے ان کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ ان کی موت اس فلم میں ایک علامت بن گئی ہے، جو ناظرین سے مسلسل مکالمہ کرتی ہے۔ انل کپور ایسے اداکار نے اُردو کے پروفیسر کے رول میں اس جراثیم کے نمائندہ ذہن کی جس طور سے تربیت کی ہے اور قرآنی تعلیمات کو عام کیا ہے، وہ دراصل انسانی سروکار کا عظیم درشن ہے۔ یہ فلم اپنے مؤثر اسلوب میں کئی رخوں کو پیش کرتی ہے، مثلاً اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، قرآنی تعلیمات میں کہیں بھی انسانی عظمت کی نفی نہیں کی گئی ہے، شعر و ادب کا نظریہ ہمیشہ آفاقی ہوتا ہے اور دہشت گردی صرف اور صرف سیاسی جنون کا نتیجہ ہے، جس کی فکری جڑیں ہماری سوسائٹی میں بہت اندر تک پیوست ہیں۔ دہشت گردی کے بعض اور پہلوؤں کو ایک مخصوص اور قومی نقطۂ نگاہ سے "A Wednesday" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، اس میں ایک عام آدمی کے غم و غصہ اور ردِ عمل کو پیش کیا گیا ہے۔

اُو۔ ہنری کے ایک افسانہ سے انسپائر ہو کر بنائی گئی فلم "Rain coat" میں بیانیہ کی داخلیت کا تمام تر حسن سمٹ آیا ہے۔ اس کے ادبی جمال میں زماں و مکاں کے تصور سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، دراصل انسان اور اس کی زندگی کی داخلیت اپنی فطرت میں ایسی سچائی ہے جس کا آفاقی نقطہ بے حد روشن ہے۔ کسی بھی فن پارہ میں یہ

ورلڈ ویو کی بہت عمدہ مثال ہے۔

ہندوستانی فلم کے ان تناظرات سے واضح ہے کہ ادبی احساس سے معمور فلمیں بنائی جارہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تعداد خاطر خواہ نہیں ہے، تعداد اور جنس کوئی بہت اہم مسئلہ ہے بھی نہیں۔ غور وفکر کی بات یہ ہے کہ ہیرو ورشپ کے رومانی تصور، افلاطونی عشق اور ایکشن اور ان سب سے بڑھ کر جنسی بیہودگی نے انسان اور سماج کے درمیان ایک دوری پیدا کر دی ہے۔ فنون لطیفہ کی طرح فلم بھی سماج سے ہی مواد حاصل کرتا ہے، لیکن اس کی تعمیر و تخریب میں بھی یہ پیش پیش ہے۔ سہراب مودی، محبوب خان، بلراج ساہنی ،بی۔این سرکار، کے۔آصف، کے۔سی بوکاڈیا، کمال امروہوی، ستیہ جیت رے، سید مظفر علی اور مہیش بھٹ وغیرہ کی اسپرٹ کو اپنے فن میں تسلسل عطا کرنے والے کئی ہدایت کار عصری سنیما کو قوت بخش رہے ہیں۔ لیکن آج کے گاؤں کی تصویر سے اکثر ہدایت کاروں کا کوئی سروکار نہیں ہے (؟) فن کے حقیقی احساس کی تحفظی کے لیے ہدایت کاروں کو اس باب میں پیش قدمی کرنی ہوگی۔ دیہی ہندوستان کا بلندی سے نظارہ کرنے کے بہ جائے ان کرداروں کی سائیکی میں اترنا نہایت ضروری ہے، فطرت سے مکالمہ کرنا ہے تو فنون لطیفہ کے لیے اس مٹی میں خاطر خواہ مواد ہے۔

ہندوستانی سنیما کی مین اسٹریم اور بعض علاقائی اسلوب کی فلموں کو ادبی احساس اور تر وتازگی عطا کرنے میں اُردو کے لسانی تناظرات کی اہمیت مسلم ہے۔ دراصل ہندوستانی فلم کے رگ وپے میں اردو زبان وادب کا حسن اور اس کی حرارت روز اول سے موجود ہے۔ ''عالم آرا'' (جوزف ڈیوڈ کے ڈرامہ 'عالم آرا' پر مبنی پہلی بولتی فلم، ۱۹۳۱ء) سے لے کر اب تک جتنی بھی فلمیں بنائی گئی ہیں، ان میں اردو کی لسانی جمالیات کے تناظرات کو (بیانیہ، مکالمہ، نغمہ اور ان سب سے بڑھ کر تلفظ کی ادائیگی) ناظرین ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی فلموں کو 'ہندی' (؟) سنیما کیوں کہا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے لسانی تنوع اور فطرت میں یہ خوبی موجود ہی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ فلم کی شعریات حد درجہ عوامی ہوتی ہے۔ پریم پال اشک بعض پہلوؤں کو روشن کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس امر کی جانب توجہ دلانی بھی بہت ضروری ہے کہ برٹش حکومت کے دوران بھی اگر چہ سنسر بورڈ کا اردو کے تئیں رویہ منافقانہ ہی رہا اور حکام اردو سرٹیفکٹ جاری کرنے سے کتراتے رہے اور اس کے بہ جائے ہندوستانی زبان کے نام پر فلم سرٹیفکٹ جاری کرتے رہتے تھے جبکہ ہندوستانی نام کی کوئی چڑیا کم از کم ہندوستان میں تو اڑتی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ برٹش حکومت کی عوام کو بے وقوف بنانے کی ایک چال تھی۔ اس زمانے میں عوام کی زبان واضح طور پر اردو تھی یا ہندی۔ مشترک زبان یعنی ہندوستانی تو صرف ایک بولی تھی زبان نہیں اور فلموں کی زبان اردو تھی۔''

اشک نے اپنی Thesis میں بولی اور زبان کے فرق کو ملحوظ رکھ کر جو مقدمہ قائم کیا ہے، وہ ایک تلخ سچائی ہے۔ مگر فلموں کے اسلوب اور مزاج کو دیکھ کر یہ عرض کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ ہماری فلموں کو ہندوستانی (جس میں اردو کا حسن اکثر شامل ہے) ہی کہنا چاہیے، چوں کہ ٹھیٹ ہندوستانی ماحول اور جدید لسانی صورت حال (انگریزی علاقائی بولی اور اردو) کے منظر نامہ میں ہندی نہ عوام کی زبان ہے اور نا ہی سنیما کی۔ دراصل برٹش حکومت کا منافقانہ رویہ آج کے جمہوری نظام میں تعصب کا رنگ اختیار کر چکا ہے، اس لیے ہندوستانی اسلوب کی فلمیں ہندی کے نام پر پیش کی جارہی ہیں۔ ندا فاضلی کا یہ خیال بہت اہم ہے:

> "فلم انڈسٹری میں نہ کتابی اُردو چلتی ہے، نہ کتابی ہندی۔ فلموں نے عام آدمی کی زبان کو فروغ دیا ہے۔ یہ زبان امیر خسرو اور کبیر سے چلتی ہوئی آرزو کی سریلی بانسری سے ملتی ہوئی ابن انشا اور ناصر کاظمی تک آتی ہے۔ ان شعرا کے یہاں جو زبان ہے وہی زبان فلموں کی زبان ہے۔"

ندا فاضلی نے دوسرے لفظوں میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو کی فطری ساخت نے عوام اور سنیما کے بیچ ایک پل کا کام کیا ہے۔ دراصل ہندوستان کا فطری مزاج اس کا اُردو چہرہ ہی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر قمر علی، مظفر پور (بہار)

ہندوستانی فیچر فلم کی حقیقت

لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی سگی بہنیں ہیں۔ آسان اردو کو اگر دیوناگری رسم الخط میں لکھ دیا جائے تو وہ ہندی بن جاتی ہے اور اگر اچھی ہندی زبان جو عام فہم ہو، کو عربی رسم الخط میں تحریر کیا جائے تو وہ اردو بن جائے گی۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا ماخذ کھڑی بولی ہے۔ دونوں زبانوں کا رسم الخط الگ ہے لیکن بول چال کی زبان آج بھی وہی ہے جو آج ہندوستانی سے قریب ہے اور جس کو قومی زبان بنانے کی آرزو لئے مہاتما گاندھی اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ بعض اوقات تو اردو اور ہندی زبانوں کی تحریری شکل میں ان کے مابین فرق و امتیاز پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ ان میں جو فرق ہے لباس کا ہے، روح یا مزاج کا نہیں۔ لباس کے معمولی اور ظاہری فرق کی وجہ سے ان کے مابین کا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

تحریری شکل میں تو کوئی بھی انسان اس کے رسم الخط کے اعتبار سے اسے ہندی یا اردو کا نام بڑی آسانی سے دے سکتا ہے۔ مگر بول چال کی زبان میں اس میں فرق کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر اسے لسانی اعتبار سے کوئی نام دینا ہو تو (ہندوستانی چھوڑ کر) بلاشبہ اسے اردو ہی کہنا ہوگا۔ جہاں تک ہندوستانی فلموں کی بات ہے تو یقیناً یہ فلمیں اردو زبان میں ہی بنی ہیں۔ مگر زبردستی اسے ہندی فیچر فلم کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ان فلموں سے عربی و فارسی کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو پھر مکالمہ کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر فلم ''چپکے چپکے'' میں دھرمیندر نے جب خالص ہندی بولنے کی کوشش کی تو اسے طربیہ (Comedy) نام دیا گیا۔ اس جگہ پر جب فلم ''مغل اعظم'' بنتی ہے تو اپنے شاندار مکالموں کی وجہ سے کامیابی کی بلندی حاصل کرتی ہے کیونکہ خالص اردو زبان کا امتحان ہوا تھا۔ اس طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی ہندی فیچر فلم دراصل ہندی فلم نہیں بلکہ اردو فلمیں ہیں۔ شروع سے آخر تک صرف اردو زبان کا ہی استعمال اس میں ہوتا آیا ہے۔ اردو زبان کے استعمال کے بغیر فلموں کے مکالموں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ہم فلمی نغموں کی بات کریں تو پائیں گے کہ کچھ کو چھوڑ کر سارے ہندی گانے اصل میں اردو گانے ہیں۔ مسلم نغمہ نگار کی بات چھوڑ بھی دیا جائے تو بھی غیر مسلم لوگوں نے بھی اردو زبان سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلموں نے پہلے اردو سیکھی اور بعد میں نغمہ نگار بنے۔ آنند بخشی، ایس ایچ بہاری، ساون کمار، سنتوش آنند، ورما ملک، نریندر شرما، اندیور، انجان، گلزار، شیلندر، راجندر کرشن، بھرت ویاس، پریم دھون، رمیش پنت، رویندر جین، پردیپ اور یوگیش وغیرہ کو فلموں میں گانے لکھنے کے لئے اردو زبان پر عبور حاصل کرنا پڑا اور تب جا کر یہ ایک کامیاب نغمہ نگار بن پائے۔

اب ہم نغمہ پرداز یعنی مغنی کی بات کریں گے۔ لتا منگیشکر ہوں یا آشا بھوسلے۔ مکیش ہوں یا کشور کمار، منا ڈے ہوں یا مہندر کپور، کمار شانو ہوں یا ادت نارائن، انورادھا پوڈوال ہو یا کویتا کرشن مورتی، ہر نغمہ پرداز کو اپنا تلفظ درست کرنے کے لئے اردو زبان کی مدد لینی پڑی ہے۔ کیونکہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ بغیر اردو سیکھے انسان چاند تک بھلے ہی پہنچ جائے مگر زبان سے صحیح تلفظ کے ساتھ الفاظ نہیں نکال سکتا۔

کیفی اعظمی اور جاوید اختر جیسے ادیب ہوں یا غیر مسلم غیر ادیب فنکار، اردو شاعری اور اس کے تقطیع کا سہارا ہر کسی کو لینا پڑا ہے۔ زیادہ تر اچھے گانے سالم بحر میں ہیں۔ مثال کے طور پر، بحر متقارب ملاحظہ فرمائیں۔

محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے　　بڑی چوٹ کھائے جوانی پہ روئے
نہ سوچا نہ سمجھا نہ دیکھا نہ بھالا　　تری آرزو نے ہمیں مار ڈالا

زیر نظر اشعار میں بحر متقارب مثمن سالم کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جو گانے ہیں وہ تقطیع کے حساب سے منظم ہیں کیونکہ بغیر تقطیع والے شعر کو ساز پر سٹ نہیں کیا جاسکتا۔

اردو زبان کسی علاقے یا کسی مذہبی فرقے میں کبھی قید نہیں رہی۔ پھر بھی آج کل بہت سے لوگ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں۔ اگر اسے صحیح مان کر فلمی اداکاروں کا تجزیہ کریں تو پھر معلوم ہوگا کہ شروع سے ہی بالی ووڈ پر وہی لوگ چھائے ہوئے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ فلمی نام ہندی میں رکھ لینے کے باعث کچھ لوگ انہیں غیر مسلم سمجھنے کی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل میں کچھ اداکاروں کے فلمی نام و اصلی نام دیئے جارہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

فلمی نام	اصلی نام	فلمی نام	اصلی نام
دلیپ کمار	محمد یوسف خاں	کم کم	زیب النسا
جگدیپ	اشتیاق احمد	می	نواب بیگم
جانی واکر	بدرالدین قاضی	سجاتا	ساجدہ مرزا
سریش	احمد	ساریکا	فرحت بیگم
سنجے خان	عباس خان	شیاما	خورشید اختر
رتن کمار	نظیر اجمیری	روپ مالا	ممتاز بیگم
راجوتش	اکبر صدیقی	آشا سچدیو	نفیسہ بیگم
رومی	محمد سلیم	سریکھا	انیسہ خاتون
مینا کماری	ماہ جبیں	رنجیت	حامد علی خاں
شرمیلا ٹیگور	عائشہ سلطان	تبو	تبسم
مدھو بالا	ممتاز بیگم		

اس طرح سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں بننے والی ہندی فیچر فلمیں درحقیقت ہندی فلمیں ہیں ہی نہیں، یہ تو خالص اردو فلمیں ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اردو کے پرانے ناموں میں ایک نام ہندی بھی ہے اس لحاظ سے اسے ہندی فلم کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مگر دور حاضر میں اردو اور ہندی کو جب دو الگ الگ مقام حاصل ہے تو ہمیں ہندی فلم کہنے سے قبل ہندی میں لکھی گئی کتابوں کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ کیا فلموں کی زبان تحریری ہندی سے میل کھاتی ہے۔ جواب ملے گا کہ نہیں۔ بالکل نہیں، دور دور تک ان کا آپس میں کوئی رشتہ ہے ہی نہیں۔ تو پھر اچھا ہوگا کہ انہیں اردو فیچر فلم ہی کہا جائے۔

☆☆☆

پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ، فیض اللہ خاں، دربھنگہ

پروفیسر وہاب قیصر

(''غالب اور سائنس'' کے حوالے سے)

کوئی فنکار چلتا ہے روایت سے الگ ہٹ کے
تو اس پر عالم امکاں کے دروازے بھی ہیں کھلتے

تدبر اور تفکر کا بھی کام آتا سرمایہ
کلام پاک میں بھی حکم ہے کام اِن سے لینے کا

اسی سرمائے سے بابِ ظفر ہیں سائنس کے کھلتے
شعورِ کائناتی جس کو غالبؔ ہیں بنالیتے

وہی ایک علم ہے جو ''علم اشیاء'' بھی ہے کہلاتا
سبب روزِ ازل سے ہے جو آدم کی فضیلت کا

یہی وہاب قیصر کی بھی منزل ساز کاوش ہے
نئے انداز سے غالبؔ پہ یہ آغازِ دانش ہے

نئے اک زاویے سے آپ نے غالبؔ کو دیکھا ہے
اور اس کی فکر کا سائنس سے رشتہ بھی جوڑا ہے

کمالِ فکر و فن کہیے اسے وہاب قیصر کا
شگفتہ اک چمن کہیے اسے وہاب قیصر کا

ادب میں اور پھر سائنس میں ہے امتزاج ایسا
ہے جس سے جلوۂ نو آشکارا فکرِ غالبؔ کا

فضائے ماورا تک ہیں اگر افکار کے رشتے
تو کچھ ہیں حکمت و منطق کا فنی پیرہن پہنے

کبھی ''بازیچۂ اطفال'' آتی ہے نظر دنیا
کبھی ''باور اُسے آیا ہوا ہوجانا پانی کا''

''نظر میں جادۂ راہِ فنا'' کا عکس ہے ایسا
جو ہے ''شیرازہ بھی عالم کے اجزائے پریشاں کا''

حقیقت میں تو خود اُس کا بھی ''قطرہ مثلِ دریا'' ہے
''تنگ ظرفی نہیں منصور'' کی لیکن گوارا ہے

''لطافت بے کثافت پیدا کر سکتی نہیں جلوہ''
''چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا''

''لرزتا اُس کا دل ہے زحمتِ مہرِ درخشاں پر''
کہ ہے جوں ''قطرۂ شبنم ہی وہ خارِ بیاباں پر''

نئی اک آگہی کہیے اسے وہاب قیصر کی
جھلک سائنس کی افکارِ غالبؔ میں نظر آئی

مصنف کا جنونِ شوق ہے مشکل پسند ایسا
رہِ پامال پہ چلنا اُسے اچھا نہیں لگتا

ادب کا رشتہ پھر سائنس سے قائم وہ کرتے ہیں
اسی سے کچھ سرورِ دیدہ و دل ڈھونڈ لیتے ہیں

نئی صورت دکھائی آپ نے تفہیم غالب کی
برائے نقد غالبؔ راہِ نو اک ہم کو دکھلادی

یہ اعجازِ وہاب قیصر ہی کا ہے حصہ
اُفق لائے ہیں غالب کے شعورِ کائناتی کا

تصانیفِ گراں ہیں آپ کی اس کے علاوہ بھی
کہ ہے جن میں بصیرت اور حکمت کی فراوانی

ہوئے ہیں کامراں وہ اس رہِ دشوار پر چل کے
ملی ہے داد بھی جس کی انہیں دیدہ وروں ہی سے

☆☆☆

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، کوہسار، بھیکن پور، بھاگلپور، 812001 (بہار)

غالب کا سائنسی شعور اور وہاب قیصر کی سائنٹفک تنقید

ڈاکٹر وہاب قیصر باریک بیں مشاہدہ رکھتے ہیں۔ بامعنی سوچ کے مالک ہیں۔ اور بصیرت افروز قلم کی دولت سے مالا مال ہیں۔ یہ ان کی دوررس نگاہی ہے کہ انہوں نے غالب جیسے شاعر کی کائنات کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھا ہے، جانچا ہے اور آنکا ہے۔ ان کا سائنسی شعور اور مبسوط مطالعہ یقینی طور پر غالب شناسی میں اضافہ ہے۔ ان کی تنقید سے غالب کی لامحدودیت کی عکاسی ہوتی ہے اور ان کے اشعار کی نئی معنویت کی نمائندگی سامنے آتی ہے۔

غالب کی حیاتیاتی، نفسیاتی اور تاریخی عناصر کی نشاندہی میں جو سائنسی عوامل کارفرما ہیں اس کا انکشاف، اس کی تحقیق، اس کی نموپذیری تحلیلی اور پیمائشی زاویے سے وہاب قیصر نے پہلی بار کی ہے۔ انعکاس صفات کی اس جلوہ گری میں زمان ومکان کی ماہیت ہے، روشنی کا مسلسل سفر ہے اور ادراک اور حقائق کی بلند پروازی ہے۔

وہاب قیصر کی تنقید کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مدح سرائی نہیں کرتے ہیں، تعریف اور حمایت کو بھی راہ نہیں دیتے ہیں اور مقابلہ وموازنہ سے بھی اپنی تحریر کو بوجھل نہیں بناتے ہیں بلکہ حد درجہ سائنس رموز سے آگاہی کی بنا پر نظریہ، مرکزیت، رشتہ اور تجربہ کو چیلنج کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس میں مضمر صفات، مطالب اور مفاہیم کی اثر پذیری کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس طرح غالب کی غزل یا اشعار کی علامات، نشانات اور نظام کا نقش جداگانہ انداز سے منعکس ہوتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ غالب پہلودار شاعر تھے۔ ان کی مخصوص رمزیت کی بدولت معانی کا جہان وسیع اور بلیغ تھا۔ ذات کی تنگنائے سے کائنات کی بے کرانی بلکہ ماورائے کائنات کی اسراریت کا احاطہ ان کے یہاں مختلف اسلوب میں ملتا ہے۔ ان کے کلام میں اشیا اور ظواہر کے باطنی معنی سے آگاہی اور تماشائے کائنات کی نیرنگی کی نجی تمازت ہے۔ گلگشت چمن کے وقت وہاب قیصر آگہی سے کام لیتے ہوئے غالب کی علم ہیئت، فلکیات، طب، کیمیا، منطق، جمادات، ماحولیات، مابعد الطبعیات کے اصول کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں:

"مرزا غالب کا دور انیسویں صدی کا دور ہے جب کہ یورپ، سائنس کی ترقی سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ جس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑنے لگے تھے۔ غالب ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سائنس کی ترقی سے ان کی آگہی اور شعور کی بیداری، ان کے ذہن میں ایک نئے سائنسی دور کا تصور پیش کر رہی تھی۔"

سائنسی اصول اور اس کے معنی خیز نتائج وحقائق کو غالب کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے وہاب قیصر نے اپنے ذہن کی تازگی، دوررس سوچ اور تنقیدی وتخلیقی اپج کو سرچشمۂ افہام عطا کیا ہے۔ علم فلکیات پر مشتمل چند اشعار پیش کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ ستاروں اور سیاروں کی حقیقت کو غالب دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ہیں زوال آمادہ اجزائے آفرینش کے تمام — مہر گردوں ہے چراغ رہگذر باد یاں

وہاب قیصر لکھتے ہیں کہ عام آدمی کے لئے علم طبیعات اور اس کے اصولوں کو سمجھنا ایک دشوار امر ہے۔ غالب نے انہیں، اشعار میں اتنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان سے لطف لیا جا سکتا ہے۔

نہ گل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں — تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی — باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

یک قلم کاغذ آتش زدہ صفحۂ دشت — نقش پا میں ہے تپ گرمیٔ رفتار ہنوز

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب — ذرے اس کے گھر کی دیواروں میں نہیں

وہاب قیصر نے غالب کے یہاں طبعی اور کیمیائی تبدیلی کے رونما پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اور بطور مثال یہ اشعار پیش کئے ہیں۔

ضعف سے گریہ مبدّل بدمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے

غالب کو علم حیاتیات سے آگہی تھی۔اس بات کی تصدیق کے لئے وہاب قیصر بطور نمونہ یہ اشعار پیش کرتے ہیں:

سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

بس کہ زیر خاک، با آب طراوت راہ ہے — ریشہ سے ہر تخم کا دلِ اندرون چاہ ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد! — مئے ہے یہ مگس کی قئے نہیں ہے

علم طب سے غالب کی واقفیت اور اس سے لگاؤ نے ان موضوعات کو جس طرح شعری پیرہن عطا کیا ہے اس کی نشاندہی کے طور پر وہاب قیصر یہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں — جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آب تیغ نگاہ — کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا — آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

جلتا ہے دل کیوں نہ ہم ایک بار جل گئے — اے ناتمامیٔ نفس شعلہ بار حیف

نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا　　　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

ارضیات اور ماحولیات کے اصول کو بھی وہاب قیصر نے غالب کے یہاں تلاش کیا ہے:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　　　عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　　　بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم　　　　صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

مطالعۂ فطرت، حالات کی مناسبت اور نتائج کے پس منظر سے غالب بخوبی واقف تھے اور سائنسی Law سے واقفیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ جسے وہاب قیصر نے اپنے عہد کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اس کی آئینہ داری کرتے ہوئے ترجیحات پر خصوصی توجہ دی ہے اور بڑے کینوس پر سائنسی تمدن کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ صحیح معنوں میں وہاب قیصر نے اردو کی سائنسی تنقید کی نئی دنیا میں اپنی مخصوص فکر سے اور اپنے منفرد انداز سے جیسی روح پھونکی ہے ایسی مثال غالب شناس کے سلسلے میں پہلے سامنے نہیں آئی تھی۔ غالب کا مشہور شعر ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب　　　　ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

وہاب قیصر اس شعر کی روح تک اس طرح پہنچتے ہیں:

''اکیسویں صدی میں داخل ہونے تک سائنس اور ٹکنالوجی نے جو ترقی کی ہے، وہ دراصل ان خوابوں کی تعبیر ہے جنہیں انسان برسہابرس سے دیکھتا آ رہا ہے۔ ہزاروں میل تک آواز اور متحرک تصویروں کی ترسیل نے توانائی کی طرح انسانوں کی جسمانی لحاظ سے ناقابلِ یقین ترسیل کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ نیز اعضائے جسمانی کے آپریشن اور ان کی کامیاب پیوندکاری نے ان کے نعم البدل ایجاد کرنے کے لئے راہیں ہموار کی ہیں۔ کمپیوٹر، روبوٹ اور انٹرنیٹ کی ایجاد، خلاء اور چاند کی تسخیر کے بعد دوسرے سیاروں کی طرف بڑھتے ہوئے انسانی قدم سالہاسال کی تمناؤں کے پورا ہونے کا ثبوت ہیں۔ اس منزل پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنسی علوم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے محققین اکثر ایسی دریافتوں اور ایجادات کے لئے کوشاں رہتے ہیں جو دائرہ امکانات سے باہر سمجھی جاتی رہی ہیں۔ غالب کا یہ شعر اسی بات کی عکاسی کرتا ہے۔''

سائنس پر غائر نظر کی بنا پر وہاب قیصر نے تجزیہ نگاری (Analytical Review) کا نیا پیمانہ اور زاویہ اردو کو دیا ہے۔ غالب کا ایک اور معروف شعر ہے۔

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　　　عرش سے اِدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اس شعر کے بارے میں وہاب قیصر کی صراحت اس طرح ہے کہ قرآن میں جن آسمانوں کا ذکر آیا ہے وہ کہیں دور واقع ہوں گے۔ اتنی دور کہ ہم ان کی دوری کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جو آسمان ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ زمین کو گھیرا ہوا فضائی غلاف ہے۔ اگر ہمیں راست اپنی آنکھوں سے بلند ترین مقام کا نظارہ کرنا ہو تو ہم صرف آسمان ہی کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے آسمان ہی ہمارے لئے بلند ترین حدِ نظر ہے۔ یہ وجہ ہے کہ انگریزی میں اعظم ترین بلندی کے لئے Sky is the Limit کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ دوربین استعمال کئے بغیر آسمان سے بلند کسی مقام کا نظارہ مقصود ہو تو ہمیں فضا سے اونچا اٹھنا ہوگا۔ اسی بات کا اظہار غالب نے حسرت بھرے انداز میں کیا ہے۔!

وہاب قیصر کے اندازِ فکر، ذہنی رویے، احساس جمال اور سائنسی انکشاف سے کیسی کیسی نقشہ کشی سامنے آ رہی ہے۔ غالب کا با محاورہ شعر ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

وہاب قیصر کے جذبات و محسوسات سے نئے معنی سامنے آتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ رات میں آسمان پر جھلملانے والے بے شمار تارے ظاہری جسامت اور روشنی میں اصل سے مختلف نظر آتے ہیں۔ سادہ آنکھ سے دیکھنے پر اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کون سے ستارے ہیں اور کون سے سیارے۔ چند ستارے بہت دھندلے نظر آتے ہیں اور چند سیارے اتنے منورہ دکھائی دیتے ہیں کہ ہم انہیں ستارے سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ...... Delta ایک ایسا ستارہ ہے جس کی روشنی مستقل نہیں رہتی اور یہ سیارہ جیسا نظر آتا ہے۔ Cepheids ایسے ستارے ہیں جو جسامت میں پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں اور دیکھنے میں وہ سیارے جیسے لگتے ہیں۔

سیارہ مشتری (Jupiter) اور سیارہ زہرہ (Venus) اتنے زیادہ منور نظر آتے ہیں کہ ان پر ستاروں کا گمان ہوتا ہے۔ سیارہ مریخ (Mars) اور سیارہ زحل (Saturn) میں ستاروں جیسی چمک نظر آتی ہے۔ غالب نے ستاروں اور سیاروں کے مختلف نظر آنے کا اظہار کیا ہے۔

وہاب قیصر جس میزان نظر سے غالب کے اشعار کو سمجھتے ہیں اور سائنسی پہلو سے تولتے ہیں اس کے تجزیہ اور دریافت سے کلام پہلو دار ہو جاتے ہیں۔ غالب کا شعر ہے۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

وہاب قیصر نے مخصوص الفاظ سے استعارے کی معنی خیزی کو لانیفک بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شئے کے سالمات مرتعش ہوتے ہیں تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ آواز جو کانوں کو بھلی لگتی ہے، موسیقی کہلاتی ہے۔ موسیقی، سالمات میں باقاعدہ ارتعاش سے پیدا ہوتی ہے۔ گلوکار کی مدھر آواز میں سروں پر مشتمل موسیقیت پائی جاتی ہے۔ طبلہ، ڈھولک، مردنگ وغیرہ موسیقی کے ایسے آلات ہیں جن میں چرمی جھلیوں کو تانا جاتا ہے۔ انہیں جب پیٹا جاتا ہے تو موسیقی ریز تال پیدا ہوتے ہیں۔ بے سری آواز شور کہلاتی ہے۔ شور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب سالمات بے قائدہ طریقہ سے ارتعاش پذیر ہوں۔ شور کانوں پر گراں گذرتا ہے اور ہم اس سے دور بھاگنا چاہتے ہیں۔ جب کوئی شئے ٹوٹتی ہے تو شور جیسی کانوں پر چبھتی ہوئی آواز پیدا ہوتی ہے۔ غالب نے خود کو ایسی ہی آواز سے تعبیر کیا ہے۔

وہاب قیصر نے غالب کے تقریباً چھ درجن اشعار کا تجزیہ کیا ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے علم و ادب پر کس طرح اثر انداز ہو کر نئی جہتوں کو فروغ دیا ہے۔ غالب کا زمانہ انتشار کا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے نت نئے تغیرات اور تسلسل حیات پر سائنسی انداز سے نظر رکھی تھی۔ آج اکیسویں صدی میں غالب کو وہاب قیصر جیسا ناقد ملا ہے جن کی فکر و نظر سائنسی ہے اور جنہوں نے غالب کے اشعار میں نئے میلانات کی تلاش کی ہے۔ غالب کے درج ذیل دو اشعار بھی بیحد مشہور ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

وہاب قیصر بتاتے ہیں کہ سائنس میں بقائے مادہ اور توانائی کے کلیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں ہی نہ پیدا کیے جا سکتے ہیں اور نہ فنا۔ البتہ مادے کی ایک حالت کو دوسری حالت میں اور توانائی کی ایک قسم کو دوسری قسم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ آئین اسٹائین کی کمیت اور توانائی کے معدل کی مساوات کی رو سے کمیت اور توانائی دونوں کے غیر فنا پذیری کی اور ان کو ایک دوسرے میں تبدیل کئے جانے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادہ کو توانائی میں اور توانائی کو مادہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کو مادہ اور توانائی کی غیر فنا پذیری کا علم تھا تب ہی تو انہوں نے یہ اشعار کہے ہیں!

غالب کے درج ذیل شعر کو سمجھنے میں اکثر پڑھے لکھے لوگ دقت محسوس کرتے ہیں۔ کئی شارحین نے شعر کے معنی و مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی نشاندہی وہاب قیصر نے کی ہے۔

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں جو کہ کھایا خونِ دل بے منت کیموس تھا

حسرت موہانی لکھتے ہیں ''غذا ہضم ہونے اور خون بننے سے پہلے طبخ اول میں کیلوس کی شکل اختیار کر کے آش کے ماخذ اور اس کے بعد طبخ دوم میں کیموس کی صورت پا کر پانی کے مانند ہو جاتی ہے اور خون کی شکل اختیار کرتی ہے۔ غالب بیماری غم عشق کی فراغت کا ذکر کرتا ہے کہ خون کے کھانے میں کیلوس، کیموس وغیرہ کے جھگڑے پیش نہیں آئے اور ابتدا ہی سے خونِ جگر کھایا کیے۔''

نیاز فتح پوری کی رائے ہے: ''بیماریٔ غم کی فراغت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ میں کھاتا ہوں وہ کیموس کی منزل سے گذرے بغیر خون بن جاتا ہے اور گویا صحیح معنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کھانا نہیں کھاتا بلکہ خون کھاتا ہوں۔''

سلیم چشتی رقمطراز ہیں: ''اگر کوئی شخص غذا کھائے تو قانونِ فعل ہضم کے مطابق پہلے وہ غذا ''کیلوس'' پھر ''کیموس'' کی شکل اختیار کر کے خون میں تبدیل ہوگی۔ لیکن اگر ایک شخص غذا کی بجائے خون دل ہی کو اپنی غذا بنا لے تو پھر اسے کیموس کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

دوسرے شارحین نے بھی یہی کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر کی سائنسی تشریح اس طرح ہے: ''ہم غذا کے طور پر جو کچھ بھی کھاتے ہیں وہ مکمل طور پر ہضم ہونے سے قبل دو اہم مرحلوں سے گذرتی ہے۔ پہلے وہ کیلوس (Chyme) کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر کیموس (Chyle) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان دونوں مدارج طئے کرنے کے بعد غذا ہضم ہوتی ہے اور خون بنتا ہے۔ خون ہماری رگوں میں دوڑتے ہوئے جسم کے تمام حصوں کو درکار توانائی کی فراہمی کے لئے آکسیجن، گلوکوز وغیرہ مہیا کرتی ہے۔ جب کوئی شخص بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کا کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ تب اس کے جسم کی چربی غذا کا نعم البدل ثابت ہوتی ہے جو خون میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ بیماری کی حالت میں لوگوں کا وزن کم ہو جاتا ہے اور وہ دبلے نظر آتے ہیں) اس طرح بیمار شخص وقتی طور پر غذا کے استعمال سے فراغت پاتا ہے۔ جب غذا کا استعمال ہی نہیں ہوتا تو اس کو ہاضمے کے مدارج کیلوس اور کیموس سے گذرنا نہیں پڑتا۔ بیماری کی صورت میں جسم خود غذا کی جو پا بجائی کرتا ہے۔ اس کو غالب نے نظم کیا ہے۔''

غالب کا درج ذیل شعر اکثر حوالے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اس شعر کی گہرائی تک پہنچنے کی لئے وہاب قیصر نے حقائق کی بنیاد پر سائنٹفک دلائل پیش کئے ہیں اور منطقی انداز بھی اپنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب ہم احساسات اور جذبات سے مغلوب ہوتے ہیں تو ہمارا دوران خون بڑھ

جاتا ہے اور دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، جس پر ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا تعلق دل ہی سے ہے۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو احساسات اور جذبات کا تعلق دل سے نہیں بلکہ دماغ سے رہتا ہے۔ چنانچہ عشق جیسے نازک اور حساس جذبے کا تعلق بھی دماغ سے ہی رہتا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق برطانوی عصبیت دانوں (Neurologists) نے عشق کو ایک خاص دماغی عمل بتلایا ہے۔ انہوں نے اس بات کا پتہ بھی لگایا ہے کہ عشق میں مبتلا کسی شخص کو جب اس کے محبوب کی تصویر دکھلائی جائے تو دماغ کے ایک مخصوص حصے میں تحریک بڑھ جاتی ہے اور دوسرے حصوں میں دماغی عوامل نمایاں طور پر کم ہوجاتے ہیں۔ میڈیکل سائنس کی اس دریافت سے غالب کے اس شعر کی تصدیق ہوتی ہے۔!

غالب کا کلاسیکی انداز کا شعر ہے جس میں مرہم اور جراحت دل کی باتیں ہیں۔ لیکن ایک لفظ الماس بھی ہے۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحت دل کا　　　　کہ اس میں ریزۂ الماس، جزوِ اعظم ہے

اس الماس لفظ سے شعر کے اندر زیریں معنویت کو وہاب قیصر نے جو آفاقی اصول و عمل کا منظر نامہ عطا کیا ہے اس سے سائنسی حقائق کا اعادہ ہوتا ہے اور تعین اظہار میں مدد ملتی ہے اور تفہیم شعر میں آسانی تو ہوتی ہی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہیرا اپنی چمک اور سختی کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں حرارتی موصلیت Heat Conductivity سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ عام طور پر حرارتی موصل، برق کے لئے اچھے موصل ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن ہیرا اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ برق کے بے غیر موصل ہوتا ہے۔ اس کی حرارتی موصلیت چاندی اور تانبہ کی حرارتی موصلیت سے بھی زیادہ ہوتی ہے جو سب سے زیادہ برقی موصلیت کے حامل ہیں۔ اگر زائد حرارتی موصلیت رکھنے والی شے کو کسی گرم مقام سے حالت تماس میں لایا جائے تو اس مقام کی بہت زیادہ حرارت اس میں داخل ہوجاتی ہے۔ اس طرح گرم مقام کی تپش میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ طاقت کی برقی رو گذارنے والے نازک الکٹرانک آلات کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے ہیرے کو حرارتی جاذب (Heat Sink) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر مرہم بنانے میں ہیرے کے ریزے شامل کئے جائیں تو ہوسکتا ہے وہ زخم کی گرمی کو جذب کر کے ٹھنڈک پہنچانے کا باعث ہوں گے۔ غالب ہیرے کی اس خصوصیت سے شاید واقف رہے ہوں تب ہی تو انہوں نے یہ شعر موزوں کیا ہے۔

غالب کا ایک اور سائنسی اور نفسیاتی شعر ہے۔

تپش دل نہیں بے رابطہ، خوف عظیم　　　　کشش دم نہیں بے ضابطۂ جر ثقیل

نئی لسانی تشکیل اور موضوع کے پیچیدہ اور مبہم اظہار کو وہاب قیصر نے تشریح اور تفہیم کا جداگانہ پیمانہ بخشا ہے۔ اس شعر کی گہرائی اور گیرائی تک وہ اس طرح پہنچتے ہیں کہ علم میکانیات (Mechanics) کے لئے ایک اصطلاح جر ثقیل بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ علم طبیعیات کی وہ شاخ ہے جس میں اجسام پر قوتوں کے عمل سے بحث کی جاتی ہے۔ جب کسی جسم پر کوئی قوت عمل کرتی ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ نقل مکانی کرتا ہے۔ جسم جتنا وزنی ہوگا اس کی نقل مکانی کے لئے اتنی ہی زیادہ قوت درکار ہوگی۔ ڈر و خوف سے ہمیں جو گھبراہٹ ہوتی ہے اس کا احساس دل کی دھڑکن سے ہوتا ہے۔ ایسے میں پورے حواس برقرار رکھنے کے لئے اعضائے جسمانی کو آکسیجن کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے جس کی پابجائی دل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دل خون کو جتنی تیزی سے پمپ کرے گا اس کی تپش اور دھڑکن میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہوگا۔ ایسے وقت ہماری سانس پھولنے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جر ثقیل کے اصول کو

کام میں لائے بغیر شاید ہمارا سانس لینا دشوار ہوگیا ہے۔ غالب کا یہ شعر ایسے ہی موقع کی غمازی کرتا ہے۔
وہاب قیصر نے غالب کے فارسی اشعار کی بھی فکری اور مابعد الطبیعاتی تشریح کی ہے۔ حرارت، روشنی، توانائی، کرۂ ارض کا ارتقاء اس کے اطراف فضائی غلاف کی موجودگی وغیرہ کی دریافت انہوں نے غالب کے فارسی اشعار میں کی ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے۔

گل زار دمیدن شررستان رمیدن فرصت تپش و حوصلۂ نشوونما ہیچ

اس کا دانشورانہ معنوی بانکپن وہاب قیصر نے اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ماہر طبیعیات De Broglie نے مادہ کی دوہری فطرت Duel Nature of Matter کے نظریئے کو پیش کیا تھا۔ تجربات کی روشنی میں اس نظریئے کی تصدیق بھی ہو چکی ہے اس نظریئے کی رو سے جب کوئی مادی جسم ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہمیشہ ایک موج منسلک رہتی ہے۔ اس موج کا طول اور اس کی فریکوینسی کا انحصار مادی جسم کی رفتار پر ہوتا ہے۔ اس طرح مادی اجسام، سفر میں مادے کی خاصیت کے ساتھ ساتھ موجی خاصیت بھی رکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کو مادے کی دوہری فطرت کا وجدانی علم رہا ہوگا تب ہی انہوں نے یہ شعر موزوں کیا ہے۔!

ڈاکٹر وہاب قیصر جدت پسند ناقد ہیں۔ طرز اظہار کا موثر پیرہن بدلنے میں ماہر ہیں۔ ان کی فکر کی لیبارٹری میں تجربے ہیں اور نئے مفہوم اور نئی معنویت اختراع کرنے کے ایسے آلات ہیں جن سے غالب جیسے تخلیقی فنکار کا سائنسی ذہن روز روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے۔ فکر و فراست کی راہ سامنے آتی ہے، جہانِ عقل و دانش اور کارزار علم و حکمت سے آشنائی ہوتی ہے اور لامتناہی تنوع کی بصارت و بصیرت کی پہچان ملتی ہے۔ وہاب قیصر نے دشت امکاں میں جو سائنسی نقش پا چھوڑے ہیں ان میں کئی عوامل شامل ہیں جن کی سورج رسا کرنوں کو دیکھا جاسکتا ہے، محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی فکر کی رعد میں روشنی ہی روشنی ہے۔!

☆☆☆

ڈاکٹر منصور عمر، شعبۂ اردو، سی۔ ایم۔ کالج، دربھنگہ (بہار)

سائنس اور غالب : ایک جائزہ

غالب اپنے عہد کا نابغۂ روزگار تھا اور اسے اپنی حیثیت کا بجا طور پر احساس بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو اپنے عہد کے تمام شعراء سے برتر اور عظیم سمجھتا تھا۔ لیکن اس کی پریشانی یہ تھی کہ اس کی پیچیدہ طبیعت نے اس کی شاعری کو پیچیدہ بنا دیا تھا اور اس کے بیشتر قارئین اس کی شاعری کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ ع میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

آج جب کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں اور سائنس وٹکنولوجی اپنی انتہائی مدارج پر پہنچ چکی ہے۔ تمام ادبیات عالم ہماری نظروں کے سامنے ہیں، ایسے میں اگر ہم دنیا کے صرف تین شعراء کا انتخاب کریں تو غالب اگر سرفہرست نہیں تو تیسرے نمبر پر بھی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی شاعری آج بھی ہمارے لئے اتنا ہی تازہ اور لاینحل ہے جتنی کہ غالب کے عہد میں تھی۔ اور جسے حل کرنے کی کوشش غالب کے معتقد مولانا الطاف حسین حالی نے شروع کی تھی وہ عہد بہ عہد سفر کرتے ہوئے ڈاکٹر وہاب قیصر تک پہنچ چکی ہے۔ اور انہوں نے اپنے پیشروؤں سے الگ ہٹ کر غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

"سائنس اور غالب" وہاب قیصر کا وہ کارنامہ ہے جو غالب کی شاعری کو ایک نئی جہت سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر سے پہلے جیسوں ایسے ناقدین ہوئے ہیں اور ہیں جنہوں نے غالب کو اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ چنانچہ بہت سے ماہرین غالبیات نے غالب کے سائنسی افکار و خیالات کی طرف بھی اشارے ضرور کئے ہیں لیکن اس کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں۔

ڈاکٹر وہاب قیصر چونکہ سائنٹسٹ بھی ہیں اور نقاد بھی اس لئے انہوں نے غالب کی شاعری پر سائنسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور سائنسی کسوٹی پر پرکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں "غالب کا کائناتی شعور" کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ:۔

> "غالب پر کام کرنے والے دیگر ناقدین کے یاں بھی غالب کے سائنسی شعور کی طرف اشارے ملتے ہیں مگر غالب کے سائنسی شعور کا مبسوط مطالعہ ان میں سے کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: "سائنسی مطالعہ کے دو پہلو ہیں... ایک مادّہ اور مادّہ سے مرتب ہونے والی صورتوں کا مطالعہ اور دوسرا کائناتی شعور۔" (سائنس اور غالب ص:۶)

اور پھر وہ غالب کے سائنسی شعور کو ان کے کائناتی شعور سے عبارت قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک نامور سائنس داں ادیب پروفیسر ایم۔ ایم۔ تقی خاں نے اپنے پیش لفظ "غالب کا وجدانی ادراک" میں سائنس اور ادب میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا خیال ہے کہ:۔

"ادب اور سائنس سطحی طور پر دو ایسی حقیقتیں نظر آتی ہیں جن میں بعد المشرقین ہو لیکن غائر نظر سے آپ دیکھیں تو دونوں خیالات اور قلب کی کیفیات ہیں۔ دونوں فطرت کے حسن کی متلاشی ہیں۔ ایک فطرت کو اپنے مطالعہ، تحلیل، تکمیل اور پیمائش سے ایک نظریہ یا مساوات کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ اور دوسرا فطرت کے حسن کو اپنے شعر میں ڈھال لیتا ہے۔ یہ قلبی کیفیت عین الہامی ہوگی۔ شعر میں بھی سائنسی الہامیت آجاتی ہے۔" (سائنس اور غالب ص:۹)

مذکورہ خیالات میں جزوی صداقت تو ضرور ہے لیکن اسے کلیہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شعر میں سائنسی الہامیت آجاتی ہے لیکن بعض اوقات یہ الہامی کیفیت مطالعہ ومشاہدہ کی بنیاد پر بھی ہوتی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ غالب کا مطالعہ بہت ہی وسیع تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں جو علوم رائج تھے ان میں عربی زبان میں کئے گئے سائنسی، طبیعاتی، ریاضیاتی اور فلکیاتی تجربات وافر مقدار میں موجود تھے۔ اور اس زمانے کا ہر پڑھا لکھا آدمی ان علوم سے واقفیت رکھتا تھا۔ غالب نے بھی ان علوم کا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کا کائناتی شعور صرف تخیلی یا وجدانی نہ تھا بلکہ ان کے مطالعے کا بھی مرہون منت تھا۔

یہ باتیں میں یونہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ "سائنس اور غالب" کے مصنف وہاب قیصر کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ "غالب کے عہد تک میں بے شمار مدارس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ان مدرسوں کے نصاب میں طبعی سائنس کا غلبہ تھا جو اس دور میں معقولات کے نام سے پڑھائی جاتی تھی۔ اس میں علم طبیعات، ریاضیات، فلکیات او رعنصریات شامل تھے۔ شہر کے عالم وفاضل حضرات کے مابین سائنسی علوم کے کئی ایک مسائل زیر بحث رہا کرتے تھے۔ ماہرین علم ودانش کا خیال ہے کہ غالب اور دلی کے علماء کے مابین سائنسی علوم کے مسائل یقیناً زیر گفتگو رہے ہوں گے۔" (سائنس اور غالب ص:۱۶)

بظاہر یہ خیال قیاس آرائی پر مبنی ہے لیکن حقیقتاً ایسا ہی تھا۔ نہ صرف یہ کہ سائنسی علوم پر مباحث ہوا کرتے رہے ہوں گے بلکہ غالب کا زیادہ تر وقت مطالعہ ومشاہدہ میں گذرتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ بھی انے وجدان وتخیل کی کارفرمائی میں مددگار ثابت ہوا۔ چنانچہ وہاب قیصر بھی چند شواہد کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:۔

"مرزا غالب جدید علوم کی نہ صرف آگہی رکھتے تھے بلکہ دوسروں کو ان کے حصول کی تاکید بھی کیا کرتے تھے۔" اور پھر دلیل کے طور پر غالب کے خط سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:۔

"میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب ونجوم ومنطق، فلسفہ پڑھ جو آدمی بننا چاہے۔" (ص:۱۷)

ظاہر ہے کہ طب ونجوم ومنطق اور فلسفہ بھی دینی مدارس ہی میں پڑھائے جاتے تھے نہ کہ اسکول وکالج میں جس کا اس زمانہ میں وجود بھی نہ تھا۔

"غالب کا سائنسی شعور" کے سلسلے میں اپنی بات کو مدلل وموثر بنانے کے سلسلے میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے مختلف شواہد جمع کیے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت نہ صرف یہ کہ فاتح سے مفتوح کی حیثیت اختیار کر گئی بلکہ انہیں احساس کمتری کے قعر مذلت میں دھکیل دیا گیا تھا۔ لیکن سرسید

نے علمی و عملی طور پر مسلمانوں کو اس قعر مذلت سے نکالنے کا بیڑا اٹھایا اور تمام تر مخالفتوں کے باوجود وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ غالب نے ہر چند کہ اس طرح کا کوئی بھی کام نہ کیا اور وہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ افکار و خیالات کی حد تک وہ سرسید سے کسی بھی طرح پیچھے نہ تھے۔ مگر غالب اور سرسید میں بنیادی فرق یہ ہے غالب اپنی ذات کے اسیر تھے اور سرسید قوم کے ہمدرد و بہی خواہ۔ چنانچہ خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی کتاب ''افکارِ غالب'' میں ان دونوں حضرات کا جو موازنہ کیا ہے اسے وہاب قیصر نے نقل کیا ہے:

''لوگ سرسید کو نئے زاویۂ نگاہ کا امام سمجھتے ہیں۔ لیکن غالب اس حقیقت میں سرسید سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ لوگوں نے سرسید کی مخالفت زور و شور سے اس لئے کی کہ وہ قوم کو قدیم سے جدید کی طرف لانا چاہتا ہے۔ اور انگریزوں اور انگریزیت سے مغلوب ہو گیا ہے۔ لیکن غالب سرسید کی مخالفت اس لئے کرتا ہے کہ قدامت پرستی کے خبط میں مردہ پرستی کر رہا ہے۔'' (ص:۲۲)

اس طرح دیکھا جائے تو وہاب قیصر نے ''سائنس اور غالب'' کے پہلے باب ''غالب کا سائنسی شعور'' کو بہت ہی مدلل بنانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح اصل موضوع ''سائنس اور غالب'' کے لئے فضا ہموار کی ہے۔ حالانکہ یہ باب صرف سولہ صفحات پر مشتمل ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس باب کی تیاری میں اچھی خاصی محنت و مشقت کی گئی ہے۔

اس کتاب کا اصل اور سب سے اہم باب ''سائنس اور غالب'' ہے جو صفحہ ۳۱ سے صفحہ ۸۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ جس میں غالب کے ۶۶ اشعار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان میں سے ۵۹ ر اردو کے اشعار ہیں اور سات فارسی کے۔ اس باب کی تیاری میں ڈاکٹر وہاب قیصر کو جس عرق ریزی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا وہ کچھ وہاب قیصر ہی جانتے ہونگے، نیز یہ کہ انہیں جس غواصی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا وہ جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ سائنس اور شاعری میں تعلق پیدا کرنا ایک اہم کارنامہ انجام دینے کے مترادف ہے۔ اس باب سے استفادہ کرنے اور محظوظ ہونے کے لئے اس کا مطالعہ ناگریز ہے۔ ہاں فارسی کے ایک شعر کی بابت انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

دود سودائے تتق بست آسماں نامید مش   دیدہ بر خواب پریشاں زد، جہاں نامید مش

اس شعر کی توجیہ بیان کرتے ہوئے وہاب قیصر لکھتے ہیں کہ:

''کرۂ ارض کے اطراف فضائی غلاف موجود ہے۔ جس کو زمین کی کشش ثقل (Gravitational Attraction) تھامے ہوئے رہتی ہے۔ سطح زمین پر وقوع پذیر ہونے والے تمام کیمیائی تعاملات میں جو بھی گیس، آبی بخارات، دھواں یا کاربن وغیرہ کے ادھ جلے ہلکے ذرات خارج ہوتے ہیں، وہ اوپر اٹھ کر فضا کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ فضائی غلاف ہی ہے جو ہمیں آسمان کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس شعر میں غالب نے آسمان کی حقیقت کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے۔'' (ص:۸۵)

میں اس سلسلے میں عرض یہ کرنا چاہوں گا کہ غالب کا یہ شعر تخیلی یا وجدانی نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کے مطالعے پر مبنی ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ''ثم استوی الی السَّماءِ وَھِیَ دُخان (پھر چڑھا

آسمان کو اور دھواں ہو رہا تھا) آیت ۱۱

اسی طرح قرآن پاک میں اَلدُّخَان کے نام سے ایک سورۃ بھی موجود ہے: ''فارتقب یوم تاتی السّماءُ بدُخان مُبین (سو تو انتظار کر اس دن کا کہ لائے آسمان دھواں صریح) آیت ۱۰

میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، بس صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ کاش وہاب قیصر صاحب نے غالب کے مطالعہ کے دوران قرآن مجید کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا۔

اس وقت مجھے اس موضوع پر کسی نامعلوم شاعر کا دو شعر یاد آرہا ہے۔

نہ کرتا ضبط میں، نالہ تو اک ایسا دھواں ہوتا	کہ نیچے آسماں کے اک نیا اور آسماں ہوتا
فضا میں گر یونہی جمتا رہا دودِ فغاں میرا	تو زیر آسماں بن جائے گا اک آسماں میرا

اس باب کے سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ وہاب قیصر نے اپنی علمی وفنی مہارت سے غالب کے مذکورہ اشعار کو جو بلند قامتی عطا کردی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

''سائنس اور غالب'' کا تیسرا اور آخری باب ''غالب کے سائنسی اشعار ماہرین علم وادب کی نظر میں'' سب سے طویل ہے جو ص ۸۹ سے ص ۱۵۷ تک محیط ہے۔ اس باب میں خالص چھان پھٹک سے کام لیا گیا ہے اور وہاب قیصر نے ان مآخذ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جو اس سلسلے میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ یہاں انہوں نے غالب کے ۶۱ر اشعار پر ۲۹ر ماہرین غالبیات کی ۲۱۸ آراء کو جمع کردیا ہے۔ گویا انہوں نے انتھک محنت وجستجو سے نہ صرف یہ کہ ان مآخذ تک رسائی حاصل کی بلکہ ان اقتباسات کو نقل کر کے اس کتاب کا حصہ بنایا اور اس کتاب کی افادیت واہمیت میں اضافہ کیا۔ اگر وہ چاہتے تو ان سے صرف نظر کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ سائنس کے طالب علم رہے ہیں، جو حقیقت کی تہہ تک پہنچنے سے دریغ نہیں کرتا اس لئے انہوں نے بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردکھایا۔

مجھے کہنے دیجئے کہ غالب کے آفاقی اشعار کی طرح وہاب قیصر کی کتاب ''سائنس اور غالب'' غالبیات کی سلسلے کی وہ تحقیقی کڑی ہے جو غالب کی شاعری کو آفاقیت عطا کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اور گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے غالب کی شاعری اور قارئین کے درمیان جو دبیز پردے حائل تھے انہیں اٹھا کر ہمیں چکا چوند کردینے والی روشنی سے روشناس کراتی ہے۔ اور یہی اس کتاب اور وہاب قیصر کا طرۂ امتیاز ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ (بہار)

ادب میں سائنس کا رمز شناس: وہاب قیصر

گمان اور قیاس کی منزلوں سے آگے نکل کر کوئی سائنسداں حقیقی زندگی کے پہلوؤں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے ہر عمل کی سائنسی تفسیر ہو سکتی ہے اور سائنس کی بنیادی اور ابتدائی جستجو اور تلاش کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اور زندگی میں ضرورتوں کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ سائنسی اصول بدلتے نہیں، لیکن اپروچ میں تبدیلیاں ضرور رونما ہوتی ہیں اور شاعر یا ادیب جو کچھ لکھتا ہے وہ سماج کا عکس ہوتا ہے۔ ان کہی یا غیر محسوس باتیں جب سامنے آتی ہیں تو لوگ متحیر ہو جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ فنکار نئی تلاش و جستجو کے مرحلہ سے گزرا ہے۔ وہاب قیصر نے ان تمام پہلوؤں کا سائنسی نقطہ نظر سے تجزیہ کیا ہے اور انہوں نے وہ پرتیں کھولی ہیں جو الہام کی صورت میں شعری یا فکری لوازمات کے ساتھ اردو ادب میں موجود ہیں۔

سائنس کی برکتیں جتنی زیادہ اور اس کی جہتیں جتنی وسیع ہیں، ادب کا دامن بھی اتنا ہی کشادہ ہے۔ ضرورت ہے تلاش و جستجو کی۔ اس لیے کہ ادب جن پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے، سائنس بھی ان ہی پہلوؤں سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اردو شاعری میں شمع اور پروانہ کے موضوع پر ہزاروں اشعار ملیں گے۔ سائنسدانوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ شمع کی روشنی پر پروانوں کا فدا ہونا ایک سائنٹفک عمل ہے۔ گرچہ یہ عشق کا جنون بھی ہے۔ اپنے تجربوں سے سائنسدانوں نے یہ بتایا ہے کہ جو مادہ پروانہ ہوتی ہے، وہ ایک طرح کی روشنی یا شعاعیں رات کی سیاہی میں پیدا کرتی ہیں اور ان شعاعوں کی ہم شکل جو شعاعیں انہیں دکھائی دیتی ہیں جیسے کہ شمع کی روشنی، اس پر نر پروانے منڈلانے لگتے ہیں اور ان کی فدویت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنی جان بھی دے دیتے ہیں۔ یہ سائنسی معلومات ہیں لیکن ہمارے ادب میں یہ مضامین بہت زمانہ سے موجود ہیں۔

ہمارے یہاں قطعہ تاریخ بھی لکھا جاتا ہے، اس کا تعلق ریاضیات سے ہے لیکن اس ریاضی فارمولے کو عام کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ وہاب قیصر نے ادب کی اس نوع کی سائنسی توجیہات پیش کر کے ادب کو نئی وسعت دی ہے۔ ان کی تحریروں سے وہ مخفی پہلو بھی سامنے آئے ہیں، جن سے ہم نا آشنا تھے۔ وہاب قیصر کے خیال میں اچھے ادیب کی پہچان یہ ہے کہ اس کے اندر بدلتے ہوئے حالات کو تیزی کے ساتھ بھانپ لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اپنے مضمون ''غالب کا سائنسی شعور'' میں وہاب قیصر کہتے ہیں: ''کسی بھی زبان کے بلند پایہ ادیب اور شاعر زمانے کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ وہ ماضی اور حال سے واقف اور بہتر مستقبل کے نقیب ہوتے ہیں۔ بدلتے ہوئے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی حالات کو تیزی کے ساتھ بھانپ لیتے ہیں۔ ان کی تخلیقات آفاقی، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ جو نہ صرف تخلیق کار کے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ آنے والے عہد پر اثر انداز

بھی۔"بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ وہاب قیصر دور کی کوڑی لاتے اور اپنے سائنسی علم کا زور دکھانے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔ حالاں کہ ایسی سوچ رکھنے والے ایک محدود دائرہ میں سوچ رہے ہیں کیوں کہ انسان کا دماغ محشرستاں ہوتا ہے اور اس کے ذہن کے اندر طرح طرح کے ایسے خیالات آتے رہتے ہیں جو سائنسی تخلیق سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اب غور کریں کہ شاعر اگر کسی Refraction کے نظریہ کو شعر میں ڈھال دیتا ہے تو یہ فزکس کی بات ہوئی اور اس کی تشریح کوئی فزکس کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے "مسجد قرطبہ" لکھی۔ یہ ایک ادبی کارنامہ ہے اور ایک خوبصورت نظم ہے۔ لیکن Space & Time کا نظریہ جس کو آئنسٹائن نے پہلی بار دنیا میں پیش کیا ہے، اس کی مکمل تشریح اور عکاسی ہے، کیوں کہ یہ Theory of Relativity ماضی، حال و مستقبل کے مابین رشتوں کو ایک سریز میں پروتا ہے۔ ایسے ادبی کارنامے جن کی سائنسی توضیح ضروری ہے، اس کا حق وہاب قیصر جیسے دانشور ہی کر سکتے ہیں۔

وہاب قیصر کی کتابیں "سائنس کے نئے افق"، "سائنس اور غالب"، "سوالوں میں رنگ بھرے"، "مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت"، "مولانا آزاد کے سائنسی مضامین" اور "مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و عمل کے چند زاویے" اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد دربھنگہ (بہار)

ڈاکٹر وہاب قیصر: مطالعہ آزاد کا ایک معتبر نام

ڈاکٹر وہاب قیصر علمی وادبی حلقے میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ جدید موضوعات بالخصوص سائنس پر ان کی وقیع تحریریں اردو کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ سائنٹفک اپروچ اور جدید ترتحقیق وجستجو انکی تحریر کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ نئے موضوعات کی پیش کش میں انفرادیت انکی شناخت ہے۔ تقریباً چار دہائیوں سے قارئین علم و ادب کو اپنے عمیق مطالعے اور وسعت افکار سے متوجہ کرتے رہے ہیں۔ خاص طور پر مولانا آزاد سے متعلق انکی ترتیب وتالیف اور مضامین نے نئے گوشوں کو آشکار کیا ہے۔ سائنس ان کا خاص موضوع ہے لہٰذا انکی کاوشوں کے مرکز میں سائنسی علوم کو خاص دخل عمل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سائنٹفک طریقہ کار کا اختصاص ان کے یہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ''غالب اور سائنس'' کا مطالعہ میری گفتگو کو تقویت دیتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے عظیم المرتبت شاعر کو سائنسی نظریے سے دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ''مولانا آزاد کے سائنسی مضامین'' اور ''مولانا ابوالکلام آزاد' فکر و عمل کے چند زاویے'' ڈاکٹر وہاب قیصر صاحب کے فکری میلان اور معیاری تحقیق وتنقید کا روشن باب ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں جتنا لکھا جائے کم ہے۔ ان جیسا صدیوں میں کوئی ایک ہوتا ہے۔ ان کی زندگی، علمی وادبی کارنامے نیز سیاسی خدمات پر بہت کام ہوا ہے اس کے باوجود اتنے ہی گوشے اب بھی توجہ طلب ہیں جنکی افادیت مسلم ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا کے مضامین جو مختلف اخبار ورسائل میں بکھرے پڑے تھے کا ایک معیاری انتخاب پیش کیا۔ ''مولانا آزاد کے سائنسی مضامین'' کے نام سے مرتب کتاب میں ۴۵ مضامین شامل ہیں۔ الہلال، البلاغ وغیرہ میں جدید علوم بالخصوص سائنس کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ان سے مولانا آزاد کی سائنس سے دلچسپی اور اردو داں کو اس سے بہرور کرانے کی خواہش کا علم ہوتا ہے۔ مولانا کامیاب انشاء پرداز تھے۔ سیاسی اور سماجی تدبر ان کے افکار کا آئینہ دار ہے۔ وہ وقت کی نبض پہچانتے تھے۔ اس لئے صرف ادبی یا مذہبی افکار تک اپنے قاری (اپنی قوم) کو محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''خدنگ نظر''، ''لسان الصدق''، ''الندوہ''، ''الہلال''، ''البلاغ'' وغیرہ میں ان کے سائنسی مضامین اس وقت اپنی نوعیت کی منفرد تحریر تھی اور آج بھی اسکی افادیت اتنی ہی ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر نے کافی چھان پھٹک کے بعد ان مضامین کو یکجا کیا ہے۔ ''مولانا آزاد کے سائنسی مضامین'' سے قبل انیس صفحات پر محیط ان کا مقدمہ نہایت جامع اور فکر انگیز ہے۔

مقدمے میں ڈاکٹر وہاب قیصر نے اس کتاب میں مشمولہ مضامین کی حصولیابی میں آنے والی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے نفس مضمون پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ انہوں نے مولانا آزاد کی تحریروں میں ضرورت عامہ اور عصری آگہی جیسے خصائص کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ کسی بھی معاشرے کی ترقی کے لئے جدید علوم وفنون کی حصولیابی کا منکر ہونا اہل علم کو زیب نہیں دیتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ نئے موضوعات پر لکھنے والے ہر دور میں کم رہے ہیں لیکن مولانا آزاد نے اپنی راہیں جدا رکھنے اور منزل تک جانے میں کامیابی حاصل کی۔ ڈاکٹر موصوف کے مطابق:

''اردو میں ابتدا سے تکنیکی موضوعات پر مسلسل لکھنے والے گنے چنے لوگ ہی گزرے ہیں۔ اکثر ایسے نثر

نگار ملیں گے جو کسی سائنسی ایجاد، دریافت یا بہت بڑا واقعہ جیسے خلاء کی تسخیر، چاند پر انسانی قدموں کی پہنچ وغیرہ کو موضوع بنا کر اس سے متعلق معلومات وتفصیلات پر کچھ لکھا اور قارئین کی نذر کیا۔ لیکن مولانا آزاد نے ایسے ایسے انوکھے اور اچھوتے موضوعات اور عنوانات پر قلم اٹھایا ہے کہ اسکی نظیر نہیں ملتی۔(مولانا آزاد کے سائنسی مضامین ،ص:۱۳)

مقدمے میں ڈاکٹر موصوف نے مولانا آزاد کے وسیع المطالعہ ہونے اور مضمون لکھنے سے قبل موضوع پر دسترس کے لئے معاون کتب و رسائل سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے "خدنگ نظر" میں شائع ہونے والے مضمون "زمانہ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک" کی تیاری میں "حسن المحاضرۃ"، "التویف بالمصطلح التشریف" وغیرہ تصنیفات سے استفادہ کا حوالہ دیا ہے۔ انگریزی اخبارات ورسائل گلوب، گرافک، سائنٹیفک امریکن، میکانک وغیرہ کے حوالہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر عالمی رسائل وجرائد پر رہتی تھی۔ وہ مولانا کے سائنسی مضامین کی اثر انگیزی کا ذکر کرتے ہوئے عام مضامین کی خشکی اور قارئین کے لئے معمہ کی وجہ انگریزی ماخذات سے براہ راست ترجمہ اور مضمون نگار کی ان علوم سے ناواقفیت قرار دیتے ہیں، جو حقیقت ہے۔ آج بھی ادب کو چھوڑ کر جن علوم و فنون کے متعلق اردو میں مضامین آتے ہیں ان میں زبان کی ناہمواریاں اور قاری کو مطمئن کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ لیکن مولانا آزاد کے بارے میں ان کا نظریہ واضح اور مبنی برصداقت ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

> "سائنس کے تمام شعبوں پر مولانا کی نظر تھی اور ان میں سائنسی علوم کا ادراک تھا۔ اور اک بھی ایسا تھا کہ سائنس کے جس کسی شعبہ سے تعلق رکھنے والے موضوع پر جب وہ رقم طراز ہوئے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس شعبہ کے ماہر ہیں۔ مضمون لکھنے کے لئے مواد تو وہ بھی کسی نہ کسی انگریزی ماخذ سے لیتے لیکن سب سے پہلے اس موضوع پر تمہید باندھتے اور مضمون کے متن میں حسب ضرورت مثالوں، احادیث اور قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتے اور اپنے فہم وادراک سے اور خوبصورت طرز تحریر سے اس کو اتنا سہل بنا دیتے کہ پڑھنے والا شروع سے لیکر آخر تک پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا۔ وہ اتنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے سائنسی اصولوں کی وضاحت کو، سائنس کی انگریزی اصطلاحات کی تشریح کو اور اردو میں ان اصطلاحات کی متبادلات کو کسی کسی مضمون کے فٹ نوٹ میں بیان کردیتے تھے۔"(مولانا آزاد کے سائنسی مضامین ،ص:۱۱)

زیر گفتگو مقدمے میں ڈاکٹر وہاب قیصر کا انداز سائنسی اصول کے عین مطابق ہے۔ انہوں نے مولانا کی سائنس سے رغبت کے وجوہات، شاعری سے کنارہ کشی، ترجمہ کا طریقہ الہلال کے مضامین کی افادیت، البلاغ کا جاری ہونا، دونوں میں معنوی یکسانیت، مولانا احمد علی (گجرات) کے مراسلے میں سائنس کے مضامین کی فرمائش اور مولانا کے ذریعے انکی خواہش کا احترام، فزکس، میڈیکل سائنس جغرافیہ، طبعیات وغیرہ کو انوکھے انداز میں مختلف عنوانات کے تحت پیش کرنے کی تفصیل اور مولانا کے مضامین سے اقتباسات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس مقدمے کی روشنی میں ڈاکٹر وہاب قیصر ایک ایسا نثر نگار ہے جن کی تحریر میں سائنس، سماجیات اور ادب ایک ساتھ مل کر قارئین کو موضوع سے جوڑے رکھنے میں کامیاب ہے۔ یہی ایک کامیاب نثر نگار کی پہچان ہے۔ مولانا آزاد سے فکری وابستگی نے ان کو ایک ایسا انداز عطا کیا ہے جس کا سرا مضامین کے عصری حسیت اور افادیت سے جا ملتا ہے۔ اسی طرح "مولانا ابوالکلام آزاد فکر وعمل کے چند زاویے" کے نام سے مرتب مضامین کا مجموعہ جو مولانا آزاد کثیر الجہات شخصیت وکارنامے پر محیط ہے کے مطالعے سے ڈاکٹر وہاب قیصر صاحب کی آزاد شناسی کا ادراک ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑی صاف گوئی سے بیان کیا ہے کہ:

''مولانا آزاد میری پسندیدہ شخصیت ہیں۔ایسی شخصیتیں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔میں چاہتا ہوں کہ جتنا زیادہ ان کے بارے میں جان سکوں وہ بہتر ہے اور اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ میں اپنی تحریروں کے ذریعے نئی نسل کو ان کے بارے میں واقف کراؤں۔یہی وجہ ہے کہ میں مولانا آزاد کے بارے میں آئے دن پڑھتا رہتا ہوں، لکھتا رہتا ہوں اور ان تحریروں کو شائع کرواتا رہتا ہوں۔'' (مولانا ابوالکلام آزاد: فکر وعمل کے چند زاویے، ص ۱)

اس کتاب میں شامل ''مولانا آزاد اور الندوہ''، ''قول فیصل جدوجہد آزادی کی ایک تحریر'' مضامین اپنے متون کے اعتبار سے تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں۔ان کا مقصد مولانا آزاد کی تعلیمات وافکار سے واقف کرانا ہے۔''مولانا آزاد کی افسانہ نگاری'' اور ''مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری'' میں مضمون نگار نے جدت پیدا کی ہے۔عنوان کی عمومیت سے پرے انہوں نے وہ نکات ابھارے ہیں جس طرف نظر کم جاتی ہے اور جب علم ہوتا ہے تو اپنے مطالعے کو دہرانے کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔یہاں میں خاص طور سے ''مولانا آزاد قرآن اور سائنس'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔اس وقیع مضمون کو حوالہ جات سے مزین کرتے ہوئے نتیجہ برآمد کرتے ہوئے پروفیسر وہاب قیصر لکھتے ہیں:''......مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں تفسیر کے لئے کئی ایک مقامات پر سائنسی حقائق کو پیش نظر رکھا ہے۔لیکن قرآن اور سائنس کے درمیان قرآن ہی کو اساس درجہ عطا کیا ہے اور سائنسی تحقیقات کی حاصلات کو مباحث میں صرف ضمنی مقام دیا ہے۔'' (مولانا ابوالکلام آزاد فکر وعمل کے چند زاویے، ص ۱۱۴)

''ترجمان القرآن کی چند لفظیات تعبیرات اور تشریحات کا مطالعہ'' لفظ ومعنی کی فکر انگیزی سے عبارت ہے۔ اسی طرح کتاب میں شامل تمام مضامین میں مولانا آزاد کے تعلق سے کارآمد بحث ومباحثے کا اشاریہ موجود ہے۔

اردو میں لکھے جارہے سیکڑوں ادبی مضامین قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کیا جدید علوم وفنون سے متعلق تحریروں سے ہمارا دامن خالی تو نہیں؟ یا ادب کا مطالعہ سائنسی نہج پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔تو اس جانب اپنی خدمات پیش کرنے والوں میں ایک اہم اور معتبر نام ڈاکٹر وہاب قیصر کا ہے جنہوں نے اپنی بے پناہ علمی صلاحیت سے اردو کے دامن کو نئے رنگوں سے سجایا ہے۔

مذکورہ کتابوں کے مطالعے سے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر وہاب قیصر نے مولانا ابو الکلام آزاد کے بالواسطہ مطالعے سے اس جواہر پارے کی دریافت کی ہے جس سے نکلنے والی شعاعیں تادیر اردو زبان وادب کو نیا رنگ وآہنگ دیتی رہیں گی۔مولانا آزاد کے تعلق سے ان کے افکار وخیالات نوجوان نسل کو آزاد سے واقف کرانے میں معاون ہوں گے، خاص طور پر سائنسی افکار کی گہرائی وگیرائی اہل علم ودانش کو فیضیاب کرتی رہیں گی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے رمز شناس کے طور پر ڈاکٹر وہاب قیصر کا مقام ومرتبہ بلند تر ہوتا جائے گا۔

☆☆☆

شکیل احمد سلفی، مدیر ''الہدیٰ'' لہریا سرائے، دربھنگہ۔۸۴۶۰۰۱ (بہار)

وہاب قیصر کی غالب شناسی

(ادب میں نئے افق کی تلاش)

ڈاکٹر وہاب قیصر کا تعلق سائنس سے ہے اور بحیثیت سائنس داں ان کا ذہن اور فکر حساس ہے۔ یہی حساسیت انہیں زندگی کے ہر پہلو میں سائنس کی جلوہ گری محسوس کراتی ہے۔ ادب اور سائنس دو الگ الگ موضوع ہیں اور ان کی راہیں بھی الگ الگ ہیں۔ لیکن ان کے درمیان ایک قدر مشترک ہے کہ سائنس میں بھی حساس ذہن و دل چاہئے اور ادب بھی حساس ذہن و دل کا نتیجہ ہے۔ سائنس میں خیر اور حسن کی تلاش ہوتی ہے تو ادب میں حسن اور خیر تلاش۔ وہاب قیصر نے ادب میں بھی سائنس کی جلوہ گری محسوس کی اور ادب کو ایک نیا افق عطا کیا ہے، لیجئے انہی کی زبانی سنئے:

''سائنس اور غالب! جی ہاں!! عنوان بھی نیا ہے اور موضوع بھی۔ سائنس سے حد درجہ دلچسپی نے ہر واقعہ کو سائنس کے تناظر میں دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے، بلکہ تمام مظاہر قدرت میں پوشیدہ سائنسی رموز بخود نظر آجاتے ہیں۔ یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ جس کا جو علم و فن سے تعلق ہوگا ہر ایک میں اس کو وہی نظر آئے گا۔ چاہے عمومی طور پر وہ اس سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ نظر آتا ہو۔ اب مرزا غالب ہی کو لیجئے جو انیسویں صدی کے مایہ ناز شاعر گذرے ہیں بظاہر ان کا فن ظریفانہ، شوخیانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ شاعری پر محیط ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں ہمیں سائنس کی پردہ دری نظر آتی ہے۔ ان ہی تمام خصوصیات کی بنا پر وہ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے شعر و ادب کی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔''

یہی وہ احساس ہے جس کے نتیجہ میں انہوں نے ایک ایسے شاعر کے کلام میں جس میں شعری صداقتیں اور ادب کی اپنی ادبی روایتیں بلند ارتقائی صورت میں کارفرما ہیں، سائنس کی جلوہ گری محسوس کی ہے اور اس میں اپنی تخلیقی ذہانت اور ذہن رسا سے نئے نکتے تلاش کیے ہیں۔

شاعر کا دل حساس ہوتا ہے، وہ زندگی کی دھڑکنوں اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی حالتوں اور کیفیتوں کو دوسروں سے کہیں زیادہ محسوس کرتا ہے۔ غالب جیسا حساس اور باشعور شاعر جس نے زندگی کو دیکھا اور پرکھا تھا، کہیں اپنی تمام تر کوششوں سے زندگی کو رام کیا تھا تو کہیں اس کے ہاتھوں اسے مجبور ہونا پڑا تھا، بھلا زندگی کی اس نئی روشنی سے کیوں کر ناواقف رہ سکتا تھا جس کی ایک کرن ہندوستان میں ابھی ابھی چکی تھی۔ جس سے ایک طبقہ ہراساں تھا تو دوسرا حساس اور دور رس طبقہ ایک نعمت سمجھ رہا تھا۔ جس کا ذہن جتنا بالیدہ اور فکر جتنی پختہ تھی اس نے اس نئی روشنی کے رموز سے اسی قدر آگاہ ہونے کی کوشش کی۔ غالب کھلے ذہن کے آدمی تھے، حساس دل رکھتے تھے اور تخیل کی بلندی پائی تھی اس لیے اس نئی روشنی کی اہمیت کا بھرپور احساس کیا۔ انہوں نے سائنسی صداقت کو اپنے مشاہدہ اور تجربے سے ہم آہنگ کر کے شعری صداقت کے روپ میں اس طرح ڈھال دیا کہ ہر کسی کے لئے یا کم از کم سائنسی اصولوں سے

نا آشنا ذہن کے لئے وہاں تک پہنچنا محال ہوگیا۔ چونکہ شعری صداقت اور سائنس کی صداقت میں فرق ہے۔ ضروری نہیں کہ شاعری کی صداقت سائنس کی صداقت میں فرق ہے۔ ضروری نہیں کہ شاعری کی صداقت سائنس کی صداقت کے اصولوں پر کھری اترے اس کے بغیر بھی وہ ایک مسلم صداقت رہتی ہے۔ اس لیے نقادوں نے اس جانب شعوری طور پر توجہ نہیں کی اور اکثر بقول وہاب قیصر ممنوعہ سمجھ کر اس سے دور بھاگتے رہے۔

غالب کے کلام کی معنوی تہ داریوں میں اس رنگ و روشنی کو محسوس کرنے کے لئے جس نگاہ تیز بیں کی ضرورت ہے وہ وہاب قیصر کے ہاں پائی جاتی ہے۔ جس میں ان کی سائنسی حس اور ادبی ذوق اور تخلیقی اپج کو دخل حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے اسی تخلیقی شعور کے ساتھ غالب کے کلام کا جو مطالعہ کیا ہے وہ غالب شناسی میں ایک نیا باب ہے جس نے کلام غالب کو ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ دیکھئے غالب کے وہ اشعار جن کو ہم اس کے ادبی سیاق میں پڑتے تھے وہاب قیصر کے ہاں کیا معانی اختیار کرر ہے ہیں:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

وہاب قیصر لکھتے ہیں: ”رات میں آسمان میں جھلملانے والے بے شمار تارے ظاہری جسامت اور روشنی میں اصل سے مختلف نظر آتے ہیں۔ سادہ آنکھ سے دیکھنے پر اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کون سے ستارے ہیں اور کون سیارے۔ چند ستارے، بہت دھندلے نظر آتے ہیں ور چند سیارے اتنے منور دکھائی دیتے ہیں کہ ہم انہیں ستارے سمجھ بیٹھتے ہیں۔ Delta ایک ایسا ستارہ پھیلتے اور سکرتے رہتے ہیں اور دیکھنے میں سیارے جیسے لگتے ہیں۔ سیارہ مشتری اور سیارہ زہرا اتنے زیادہ منور نظر آتے ہیں کہ ان پر ستاروں کا گمان ہوتا ہے۔ سیارہ مریخ اور سیارہ روز حل میں ستاروں جیسی چمک نظر آتی ہے۔ غالب نے ستاروں اور سیاروں کے مختلف نظر آنے کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا ہے۔“

اسی طرح یہ شعر دیکھئے کیا معنویت اختیار کرر ہا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادی پیمائی

”ڈرائیور نشے کی حالت میں موٹر گاڑیاں تیز رفتار سے چلاتے ہیں جو اکثر ان کے کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہے اور حادثات رونما ہوتے ہیں۔ یہی وجہ کہ نشے کی حالت میں موٹر گاڑیاں چلانا قانوناً جرم قرار دیا جاتا ہے۔ جب کسی مقام پر کوئی تیز رفتار گاڑی گذرتی ہوئی نظر آتی ہے تو ٹریفک پولیس کو اس بات کا شبہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ڈرائیور شاید نشہ کی حالت میں ہو۔ اس بات کی تصدیق کے لئے پولیس کے عہد یدار فارمنگ سائنس کے ایک آلہ Breath Analyser سے مدد لیتے ہیں۔ اس تصدیق میں یہ آلہ سائنس کے ذریعہ چھوڑی گئی ہوا کو حاصل کرتا ہے اور اس ہوا کی پیائش کرکے یہ بتلاتا ہے کہ آیا اس میں شراب کے بخارات ہیں یا نہیں؟ اگر ہوا میں شراب کے بخارات شامل رہیں تو ڈرائیور کا حالت نشہ میں ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالب کا یہ شعر Breath Analyser کی کارکردگی سے مطابقت رکھتا ہے۔“

وہاب قیصر نے غالب کے تقریباً 166 اشعار کی علم ہئیت، کیمیا، حیاتیات اور فلکیات وغیرہ کے اصولوں کی بنیاد پر پرکھتے ہوئے اسی طرح کی سائنسی معنویت عطا کی ہے۔ تخلیقی استعارے عہد بہ عہد اپنی معنویت بدلتے رہتے ہیں اور ہر عہد کا انسان اپنے ماحول کے اعتبار سے شاعری کو اپنا معنی عطا کرتا ہے۔ وہاب قیصر کے نئے انداز فکر اور نئی سائنٹفک تنقید سے ہماری شاعری اور اس کے نظام بلاغت کو معانیات کی ایک نئی کائنات ملے گی اور اردو تحقیق اور تنقید کے لئے نئے ابعاد دریافت ہوں گے۔

اس وقت ہمیں غالب کے وہ مصرعے جو اتفاق سے غالب کی پہلی غزل کا پہلا مصرعہ اور آخری غزل کا آخری مصرعہ ہے بہت یاد آرہے ہیں جو شاید غالب جیسے انانیت پسند اور دورس شاعر کے شعری مزاج اور ادبی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ جس کو یہ اندازہ تھا کہ اس کے کلام کی رنگارنگی مستقبل میں کیا کیا رنگ دکھائے گی۔

''نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا'' اور ''صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے''

اگر اس وقت غالب ہوتے تو شاید یہ نہیں کہتے کہ ''یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات'' اور ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور''

☆☆☆

گلشن کھنہ، لندن

دوہا سنسار کا مہا کوی: ودیا ساگر آنند

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند اردو کے ایک ممتاز اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ان کے چھپے شعری مجموعے" دوہا رنگ" کو پڑھنے کی مجھے سعادت حاصل ہوئی ہے۔ان کا یہ شعری مجموعہ عام شعری مجموعوں سے بالکل الگ ہے۔اس میں ان کی غزلیں۔نظمیں یا رباعیات نہیں بلکہ اردو کے ایسے خوبصورت دوہے شامل ہیں جن سے ان کی شاعری میں زبان کی تازگی اور تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے اور ان کے یہ بے مثال اور معیاری دوہے پڑھ کر قاری کے دل کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔

دوہا سنسکرت زبان کے لفظ" دوگدھک" سے اخذ کیا گیا ہے اور اپنے لمبے ادبی سفر میں مختلف ناموں دوہرا۔دو پداس۔دوہی۔دو ہک دہا۔دہرا اور دوہ جیسے ناموں سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔قدیم ہندی ادب میں دوہا نہ صرف مختلف ناموں سے پہچانا گیا بلکہ یہ مختلف اوزان اور آہنگ میں بھی لکھا جاتا رہا تھا۔پھر مختلف ہندوی زبانوں میں ہجرت در ہجرت کرتے ہوئے اردو زبان میں آیا تو ہر اعتبار سے ایک صنف کی حیثیت اختیار کر گیا اور اپنی صنفی خوبی اور خوش آہنگی کے باعث اس نے اردو کے بیشتر شعرا کو اپنا گرویدہ بنا لیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر ہندو پاک کے معیاری رسائل کی زینت بڑھانے لگا۔یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو شعرا کا ایک طبقہ جہاں ہائیکو۔ثلاثی۔ترونی اور ماہیے جیسی جدید ترین اصناف سے اپنی دلچسپی کا عملی اظہار کر رہا ہے وہیں دوہا جیسی قدیم صنف سخن کو بھی ازسر نو شاعری کے تحقیقی مزاج کا حصہ بنانے کے لیے کوشاں ہے۔اردو شاعری میں دوہا ایک ایسی صنف ہے۔جس نے ہر دور میں ہندوستان کی کثیر الاستعمال عوامی زندگی کی نمائندگی کی ہے۔اردو دوہوں کی زبان میں تدریجی ارتقا ہندوستان کی عوامی زبان کے ارتقا کی تاریخ کا مواد فراہم کرتا ہے۔یہی وہ زبان ہے۔جس کو اپنے عہد کے عوام نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور سمجھا۔سادھوؤں سنتوں اور صوفیائے کرام کا واسطہ عوام سے تھا اسی لیے انہوں نے اپنی تعلیم اور خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے ایک اسی زبان کا سہارا لیا۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوہا ادب کی ایک ایسی صنف سخن ہے۔جو دو مصروں پر مبنی ایک ماترائی چھند ہے مگر اس کی خصوصیت اس کا عروضی ڈھانچہ ہے اور اس کی ہئیت موسیقی کے اصولوں پر ترتیب دی گئی ہے۔انہیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معروف دوہا نگار ڈاکٹر فراز حامدی نے یہ دوہا کہا تھا: تیرہ گیارہ ماترا، بیچ بیچ وشرام دو مصروں کی شاعری، دوہا جس کا نام

یعنی دوہے کی تشکیل دو مصرعوں میں کھل جاتی ہے اور ان دو مصروں کو بھی دو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے گویا کہ ایک دوہے کے کل چار حصے ہوتے ہیں۔اس کے پہلے اور تیسرے حصے میں تیرہ ماترائیں اور دوسرے اور چوتھے حصے میں گیارہ ماتیرائیں لائی جاتی ہیں اور درمیان میں وشرام یعنی وقفہ ہونا ضروری ہے۔" دوہا ایک لوک شعری صنف ہے۔جس کے فروغ میں صوفی شعرائے کرام کی خدمات قابل قدر رہی ہے۔انہوں نے اس صنف کو

اپنی پیغام رسانی کے لیے چنا اور اسے عوام الناس میں مقبول اور ہر دلعزیز بنادیا۔"

جدید دور کے اردو شعرا متذکرہ قدیم وجدید اصناف میں کامیابی کے ساتھ نئے مسائل حیات بھی پیش کر رہے ہیں۔ روایتی طور پر دوہا پند وموعظت۔ اخلاق، انسانی اقدار، روحانی رفعت اور عمیق فلسفیانہ موضوعات کے لیے مخصوص رہا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی ہے۔ وقت حالات اور زبان کی کلچرل تبدیلیوں کی وجہ سے اس میں عشقیہ، سیاسی اور جدید تر سائنسی موضوعات کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور آج صورت حال یہ ہے کہ دوہا تمام تر موضوعات کا درپن بن گیا ہے اور اس میں مخصوص مذہبی معتقدات بھی آسانی سے پیش کئے جانے لگے ہیں۔ ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے دوہوں کا مجموعہ "دوہا رنگ" کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے شاعری کی دوسری اصناف سخن کی طرح دوہا نگاری پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے خوبصورت دوہے تحریر کیے ہیں جن کی زبان آسان، صاف اور ستھری ہے اور ان دوہوں میں فکر وخیال کی تابانی، اظہار و اسلوب کی تازہ کاری اور نئے عصری تقاضوں کی وہ چمک دمک بھی ہے جو تخلیق کار اور تخلیق کو اعتبار اور امتیاز بخشتی ہے۔ آنند صاحب کے چند پر وقار دوہے ملاحظہ فرمائیں:

پاتا ہے وہ زندگی، بڑھتی اس کی شان
کرتا ہے جو پیار میں، اپنا جیون دان

انسانوں کی بھیڑ میں، ملتے ہیں دو چار
سچا مخلص ہے وہی، چاہیں جس کو یار

ہوتی ہے اس شخص کی دو کوڑی اوقات
پر نندا جو بھی کرے، ہوتا ہے بدذات

دنیا کو تو کام ہے، دینے دے دشنام
کریوں ہی تو رات دن بس نیکی کے کام

ہوتا ہے بد کام سے، ہر کوئی بدنام
اچھے کاموں کا ملے، اچھا ہی انعام

نفرت کے اب دیکھ لو، آنکھوں میں ہیں رنگ
انسانوں میں آگئے حیوانوں کے ڈھنگ

ہمت کر کے دیکھئے، بن جائیں گے کام
غفلت، سستی، کاہلی، کرتی ہے ناکام

آنند صاحب کے ان دوہوں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے معاشرے، ماحول اور اپنے اطراف و اکناف میں پیش آنے والے عصری حالات وحادثات اور عوام کو پیش آنے والے مسائل ومشکلات کا بھی گہرا شعور رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کو اپنے ان تجربات سے آشنا کرتا ہے۔ جس میں دنیاوی فلاح اور کچھ روحانی طمانیت کا زاویہ موجود ہے مگر لوبھی اور خود فراموش انسانوں نے جسے نظر انداز کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ودیا ساگر آنند کے دوہوں میں بھی نروان پالینے والے اس انسان کی آواز موجود ہے۔ جس کے باطن میں صدیوں سے زمینی اور حقیقی تجربات سمائے ہوئے ہیں اس لیے شاعر اپنے معاشرے کے عوام سے دوہے کی زبان میں مخاطب ہے۔ دراصل دوہا رنگ اس سماجی فریضے کو ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو بھگت کبیر، بابا فرید اور بلھے شاہ جیسے شعرا نے اپنے عہد میں ادا کیا تھا اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو سالک حیات بنانے کی کوشش کی تھی۔

غزل کا مطلع ہو یا گیت کا مکھڑا ہو یا کوئی دوہا اصل میں یہ سب شاعر کے اظہار ذات کا آئینہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند نے اپنے دوہوں کو اتنی چابکدستی اور خوبصورتی سے تراشا ہے کہ ان کی دوہا نگاری میں مجھے تخلیقی کیفیت کی مسحور کن روانی نظر آتی ہے۔ وہ اپنے دوہے تحریر کرتے وقت جذبے کی بے رواں لہر میں اتنے مست ہو جاتے ہیں کہ ان کے دوہے کیف مسلسل کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ انہوں نے ارضی، سماجی اور تہذیبی زاویوں کو بھی اپنے دوہوں میں بڑی عمدگی سے پیش کر کے انسان کو پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کا درس دیا ہے۔ اور جب وہ روحانی زاویے کی طرف دھیان دیتے ہیں تو ان پر حمدیہ اور نعتیہ دوہے بھی نازل ہونے لگتے ہیں۔ ان کے حمدیہ دوہے بھی چوبیس (۲۴) ماتراؤں میں ہی تخلیق کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے چند حمدیہ دوہے ملاحظہ فرمائیں:

کافر ہو کہ دہریا، چاہے ہو دیں دار ۔۔۔ دیتا سب کو رزق ہے سب کا پالنہار
واحد اس کی ذات ہے یکتا اس کا نام ۔۔۔ دوئی سے اور شرک سے، اونچا اس کا کام
ہر دم تیرا ذکر ہو، گزریں یوں دن رین ۔۔۔ یارب تیری حمد سے، ملتا ہے سکھ چین
تو ہے سب سے مہرباں، رحمت تیری عام ۔۔۔ جو دو بخشش اور عطا، تیرے ہی اُپ نام

ان دوہوں میں اپنے پختہ ایمان کے ساتھ ڈاکٹر آنند خدا کی ذات کے بڑے قائل نظر آتے ہیں اور بڑے سیدھے سادے ڈھنگ سے اپنے دل کی بات دوہوں کے ذریعہ کہہ دیتے ہیں اور دل سے نکلی ہوئی بات ہر قاری کو ضرور متاثر کرتی ہے۔

اب تک اردو میں لکھے گئے دوہوں کا شمار ممکن نہیں۔ تمام دوہا نگاروں نے اس صنف کو اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق استعمال کیا ہے۔ اخلاقیات اور پند و نصائح کے ساتھ ساتھ ارضیت بھی دوہے کے مزاج میں شامل رہی ہے۔ ڈاکٹر ودیا ساگر آنند ایسے حساس شاعر ہیں جو ہمہ اقسام کے موضوعات کو دوہا کے پابند صنفِ سخن میں پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور ان کے یہاں دوہوں کا مخصوص ڈکشن اپنے سارے تخلیقی لوازمات کے ساتھ موجود ہے۔ انہوں نے اتنے خوبصورت دوہے تحریر کئے ہیں اور ان کے موضوعات اتنے متنوع اور رنگا رنگ کے ہیں کہ انہیں دوہا سنسار کا مہاکوی کہنا غلط نہیں ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر آنند کے دوہوں کا یہ شاندار اور باوقار مجموعہ ''دوہا رنگ'' بین الاقوامی سطح پر قبولیت اور مقبولیت حاصل کرے گا اور دوہے کے اتہاس میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

☆☆☆

رفعت سروش مرحوم

صوفیا انجم تاج کے نام

محترمہ صوفیہ انجم تاج صاحبہ! آداب

میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی نہایت خوبصورت کتاب مجھے عنایت کی، جو محض طباعت کے اعتبار سے ہی خوبصورت نہیں ہے، بلکہ اپنے موضوع اور بیان وزبان کے اعتبار سے بھی خوبصورت ہے۔ آپ نے اسے اگر چہ خودنوشت کا نام دیا ہے، مگر خودنوشت سے زیادہ حدیث دیگراں ہے، مگر ہر منظر کے پس منظر میں آپ کی شخصیت کا احساس ہوتا ہے اور وہ ماحول آئینہ ہو کر سامنے آجاتا ہے، جس میں آپ کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔

میں نے گذشتہ دنوں خواتین کی خودنوشتوں پر کام کیا تھا اردو میں خودنوشتوں کا سلسلہ ۱۹۸۰ء کے آس پاس شروع ہوا اور پھر تو ایک بہار سی آگئی۔ صالحہ عابد حسین، ادا جعفری، سعیدا حمد، کشور ناہید، سالم ان سب کی خودنوشتوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ اپنے بچپن کے ماحول اور پابندیوں سے نالاں ہیں، جو ان کے بڑوں نے ان کے لئے روا رکھیں۔ بیان اور تحریر سب کا الگ الگ ہے، مگر شکوہ ایک ہی جیسا ہے ظاہر ہے آزادی کے بعد ماحول بدلا اور ذہنوں میں کشادگی آئی اور ان سب خواتین نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ..... سے انجام دیے۔

"یادوں کی دستک" کی مصنفہ اس ذہنی گھٹن کا شکار نظر نہیں آتیں۔ جن سے عام طور پر خواتین افسانہ نگار اور شاعرات دوچار رہی ہیں۔ گویا اس نسل کے بعد آپ کی خودنوشت ایک نیا منظر نامہ پیش کرتی ہے اور یہ ایک مثالی خودنوشت ہے جس میں حالات کا رونا نہیں رویا گیا ہے، دراصل یہ زمانے کا فرق ہے نئی نسل ایک نئی دہائی کی تخلیق بھی ہے اور خوبصورت کتاب میں ناول نگاری کا حسن ہے، جس ماحول کی آپ نے عکاسی کی وہ ہمارے ملک میں بیسویں صدی کے نصف اول کا ماحول ہے مسلم گھرانوں کا۔ ایسے گھرانے جہاں جاگیرداری نے فکر معاش کم ہے اور جہاں بہ ظاہر غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گھر کے نظم ونسق میں خواتین کی عملداری رہی ہے اور جہاں عورت اپنی آغوش میں ایسے بچے پروان چڑھاتی ہے اور ملی اور ملکی اقتدار کا پاس رکھتے ہیں اور جن کا مسلک خدمت خلق ہے۔ جنہیں دولت کی فراوانی سے نہیں بلکہ عبادت سے سکون ملتا ہے۔

آپ کی اس کتاب میں کردار نگاری ایسے عروج پر ہے، انداز بیان سادہ، حقیقت نگاری کی مثال ہے۔ یہ کتاب قاری کے ذہن و دل پر چھا جاتی ہے اور ہم تھوڑی دیر کو خود کو اسی ماحول میں محسوس کرتے ہیں۔ جہاں گوری نانی ہیں جہاں عزیز ہے ار جہاں کئی اور نانیاں ہیں جو دراصل استعارے ہیں مسلم گھرانوں کی اس تہذیب کے جو آج معدوم ہوتی جارہی ہے۔ آج صوفیہ انجم تو پیدا ہو سکتی ہیں مگر۔ سفید ساڑی میں لپٹا ہوا نانی اماں کا سراپا، ان کی مسکراہٹ ان کی چیخ وپکار اور ڈانٹ ڈپٹ واپس نہیں آسکتی۔ مشینی دور اور مغرب کی چکا چوند نے عشق کی سادگی اور روحانیت کو چٹ کرلیا ہے۔ یہ بہت غنیمت ہے کہ آپ کے ذہن نے اس ماحول کو اپنے نہاں خانوں میں محفوظ رکھا اور آپ کو وہ الفاظ مل گئے کہ جو ماحول حرفوں میں ڈھل کر محفوظ ہوگیا۔ آپ شاید ایسا اس لئے کرسکیں کہ آپ کا ذہن

ایک عورت کا ذہن ہے جو تصویروں کی نگیٹیو غیر محسوس طور پر محفوظ رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اس کے پوزیٹیو بنالیتا ہے یہ تحریر دراصل وہی پوزیٹیو ہیں، وہی تصویریں ہیں جو تحریر میں بنائی گئی ہیں۔ اور چونکہ مصوری اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے آپ کی نثر میں روانی اور فصاحت کے ساتھ شاعری اور مصوری کی آمیزش ہے۔ شاعری اور مصوری کا یہ امتزاج بہت کم دیکھنے کو آتا ہے۔ آپ کا مشاہدہ قابل رشک ہے اور اس پر مستزاد حسن بیان۔

کسی بلند مرتبہ پر پہنچ کر عام لوگ اپنے پرائے رشتہ داروں اور گاؤں اور قصبوں میں پڑے لوگوں کے لئے ایسا رویہ رکھتے ہیں جسے ''روکھے پن'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ خود برتر سمجھنے لگتے ہیں اور جو کسی وجہ سے ترقی کے زینے طے نہیں کر سکے ان کو کمتر۔ حالانکہ ان کی کمتری اس ماحول کی دین ہوتی ہے جسے صدیوں کی سماجی پسماندگی اور غریبی نے جنم دیا ہے اور جس سے نکلنا جہادِ عظیم ہے جو ہر ایک کے بس کا نہیں۔

آپ نے اپنے رشتہ داروں کو ان کے ماحول کے حساب سے دیکھا ہے اور اس روایت کے باعث آپ کی اس خودنوشت میں ذاکر جیسا کمزور مگر دراصل بہت طاقت ور کردار آپ نے ذاکر کی مصوری میں آپ کے قلم کا جادو کیا ہے، کیا کیا گوشے نکالے ہیں۔ اس کی سادگی کو من وعن بیان کر کے آپ نے بغیر الفاظ کے یہ کہہ دیا ہے کہ:

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

آپ کی اس ماڈل نما خودنوشت میں کرداروں کا نگار خانہ ہے، کس کس کردار کا ذکر کیا جائے اور آپ کے حسن تحریر کا کہاں تک اس خط میں تجزیہ کیا جائے۔ آپ نے اپنی چابک دستی سے اپنے آپ کو پس الفاظ چھپائے رکھا ہے۔ کبھی کبھی ظاہر ہوتی ہیں اپنی بہنوں کے ساتھ، یا کالج میں قوالی اور تمثیلی مشاعرہ کرنے تک، کہیں یہ شیخی نہیں بگھاری کہ میں یوں ذہین طالبہ تھی، یوں مصوری سیکھتی تھی، یا یوں میرے اردگرد شائقین کا ہجوم رہتا تھا یا میں بہت ہم چشموں میں یوں امتیازی شان رکھتی تھی، یا یوں شادی..... شخص سے ہوئی جو ہزاروں میں ایک ہے، یا میں نے سات سمندر پار جا کر یوں تیر مارا وغیرہ وغیرہ۔ کتاب پڑھتے پڑھتے آپ سے ملنے کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے، پھر کہیں امریکہ جا کر کچھ..... نظر آتے ہیں، عروج وشہرت کی یہ منزلیں کیسے سرکیں، اس کا سراغ نہیں ملتا، اگر چہ یہ سب بھی ضروری ہے ایک خودنوشت کے لئے ایک اور اہم بات کتاب کے باب پانچ میں بر سبیل تذکرہ اپنے خاندان کے معززین کا تذکرہ بہ حسن وخوبی کر دیا مگر اس انداز سے نہیں کہ ''پدرم سلطان بود'' یہ بھی سیر چشمی اور خوداعتمادی کی بات ہے۔

وہ جو بچھڑ گئے ان کی جدائی پر خون کے آنسو بہائے ہیں اس کتاب میں کتنے ہی جنازے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ہر موت کے ساتھ لکھنے والا خود بھی موت کے قریب تک گیا ہے۔

کتاب کی نثر اتنی خوبصورت ہے کہ اس میں شاعری ''پیوند'' معلوم ہوتی ہے اگر یہ پیوند کم لگائے جاتے تو اچھا تھا، ادھر ادھر کے شعرائے کرام کا تذکرہ ویگر جو محترم ہیں، مگر اس خودنوشت میں ان کا تذکرہ خودنوشت کی روانی کو روکتا ہے (اس کا کیا کیا جائے کہ مصنفہ مصور ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرہ بھی ہے۔)

ایک اہم مسئلہ جس کی طرف یہ خودنوشت متوجہ کرتی ہے، وہ ہے آزادی کے بعد علماء کے ترک وطن کا مسئلہ

، برصغیر میں یہ مسئلہ کروڑوں مسلمانوں کی سماجیات سے جڑا ہوا ہے، برصغیر ہند تقسیم سے قبل ایک جسم کی طرح تھی اور جسم کے کسی ایک حصہ میں اگر کانٹا بھی چبھ جائے تو پورا بدن درد محسوس کرتا ہے، مشرقی تہذیب میں خاندان بھی بہ منزلہ ایک جسم کے نہیں۔ تین سو سال کی غلامی کے بعد ہندوستان کو برطانوی سامراج نے اپنے چنگل سے چھوڑا تو اس طرح کہ اپنی سفاک تلوار سے اس جسم ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ ہمارے خود غرض رہنماؤں نے بھی اس سیاسی تلوار کی خطرناکی کو اس وقت نہیں محسوس کیا جس کے زخم صدیوں میں بھی مندمل نہیں ہوں گے اور جن خاندانوں پر یہ تلوار ستم ٹوٹی ان کے آنسو صدیوں تک خشک نہیں ہوں گے، اس لئے کہ کوئی بھی جراح ان کی پیوند کاری نہیں کر سکتا کیونکہ یہ زخم جسم کے نہیں روح کے زخم ہیں۔

اس تناظر میں صوفیہ انجم تہاری، بہن کا کردار اس مظلوم قوم کی بے بسی کا استعارہ ہے اور ایسی کتنی بہنیں اس آئینہ میں نظر آتی ہیں۔ شادی کے بعد وہ مجبور لڑکی پاکستان چلی گئی، تم نے اپنی والدہ کے ساتھ اپنی صعوبتوں کا حال جامعیت کے ساتھ لکھا ہے، پھر وہ اعزا سے ہندوستان ملنے آتی جاتی رہیں، مسلمانوں کے جگر گوشوں کو ایک دوسرے سے اس طرح دور کر دیا کہ ان کے روز و شب میں غم مفارقت کا کانٹا پیوست ہو گیا، اور ادھر سب ماتھے پر مہاجر کی سلپ لگا دی گئی، اس نازک مرحلہ میں....لگا مگر میں کچھ نہیں کر سکی، مہاجر آج تک عزت نہیں پا سکا جو ایک ملک میں اپنے شہریوں کو ملتی ہے اور کیا یہ ستم تقسیم وطن کا نہیں ہے، صدیوں سے اپنی زمینوں کا دودھ پینے والے جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کو بھی اپنی آبائی زمینیں، گھر، حویلیاں اور جائدادیں چھوڑ چھاڑ کر لندن اور امریکہ کا رخ کرنا پڑا اور آبائی وطن اس کے خواب ہو کر رہ گئے، یہ ستم ہندوستان کے نیشنلسٹ مسلمانوں پر بھی روا رکھا گیا اور مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق تلاش معاش میں آپ کا خاندان بھی زیادہ تر امریکہ میں جا بسا۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے خواب آپ کی خودنوشت میں موجود ہیں جو اس کتاب کا اہم حصہ ہیں۔

ہاں ایک بات اور ہندوستانی مسلمانوں کو خصوصاً امریکہ اور دوسرے یوروپی ممالک (آپ کے حوالے سے لندن) میں بسنے اور نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کی جھلکیاں بھی اس کتاب میں ہونی چاہئے تھیں۔

بہر حال یہ فوری تاثر ہے جو میں نے رقم کیا ہے، یہ کتاب ایک بھرپور مقالے کی متقاضی ہے جس میں اقتباسات بھی ہوں اور آپ کی خوبصورت اور محاکاتی عبارت بھی ہو۔ ویسے یہ بھی کیا کم ہے کہ آپ امریکہ میں رہ کر اتنی اچھی اور بامحاورہ اردو لکھ رہی ہیں اور....یہ کہ آپ کا اپنا Sniiijes مصوری ہے، مبارک ہو آپ کی تصویریں ایک اہم نگارخانے میں مستقل نمائش کے لئے منظور کر لی گئیں۔ اور اب آپ کی مصور کتاب مع شاعری کے شائع ہو رہی ہے، "پرواز" کا نمبر میری نظروں سے گذرا نہیں ورنہ لطف اٹھاتا۔

میں نے غیر شعوری طور پر ایسی نظمیں کہی ہیں جو مصورانہ ہیں، اگر آپ ایسی نظموں کا انتخاب کر کے ان کو تصویروں میں ڈھال دیں (اگر اس قابل نظر آئیں) تو میں وہ کتاب شائع کر سکتا ہوں۔

ادھر تقریباً ایک ہفتہ سے آپ کی کتاب، میرے ذہن پر چھائی رہی اور اتفاق سے یوں اور نظمیں کہیں جو

و آپ کو فون پر سنائی بھی تھیں اور اب آپ کو بھیج رہا ہوں۔ طارق انور صاحب کی طرف سے کوئی شخص آیا تو میں اسے اپنی نثر کی دو تین کتابیں دیدوں گا۔ پتہ پتہ بوٹا بوٹا... زیروکس کرا کر رکھوں گا۔

آپ نے پوچھا تھا، میں کیا کرتا ہوں، زیادہ وقت تو پڑھنے اور قلم کاری میں گذارتا ہوں، پھر کتاب شائع کرنے کا شوق فضول پال رکھا ہے ابھی گذشتہ ماہ میرے منظوم ڈراموں اور.... کا کلیات آیا ہے۔ جہان رقص...جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اپنی غزلوں اور مختصر نظموں کی کلیات مرتب کرر ہا ہوں۔ مشاعروں اور سیمناروں میں جاتا ہوں، گذشتہ سال ایران اور سعودی عرب کے مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا، ہاں میں نے اپنی شکستہ پائی کو اپنی مجبوری نہیں بننے دیا اور خود کو معذور کہنے یا سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ویسے میں نہایت غیر شاعرانہ آدمی ہوں، یعنی مشاعروں والے سب کام نہیں کرتا (سوائے ناموں کے) شراب، پان، سگریٹ سے ہمیشہ دور رہا۔ میں مزید اپنے بارے میں کیا کہاں ہے ہی کیا بتانے کو، جو دل پہ گذرتی رہی اسے رقم کرتا رہا، کچھ نظم میں کچھ نثر میں۔ آیئے اب آپ کو وہ دو نظمیں سناؤں۔

میں ایک قانع آدمی ہوں۔ ۱۹۸۴ء کی جنوری میں ریڈیو کی ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا، ایک سال غالب انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر رہا، پھر طے کیا کہ کہیں نوکری نہیں کروں گا۔ بس اس فیصلہ پر قائم ہوں اور زندگی آرام سے گذر رہی ہے۔

والسلام

آپ کا مخلص: رفعت سروش

دو نظمیں انجم کے نام

☆ مصورِ حسن فطرت کے
سنا ہے، انگلیوں میں تیری جادو ہے
ترت احساس کی رگ رگ نکھر جاتی ہے، تیرے برش کی جنبش سے
رنگوں میں چمک اٹھتے ہیں سب سوئے جذبات
منہ سے بولنے لگتی ہیں تصویریں

☆ میری بھی ایک خواہش ہے
مری آواز جب پہنچے تیرے ذوق سماعت تک
بنا کر شوخ رنگوں سے مری آواز کا پیکر
اسے کر دینا آویزاں فضاؤں میں

(رفعت سروش)

☆☆☆

پروفیسر افتخار اجمل شاہین، کراچی (پاکستان)

''پشتارہ'': میری نظر میں

''پشتارہ'' شاہین صاحب کا پانچواں مجموعہ کلام ہے جو ابھی کچھ دنوں پہلے منظر عام پر آیا ہے۔اس سے پہلے ان کے جو چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے نام بالترتیب یہ ہیں: ''رگِ سازِ بے نشاں''، ''دہلیز پر پھول''، ''کھلا دروازہ''۔ پہلا مجموعہ کلام یعنی رگِ ساز مشرقی پاکستان میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد کے تین مجموعے کراچی میں شائع ہوئے۔کھلا دروازہ میری نظر سے نہیں گزرا اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ان کے علاوہ ان کی غزلوں اور نظموں کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور شائع بھی ہو چکا ہے۔شاہین نے ایک انگریزی رسالہ بھی کناڈا سے نکالا تھا جو کئی شماروں کے بعد بند ہو گیا۔

شاہین کئی دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ان کا کلام پاک و ہند کے ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ان کا شعری سفر پچاس سالوں پر محیط ہے جبکہ ان کے تصنیفی سفر کو بھی چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔

شاہین کا شمار جدید شاعروں میں ہوتا ہے۔اور بقول پروفیسر وہاب اشرفی ''دراصل جدیدیوں کی طرح شاہین بودلیر سے متاثر ہوئے تھے۔لہٰذا بودلیر کی نظموں کے پیٹرن پر نظمیں کہتے رہے۔'' اس سلسلے میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ انہوں نے اپنے مشرقی مزاج کو بھی برقرار رکھا۔بلکہ غزلوں میں جدت کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات کا احترام بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔طرح میں بھی غزلیں کہتے تھے ڈھاکے میں اکثر طرحی مشاعرے ہوتے تھے بالخصوص ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مکان پر ہر سال طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔جن میں شاہین بھی شرکت کرتے تھے۔غالباً ۱۹۶۶ء میں شادانی صاحب نے اپنے یہاں ہونے والے مشاعرے کا یہ مصرع طرح دیا تھا۔ مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے
اس طرح پر شاہین نے بھی غزل کہی تھی۔ان کا ایک شعر بہت مشہور ہوا وہ یہ ہے:

دیئے ہیں زندگی نے زخم ایسے
کہ جن کا وقت بھی مرہم نہیں ہے

بعد میں کراچی سے یہ آواز آئی کہ یہ شعر عبد اللہ علیم کا ہے اور علیم نے یہ شعر پہلے کہا ہے۔علیم کے شعر اور شاہین کے شعر میں معمولی سا فرق ہے۔اکثر مختصر، سہل اور رواں بحروں میں اس طرح کا توارد بھی ہو جاتا ہے۔اور میں اس سلسلے میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ شاہین کا شمار بھی سینئر شعراء میں ہوتا تھا۔

شاہین کا پہلا مجموعۂ کلام مشرقی پاکستان میں شائع ہوا اس مجموعے میں ان کے وہ کلام شامل ہیں جو انہوں نے ڈھاکا آنے سے پہلے اور قیام ڈھاکا کے دوران کہے تھے۔شاہین کا شمار جدید شعراء میں ہوتا تھا اور اب بھی جدید شعر کہنے والوں میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔مگر جس طرح بعض جدیدیت کے زیر اثر بعض شعراء نے لفظوں اور تراکیب میں توڑ پھوڑ کو جاری رکھا ہے اس کے مرتکب شاہین بھی ہوئے۔ڈھاکہ کے ایک نشست میں انہوں نے اپنی ایک نظم تنقید کے لئے پیش کی تھی۔جس میں زہریلی

کی جگہ انہوں نے زہری استعمال کیا تھا۔ اس پر میں نے اعتراض بھی کیا تھا۔ یہ سلسلہ تو ہنوز جاری ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلے ان کے فن یعنی ان کے ہنر کا ذکر ہو جائے۔ عیب ہا جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

شاہین نے جب سے شعر کہنا شروع کیا ان کا شاعری سے رشتہ ہمیشہ کا رہا اور شعر گوئی کا سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ شاہین نے کئی ہجرتیں بھی کیں۔ پہلی ہجرت بہار سے بنگال (ڈھاکہ) پھر ڈھاکا سے کراچی یعنی پاکستان اور پھر پاکستان سے کناڈا۔ اس طرح ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہجرتوں کی عکاسی بھی ہے یا ان کو عطائے سفر کہہ لیں۔

شاہین نے کئی اصناف میں شعر کہے ہیں۔ پابند نظمیں بھی کہی ہیں اور آزاد اور معریٰ نظمیں بھی کہی ہیں۔ انہوں نے ثلاثی بھی لکھے اور سانیٹ بھی کہے۔ مگر میں جب ان کے شعری مجموعوں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ نظم نگاری کی طرف ان کا رجحان غالب ہے اور غزل کے مقابلے میں یہ نظمیں زیادہ بہتر کہتے ہیں۔ ان کا پانچواں مجموعہ کلام پشتارہ تو ان کی نظم نگاری ہی پر مشتمل ہے یعنی یہ کتاب ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں مختلف موضوعات پر کہی گئی نظمیں ملتی ہیں۔ کچھ تو ان کے مشاہدات کی دین ہیں اور کچھ تجربات کی۔ بعض نظموں میں زندگی کے مختلف مسائل پر لکھا ہے اور بعض نظموں میں منظر نگاری اور علاقائی اثرات غالب ہیں۔

اس کتاب میں شامل جو پہلی نظم ہے اس کا عنوان ہے ''وہ گلی ہر شہر میں موجود ہے''۔ مگر اس کی وضاحت نہیں ہوتی کہ وہ گلی آخر کون سی گلی ہے یعنی نظم کے عنوان سے مناسبت نہیں ہے۔ پہلے مصرع میں چرچراتی سیڑھیوں کا ذکر ہے یعنی سیڑھی کے چرچرانے کی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔

دوسرا مصرع اس طرح ہے: اپنے کالے خون میں غلطاں تڑپتی فاختائیں

جو حقائق کی رو سے غلط ہے۔ خون سرخ ہوتا ہے نہ کہ سیاہ۔ ہاں سوکھ جانے پر خون کالا ضرور ہو جاتا ہے مگر اس مصرعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی پرندہ (فاختہ) خون میں غلطاں ہے یعنی فاختہ خون میں تڑپ رہی ہے۔

اس کے بعد ہی قاری کی نظر ان کی دوسری نظم یعنی گلاب بکف پر پڑتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک اچھی نظم ہے۔ زخموں کی برات بھی ایک اچھی نظم ہے مگر اس کا ایک مصرع ''ایک ہیں جنت اور دوزخ کے رستے'' پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ فراق نے ایک شعر میں بڑے پتے کی بات کہی ہے:

مجھے گمرہی کا نہیں کوئی خوف ترے گھر کو ہر راستہ جائے ہے

مگر شاہین کے مصرع پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ دوزخ اور جنت کا رستہ ایک نہیں بلکہ مختلف ہے۔

اپنی نظم ''ایک نظر'' میں شاہین نے ماخریاں اور لاس ویگاز کی نظر کشی کی ہے مگر جدیدیت کی غلط رو میں یہ بہہ گئے ہیں: ''بیل گاڑی میں سوار، آوارہ چاند

کناڈا میں بیل گاڑی نظر نہیں آتی۔ اور نہ تال کا استعمال درست معلوم ہوتا ہے۔ کہر آلود صبح میں شاہین کے محسوسات اور ان کے فکر کی اچھی ترجمانی یا عکاسی ملتی ہے۔ نمائش میں ایک نئے عزم اور سفر کا

ارادہ ملتا ہے اور بلا شبہ یہ ایک اچھی نظم ہے۔ سراب تحفظ میں بھی ایک ترکیب کھٹکتی ہے۔ یعنی '' چاندنی کے غزال آشنا ہاتھ میں ''۔ غزال آشنا آنکھ ہوسکتی ہے نہ کہ ہاتھ۔ میر کا ایک شعر ہے:

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا　　　وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

'' موسم کی وراثت '' ایک اچھی اور عمدہ نظم ہے۔ اس میں حقیقت بیانی بھی ہے اور گہرے مشاہدے کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

اس مجموعے میں '' بابری مسجد '' کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے مگر پوری نظم پڑھنے کے بعد کہیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نظم کا بابری مسجد سے کیا تعلق ہے۔ کوئی مصرعہ، لفظ یا حرف اس کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔

'' ایک تین عنوانات '' میں ایک تلخ حقیقت کی عکاسی ملتی ہے اس لئے یہ پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔

شاہین نے اپنی نظم '' گھر '' میں بے گھری اور ہجرت کی موثر اور عمدہ ترجمانی کی ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو کس عمدہ اور دل نشیں انداز میں پیش کرتے ہیں: ہم مکیں ہیں اس گھر کے / ربط گیا جو اندر سے / کشمکش ہے کچھ ایسی / دل ہی دل میں ڈرتے ہیں / لیکن اب بھی گھر والے / گھر سے پیار کرتے ہیں۔

شاہین ڈھاکے میں کئی سال رہے۔ ڈھاکے سے کچھ فاصلے پر ہی جہانگیر نگر آباد ہے۔ جہاں ایک یونیورسٹی بھی قائم ہے۔ اس لئے اس عنوان سے ایک اچھی نظم لکھی ہے۔ اسے ڈھاکے کی ایک اچھی تصویر کشی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں موسم کا بھی ذکر ہے اور مساجد کا بھی۔ بالخصوص بیت المکرم کا ذکر ہے۔ مگر شعری مجبوری کی وجہ سے شاہین نے '' بیت مکرم '' لکھا ہے۔ مگر آخری مصرع میں ڈھاکے کو صبح کے پاؤں میں بجتی ہوئی چھاگل کیا ہے۔ جو درست نہیں اس کی جگہ پائل کا استعمال مناسب تھا۔

نظم '' کرودھن '' میں کہتے ہیں: ہلالی شکل کے بدرنگ پیتل کے خلالوں سے، یہاں پر اس کی وضاحت ضروری ہے کہ خلال چاندی یا تانبے سے بنایا جاتا ہے۔ ایک نظم امرتا پریتم کی یاد میں ہے جس کا عنوان ہے 'امرتا پریتم' ، نظم اچھی ہے مگر ایک جگہ غلط قافیے کا استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ غلط لفظ کا استعمال کیا ہے کیونکہ اردو میں کوئی کفرانتی لفظ نہیں ہے۔ انہوں نے کفر سے کفرانتی بنانے کی کوشش کی ہے۔ جو از روئے قواعد غلط ہے۔ اس نظم کے پہلے شعر میں اس غلطی کا ارتکاب انہوں نے کیا ہے:

دل کے دھڑکن کے سب انداز و ادا جانتی تھی　　　درد کی نعمت عظمیٰ کو نہ کفرانتی تھی

آخر شعر اس طرح ہے:

زندگی اس کی ٹکٹ بھر ہی جگہ لے پھر بھی　　　اپنی شرطوں پر وہ جینے کا ہنر جانتی تھی

ٹکٹ ادھورا لفظ ہے۔ '' رسیدی ٹکٹ '' لکھنا چاہئے تھا۔ اس طرح '' الجھنوں کی مالا '' میں گوپال کی جگہ '' گوپالا '' کا استعمال کیا ہے۔ میرا بائی نے ایک اچھی ہندی نظم لکھی ہے جس کا ایک یہ مصرع ہے۔ میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی۔ یعنی نظموں میں ہندی الفاظ کا عمدہ استعمال بھی کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے '' کبھی کبھی کوئی مل جاتا ہے '' اس کو پڑھ کر یہ نغمہ بھی یاد آتا ہے: ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی۔ میں نے بھی ایک غزل میں اس بات کا ذکر کیا ہے:

یہ دنیا راس کب آتی مجھے بھی ترے دم سے جہاں اچھا لگا ہے

شاہین کی مذکورہ بالا نظم کی فضا جمالیاتی ہے۔ یہ ایک اچھی نظم ہے چند مصرعے دیکھئے: کبھی کبھی کوئی مل جاتا ہے/اس کو دیکھ کے/جس کو سن کر/دنیا اچھی لگتی ہے۔۔۔۔

پیروں کے تلووں سے جب کوئی خوف چپک کر چلنا دوبھر کر دیتا ہے/ایک دھنک سا اس کا تبسم مستقبل پر چھا جاتا ہے۔

اس نظم میں جو نفسیاتی نکتہ ہے اس کا احساس ہر پڑھنے والے کو ہو جاتا ہے۔

''تیسری دنیا'' شاہین کی ایک مختصر نظم ہے مگر پر اثر ہے۔ اس نظم میں انہوں نے چھ دشاؤں کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ عام طور چار دشاؤں کا لفظ مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں ان کی خوب صورت نظم ''ماریشش'' ہے۔ جس میں اچھی منظر کشی ملتی ہے نیز اس حقیقت کا بھی اظہار ہے کہ وہاں اردو کا جادو چل رہا ہے۔ اردو کی انجمن بھی قائم ہے اور اردو کا چرچا کسی کسی طرح ہو رہا ہے۔ اس نظم کے علاوہ بھی بہت سی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ہر ایک کا ذکر یہاں پر ممکن نہیں ہے۔ بعض نظموں کا منظوم ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً واپسی کا سامان (پولش نظم کا انگریزی ترجمہ)، پت جھڑ (ریز ماریا لکے سے)

ان کی نظموں میں بعض نہ صرف کہ یہ قافیے کا غلط استعمال ملتا ہے بلکہ مذکر اور مونث کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں اور الفاظ وتراکیب کا غلط استعمال بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ناگا ساکی/عراق میں زہر کو مونث لکھا ہے جبکہ زہر مذکر (ان کے تن میں ساری زہر)، نظم ''بارش میں سفر'' کا پہلا مصرع محل نظر ہے (دریچوں میں سے چھنتی بھوک شاید وہ دھوپ لکھنا چاہتے تھے۔ سر منزل مراد میں سناٹیاں کا استعمال مناسب نہیں معلوم ہوتا، وہ برمحل تھی کہ قہر سناٹیاں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کہ یہ کہا جائے کہ بچے دھوپوں میں کھیل رہے ہیں۔ قافیے کے غلط استعمال کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ یہی غلطی انہوں نے اپنی نظم ''اکیسی'' میں کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے تیسرا منور اور پتھر کا قافیہ کافر لکھا ہے جو قافیے کا غلط استعمال ہے۔ ایک بار شاہین نے مجھ سے ایک شاعرہ کے بارے میں کہا تھا کہ اسے قافیہ اور ردیف کا علم نہیں۔ میں نے (یعنی شاہین صاحب نے اسے بتایا) مگر اس کے یہاں قافیے کا غلط استعمال نہیں ملتا بلکہ وہ شاعری کی دنیا میں ان سے زیادہ مشہور ومقبول ہوگئی ہے۔ قافیے کی پابندی نظم میں ہوتی ہے اگر شاعرہ ایسی نظم لکھتی ہے یا اس کا التزام رکھا گیا ہے۔ تیسری دنیا جوان کی شعر نظم ہے اس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ اس میں ایک مصرع ہے اور زمینوں کے دکھ سے بھری کشتیوں میں سمندر رواں۔ سمندر کشتی میں رواں نہیں ہوتی بلکہ کشتی سمندر میں رواں ہوتی ہے۔ مگر کہیں کہیں معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے مثلاً جغرافیہ میں ایک سوال آتا تھا کہ کس علاقے میں کھیت چوری ہوئے ہیں۔ اس کا جواب تھا کشمیر میں۔ دراصل کشمیر میں کشتیوں پر بھی فصل اگائی جاتی تھی اور چور کشتی کھول کر لے جاتے تھے۔ اس مجموعے میں ان کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے خداوند۔ یہ ایک نہایت مختصر نظم یعنی صرف پانچ

مصرعے ہیں مگر نہایت ہی قابل اعتراض نظم ہے۔ قارئین خود ملاحظہ کریں:

خداوند تو جتنا اونچا ہے اتنا ہی بخ ہے۔ خداوند۔ ہم وہ چٹانیں ہیں تو جن کے اوپر کھڑا ہے
خداوند۔ نیچے جہنم ہے۔ جس میں گھٹن ہی گھٹن ہے خداوند۔ اب اس عذاب مسلسل سے ہم کو رہا کر
خداوند۔ اب ہم بھی آتش فشاں بن چلے ہیں

نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی نہ تو یخ ہے اور نہ وہ انسانی جسموں پر کھڑا ہے یہ تو اللہ کی شان میں سراسر گستاخی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی تعریف ڈاکٹر وہاب اشرفی جیسے زیرک نقاد بھی کر چکے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو توجیہ انہوں نے کی ہے ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ اسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ شاہین صاحب جوش کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

ایک صاحب نظر نے شاہین کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''اکثر مصرعے بحر سے خارج ہیں۔ اکثر مصرعوں کی اگر تحلیل لفظی کی جائے تو وہ بے معنی اور مہمل نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے کے نام پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں بڑا بامعنی نظر آتا ہے۔ دراصل اس کا عنوان اس مجموعے کا Keynote ہے۔ جس سے شاہین کی شاعری کا پس منظر نظر آتا ہے۔ یعنی شاہین نے جو دو ہجرت کے کرب جھیلے تھے اور مشرقی پاکستان میں ہونے والے عذاب کو دیکھا اور سہا تھا اس کی عکاسی ان کی بہت سی نظموں میں ملتی ہے۔

شاہین ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور حساس ہیں۔ اس لئے جو المناک حادثات اور واقعات ہوتے رہے ان کا گہرا اثر انہوں نے لیا۔ ان کے دل پر نامساعد حالات نے زبردست بوجھ ڈالا تھا ان واقعات کا بوجھ تادیر ان کے دل و دماغ پر رہا جو ''پشتارہ'' کی شکل میں ہم تک پہنچا۔ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد دکھ درد کو سمجھنا اور دردمندی کا اظہار بھی ہے۔ محبت اس کی تخلیق میں شامل ہے۔ یہ وہ امانت ہے جسے انسان ازل سے ڈھو رہا ہے۔ یہ شعر تو زبان زد خلائق ہے کہ: درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو / ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

حافظ شیرازی نے بھی اسی درد محبت یعنی اسی امانت کی طرف اشارہ اپنے ایک شعر میں کیا ہے:

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اور میر بھی اس درد کی لعنت کو ڈھوتے رہے:

جس پہ سب بارے گرانی کی اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

اسی لئے میر کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت فلسفہ دردمندی بھی ہے۔ یہ درد مشترک ہے اور بقدر ظرف ہر شاعر کو ملا ہے۔ شاہین نے بہت سے خونی مناظر دیکھے تھے۔ ایک المناک واقعہ کا ذکر مجھ سے بھی کیا تھا۔ یعنی جب ڈھاکے کا سقوط ہوا تو مکتی باہنی والے دندناتے پھر رہے تھے وہ ایک گھر میں گئے اور نوجوان کو پکڑ کر باہر لائے۔ اس کے پیٹ کو چھرے سے چاک کیا پھر اس کے اندر نمک ڈال دیا جس کے بعد وہ جوان تڑپا اور تڑپ کر اپنی جان دے دی۔ شاہین دروازے کی شگاف سے یہ اندوہناک اور خونی منظر دیکھ رہے تھے۔ اس واقعے سے کیسے متاثر نہ

ہوتے۔ ذہن پر ایک بوجھ لئے ہوئے پاکستان آئے اور اس بوجھ کو شاعری کی شکل میں ڈھالتے رہے نامساعد واقعات اور وہاں ہوئے ظلم و جبر کا اظہار اپنے اشعار میں کرتے رہے۔ اسے ہم Sublimation of thought کی مثال بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک کتھارسس کی صورت ہے۔ میں نے بھی اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھیں گے روز نئی داستاں کاغذ پر اتار دیں گے ہم اپنی تکان کاغذ پر

بہر حال شاہین کی شاعری میں جو درد اور کسک کا عنصر شامل ہے وہ ان المناک اور اندوہ ناک واقعات کی دین ہیں۔

شاہین نے اس مجموعے کی ابتدا میں ایک طویل فہرست ان رسالوں اور ان کے مدیرں کی دی ہے جہاں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے حالانکہ اس طویل فہرست کی چنداں ضرورت نہ تھی (یہ فہرست تین صفحات پر مشتمل ہے)

آخر میں ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ صبا اکرام صاحب نے اپنی تحریر "شاہین اور ان کی شاعری" میں کہا ہے کہ انہدام ڈھاکا سے چند ماہ قبل شاہین صاحب کراچی آگئے تھے (یہاں پر انہدام کی جگہ سقوط زیادہ مناسب تھا) تھوڑے دنوں بعد چند اور دوست براستہ کھٹمنڈو یہاں پہنچے تو ان کی سربراہی میں محمود واجد، شاہد کامران علی حیدر ملک اور اے خیام وغیرہ نے انجمن جدید مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے میں صبا صاحب سے تسامح ہوا ہے۔

دراصل اس انجمن کی بنیاد محمود واجد، شاہد کامرانی اور نور الہدیٰ سید نے ڈالی تھی۔ اس وقت نہ تو علی حیدر ملک کا اس سے کوئی واسطہ تھا اور نہ اے خیام کا۔ شبنم یزدانی، افتخار اجمل شاہین، اے خیام اور صبا اکرام کو بعد میں شامل کیا گیا۔ اس انجمن میں جو لوگ شریک تھے یا شرکت کیا کرتے تھے ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی۔ ان میں سوائے شاہد کامرانی کے بقیہ تمام لوگ بقید حیات ہیں اور ان تمام حقائق سے باخبر ہیں۔ اس انجمن کا عہدیدار اور رکن یہ خاکسار بھی رہا ہے۔ انجمن سے مطبوعہ Letter Head پر میرا (یعنی افتخار اجمل شاہین کا) نام بھی درج ہے۔ صبا اکرام اور اے خیام کو بعد میں محمود واجد نے شامل کیا۔ علی حیدر اس کے رکن نہیں تھے۔ اس وقت ان کی ملازمت سکھر میں تھی۔ انجمن کی طرف سے چھپنے والے Letter Head پر عہدیدار اور اراکین کے نام دیکھے جاسکتے ہیں۔ نور الہدیٰ سید اور مرحوم شاہد کامرانی کے گھر پر اس کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ اس انجمن کی ادبی نشست پہلے پی۔ ای۔ سی ایچ سوسائٹی کے مکان میں ہوا کرتی تھیں۔ یہ مکان شاہد کامرانی نے کرایہ پر لیا تھا۔ بعد میں اس کی نشستیں پبلک لائبریری صریر روڈ اور دیگر کئی لائبریریوں اور مکانات پر ہوتی رہیں۔ آخر میں یہ مرکز نور الہدیٰ سید کا مکان قرار پایا۔ پھر باقاعدہ نشستیں وہیں ہونے لگیں۔ محمود واجد اس انجمن کے صدر تھے اور نور الہدیٰ اس کے نائب صدر تھے۔ ہلال جعفری، اے خیال، صبا اکرام، شبنم یزدانی، اور شاہد کامرانی اس انجمن کے عہدیداروں میں شامل تھے۔ دوسرے دور میں مجلس عاملہ کے اراکین میں احمد ہمیش، انور سن رائے، رخسانہ انیس، عذرا عباس، افتخار اجمل شاہین، اور فہیم احمد فہیم کے نام شامل تھے۔ اس انجمن کی نشستیں جب نور الہدیٰ کے گھر پر ہونے لگیں تو ان کی بیگم نے بھی ایک طرح سے پورا تعاون کیا یعنی وہ اپنے گھر پر ہی پر تکلف کھانے کا اہتمام کرتیں کھانا بھی باہر سے نہیں آتا جب کہ بعض لوگ باہر سے دیگ منگوا کر کھانا کھلا دیتے اور شرکا ون ڈش پر اکتفا کرتے۔ یہ انجمن آج بھی قائم ہے مگر اس کی نشستیں فی الحال معرض التوا میں ہیں۔ باتیں چونکہ شاہین کے حوالے سے محترم صبا اکرام نے لکھی ہیں، اس لئے ریکارڈ کی درستگی کے لئے اس کی وضاحت ضروری تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ، (بہار)

''ساحر لدھیانوی حیات اور شاعری'' کا اجمالی جائزہ

زیرِ نظر تحقیقی کتاب ''ساحر لدھیانوی حیات اور شاعری'' کے عنوان سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ال۔ان متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن (سابق صدر شعبۂ اردو، ایل۔این۔ متھلا یونیورسیٹی دربھنگہ) نے داخل کیا اور انہیں مارچ ۱۹۸۹ء میں اس تحقیقی کام کے لئے سند دی گئی۔ یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی ہے۔

یہ کتاب ۱۸۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سات ابواب ہیں جن کی تفصیل و ترتیب اس طرح ہے:

۱۔تمہید ۲۔سوانح حیات و شخصیت ۳۔ ساحر کے شعری مجموعے ۴۔ پنجاب و لاہور کی قدیم و عصری تہذیبی و ادبی روایات و ماحول اور ساحر پر اس کے اثرات ۵۔ ترقی پسند تحریک اور اس کے زیر اثر ہونے والی شاعری کے ساحر پر اثرات ۶۔ ساحر کی شاعری ۷۔ اختتامیہ

ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن نے اپنی تمہید میں ہی اس بات کا انکشاف و اعتراف کیا ہے کہ ساحر کی شاعری کی عظمت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اتنی شہرت حاصل کی جو بہت کم ہی شعراء اور ادبا کو حاصل ہوتی ہیں۔ ایک پہلوان کی فلمی دنیا سے وابستگی بھی ہے۔ جس کے سبب بھی عوامی مقبولیت انہیں حاصل ہوئی۔ ان کے گیت اور ان کی شاعری زبان زد عام ہوئی جس زمانے میں انہوں نے فلمی نغمہ نگاری کا آغاز کیا اس عصر میں خود فلمی شاعری میں ادبی عناصر نمایاں تھے اس لئے محض فلمی شاعری کہہ کر ساحر کی ان دیکھی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ محقق موصوف نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ فلموں میں نغمہ نگاری شروع کرنے سے قبل ہی ۱۹۴۴ء میں ساحر کا پہلا مجموعۂ کلام ''تلخیاں'' شائع ہوا اور بقول مخمور سعیدی:

''اس کی نظمیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئیں۔ ان کی آواز ایک ایسے ناکام عاشق کی آواز تھی جسے آزادی اور انصاف کی قدریں بھی دل و جان سے عزیز تھیں...'' (ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ)

فاضل محقق نے لکھا ہے: ''آوازوں کے اس ہجوم میں اپنی آواز کو ایسا بنالینا کہ وہ دور سے پہچانی جاسکے کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن چونکہ ساحر لدھیانوی کی شاعری ان کے تیز احساسات کی زائیدہ اور گہرے جذبات کی پروردہ ہے اس لئے وہ یہ کرشمہ دکھا سکے۔ انہوں نے اردو شاعری کو کچھ دیا ہے، اس کے بارے میں خود ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ: دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں''

اس ''تمہید'' میں موصوف نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ بلاشبہ ساحر کی گراں قدر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

پروفیسر سید ضیاء الرحمٰن نے دوسرے باب میں ساحر کا اصل نام، خاندانی پس منظر، سماجی ماحول، جغرافیائی

اثرات اور جاگیردارانہ نظام کی لعنتوں کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ گرچہ یہ باب ساحر سے متعلق ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ساحر لدھیانوی کے عہد میں جو جاگیردارانہ نظام کا تانا بانا تھا اور زمینداری کے عہد کی جو خامیاں تھیں اس پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے اور Feudal System of Society نے جس طرح استحصال کا جال پھیلا رکھا تھا اس کا اندازہ بھی اس باب سے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی جہاں یہ ایک سماجی سروے پیش کرتا ہے وہیں اس امر کا احساس بھی دلاتا ہے کہ ساحر کو انسانی قدروں کا بے حد پاس تھا اور وہ جاگیردارانہ نظام اور ماحول میں آنکھیں کھولنے کے باوجود اس عہد و نظام کی کسی بھی بات سے متفق نہیں تھے۔ جس طرح گوتم بدھ کو راج محل میں آنکھیں کھولنے کے باوجود وہاں کی فضا راس نہیں آئی اسی طرح ساحر کو Feudal System of Society ایک آنکھ نہیں بھائی اور وہ اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ استحصال کو برا مانا اور انسانی قدروں کو جب پامال ہوتے ہوئے دیکھا تو ان کا نازک دل اور حساس دماغ تڑپ اٹھا اور بے چین ہوگیا۔ یہ ساری باتیں اور یہ عناصر کس طرح ان کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوئیں۔ اس کو بہت ہی سلیقے سے محقق موصوف نے سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور ایک ماہر عمرانیات، سماجیات کی طرح اس کا تجزیہ کیا ہے۔

'ساحر کے شعری مجموعے' اس مقالے کا تیسرا باب ہے۔ جس میں ان کے شعری مجموعے ''تلخیاں'' پرچھائیاں، ''گاتا جائے بنجارا'' اور ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

''پنجاب و لاہور کی قدیم و عصری تہذیبی و ادبی روایات و ماحول اور ساحر پر اس کے اثرات'' یہ ایک بڑا ہی گراں قدر باب ہے جس میں موصوف نے اپنی زندگی کے تجربوں، مشاہدوں، علمیت اور غور و فکر کا پورا استعمال کیا ہے جس سے اس عہد کے ادبی ماحول، سماجی پس منظر اور شعری رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے قدیم ادبی روایات سے لے کر عہد ترقی پسندی تک کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور جن عوامل و عناصر نے ادبی رجحانات اور تحریکات کو متاثر کیا اور خود ساحر جس ادبی فضا سے متاثر ہوئے اس کا اس باب میں بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ باب اپنے اندر ادبی تاریخ کو سمیٹے ہوئے ہے جس سے عہد بہ عہد ارتقائی سفر کا احساس بھی ہوتا ہے اور عہد ساحر کے بدلتے ہوئے ادبی نظریات سے واقف بھی کراتا ہے۔

''ترقی پسند تحریک اور اس کے زیر اثر ہونے والی شاعری کے ساحر پر اثرات'' کتاب کا پانچواں باب ہے۔ اس میں ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن نے ترقی پسند تحریک کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور اشتراکیت کے نظریے سے وابستہ اس تحریک نے کس طرح ہماری ادبی دنیا کو متاثر کیا اسے بتانے کی کوشش کی ہے اور اس تحریک کی بنیاد، اس کی تاریخ کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ (اس تحریک کے کیا اثرات اردو ادب پر ہوئے، کس طرح ایک نئی ٹولی ابھری اور کس طرح یہ تحریک ساحر کو بھی متاثر کرنے میں اپنا رول ادا کرتی رہی۔)

چھٹا باب ''ساحر کی شاعری'' توجہ طلب ہے۔ جس میں ساحر کی شاعرانہ (Form & content) ہیئت اور مواد دونوں سے بحث کی گئی ہے۔ ظاہر ہے ساحر نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور مارکسی نظریے

کے علمبردار بھی۔ اس لئے سماج کے اندر عدم مساوات، استحصال اور انسانی قدروں کی پامالی کی خامیاں موجود تھیں۔ اس کے خلاف انہوں نے آواز اٹھائی اور دبے، کچلے اور استحصال زدہ لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا۔ ساحر نے اپنی شاعری کے ذریعہ پیغام دیا، دنیا کے امن کے لئے اور ظلم کے خلاف صف آرا ہونے کے لئے۔ تمام حدود اور پابندیوں سے اوپر اٹھنے کی بات جو ساحر نے پیش کی ہے، اس کے پیچھے مارکسزم کا جو نظریہ کام کررہا تھا اس کی بھی وضاحت فاضل مقالہ نگار نے کی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ شاعر اپنے عہد کا اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شاعر اپنے اردو گرد سے بے خبر رہتا ہے تو یقینی طور پر اس کا یہ عمل سچائیوں کی بنیاد پر قائم نہیں ہوگا اور اس کی فکر اور مشاہدے محض ماورائی دنیا تو پیدا کرسکتے ہیں لیکن اس میں اپیل نہیں ہوسکتی بلکہ وہ ایک طلسماتی فضا میں فریب کے درمیان جینے کی ترغیب دے سکتا ہے۔ سچائی اور حقیقت نگاری میں جو شدت اور تاثر ہوتا ہے وہ ساحر کی شاعری میں موجود ہے اور ساحر کے یہاں اس سچائی اور حقیقت نگاری کے نقوش موجود ہیں۔

اس میں ساحر کے اسٹائل، پیش کش اور اسلوب کی بھی بھرپور تعریف کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود ساحر کی شاعری میں جابجا سپاٹ پن ہے، نظریات کی شدت پسندی ہے، فن سے بے راہ روی ہے اور جہاں جہاں روایت سے انحراف ہے اسے بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی علمی بصیرت اور ادبی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

اختتامیہ کے باب میں تحقیق کی اساس و بنیاد کی وضاحت کی گئی ہے اور ساحر کی شاعری اور شخصیت سے جو خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے اس کو بہت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس سے ساحر کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن کی یہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں انہوں نے اپنے سارے تجربات اور مطالعہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ خود بھی ترقی پسند تحریک سے عملی طور پر وابستہ رہے اور اپنے تحقیقی مقالے کے لئے ایک ایسے شاعر کا انتخاب کیا جو اعلانیہ طور پر نہ صرف اشتراکی تھا بلکہ اس نے کسی موقع پر بھی اسلوب، فارم اور مواد کے سلسلے میں بھی Compromise نہیں کیا۔ اس لئے خالص ادبی عینک سے دیکھنے والے اس کے سماجیاتی اور فلسفیانہ عملی اساس کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

ڈاکٹر موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زبان و ادب خواہ کتنی بلندی پر پہنچ جائے اور وہ اپنی بات کو Communicate کرنے میں خاص اور عام دونوں سطح پر ناکام رہے تو وہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں ناکام ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ساحر کی شاعری جہاں Direct Communicate کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہاں علمی و ادبی سطح پر معاشرتی اور انسانی ذہن کے ان مسائل کو بھی ابھارتی ہے جو کسی عام آدمی سے ممکن نہیں بلکہ یہ کوئی شاعر اور فنکار ہی کرسکتا ہے۔ ساحر کی شاعری کے ساتھ اس کی زندگی کے ان رشتوں کو بھی جوڑا ہے جو اسے وراثت میں حاصل ہوئے۔ بالخصوص گھر کا ماحول اور والدین کے کشیدہ تعلقات کس طرح اس کی شاعری اور شخصیت پر اثر انداز ہوئے اس کا بھرپور تجزیہ ان کی محنت، ایمان داری، شعور اور بصیرت کا بین

ثبوت ہے۔

ساحرؔ کی طویل نظموں کا تنقیدی تجزیہ محض اس کے فارمٹ اور اس کے گہرے تاثر تک محدود نہیں بلکہ اس کے اندر زندگی، معاشرہ، نفسیاتی، الجھنیں، تمنائیں اور خواہشیں سب کا محاسبہ کیا ہے۔ جس سے ساحرؔ کی شاعری کی اہمیت تو ابھر کر سامنے آتی ہی ہے ساتھ ہی تخلیقی مرحلوں سے گزرنے کے ان دشوار، پیچیدہ اور تجریدی مرحلوں کا بھی بھرپور جائزہ سامنے آیا ہے۔

یہ کتاب ایک تاریخی پس منظر بھی پیش کرتی ہے اور شاعری کے بدلتے ہوئے تیوروں کو سامنے لاتی ہے۔ ظاہر ہے ساحرؔ نے جو شاعری کی وہ محض اتفاق یا بیانیہ شاعری نہیں تھی اور محض اشتراکی شاعری بھی نہیں کہی جاسکتی۔ اب یہ عین اتفاق ہے کہ وہ عہد بھی ایسا ہی تھا جہاں استحصال کا دور دورہ تھا اور ساحرؔ کی زندگی بھی الجھی ہوئی تھی اس میں وہ جو بھی سوچتا وہ اشتراکیت سے میل کھاتا اور ایک سچے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ جن حالات وحادثات سے گذرا ہے اسے اپنے فن پارہ میں ایمانداری سے پیش کردے۔ ساحرؔ نے ایسا ہی کیا ہے اور اسی بات کو پروفیسر سید ضیاء الرحمٰن نے Dilute کر کے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب وتزئین ان کی صاحبزادی ڈاکٹر نکہت افشاں خاتون نے اہتمام کے ساتھ کیا ہے ورنہ یہ تحقیقی مقالہ زمانے کے گرد میں گم ہوجاتا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد پرویز عالم، دونواں گھاٹ، مظفر پور

ترقی پسند افسانے کے دو اہم ستون

پریم چند کے بعد جس ایک افسانہ نگار کو سب سے زیادہ داد ملی اور کم وقت میں جس نے اپنی صلاحیت سے سب سے زیادہ بہترین افسانے لکھے، وہ سعادت حسن منٹو کی ذات ہے۔ پریم چند جس دیہی سماج کے خاکے میں حقیقی رنگ بھر رہے تھے، منٹو نے اس سے یکسر انحراف کرتے ہوئے افسانے کو شہری اور قصباتی زندگی میں لے آنے کے بعد انفرادی چہرہ اور تصویروں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے کا کام کیا۔ یہ غیر ضروری طور پر مانا جاتا ہے کہ منٹو جنس زدہ افسانہ نگاروں کی فہرست میں سب سے اونچے مقام پر ہیں، بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ منٹو نے انسانی زندگی کو جتنے گہرے طور پر سمجھنے کی کوشش کی، وہ ادبی تاریخ میں حقیقت کا ایک علاحدہ باب ہے۔ منٹو کے چند افسانے ہیں جن میں جنس اور شہوانیت کے اشارے ملتے ہیں لیکن ان کے زیادہ افسانے دوسرے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ منٹو کی بدنصیبی ہے کہ لوگ اسے جنسیات کا اسیر سمجھ لیتے ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں حقیقت کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ انفرادی زندگی اور سماجی زندگی کی کشمکش اور الجھاوے سے منٹو کو زیادہ کھینچتے ہیں، اسی مرحلے میں عورت بھی ان کے قریب ہوتی ہے۔ بہت مشقت کر کے بھی منٹو کے یہاں ایسے افسانے نہیں تلاش کیے جاسکتے جن میں کوئی سماجی یا نفسیاتی مقصد پوشیدہ نہ ہو اور وہ صرف جنسی جذبات کی تسکین کے لئے افسانہ نگاری کر رہے ہوں۔ اصل میں وہ بے زبان خواتین کو کسمپرسی کے خلاف کھلے بندوں ایک جہت کر رہے تھے۔ عورت اپنی بے چارگی اور جبری زندگی میں کہاں کہاں سے ٹوٹتی ہے، منٹو اس کے ریکارڈر کھتے ہیں۔

منٹو کا عہد سیاسی اور سماجی اتھل پتھل کا رہا ہے۔ ہندوستان میں جنگ آزادی کی تحریک، تقسیم ملک اور قتل و خون کا بازار گرم ہونا جیسے مسائل اس عہد کے اصل سوالات ہیں۔ منٹو اپنے افسانوں میں اس زمانے کی تصویریں زندگی کے طور پر پیش کردینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہتک، موذیل، نیا قانون، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو جیسے افسانوں کا مطالعہ منٹو کے تصور کائنات کو واضح کردینے کے لیے کافی ہے۔ منٹو اپنے کرداروں، بالخصوص خواتین کو زمانے کے جبر و استحصال کا شکار ثابت کرتے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور محبت، مساوات اور انصاف جیسی دائمی اقدار کی پیاس سب سے زیادہ ہے۔ منٹو نے عورتوں کی بیچارگی اور جبر کی زندگی کے پیش کش میں جس سوز کا اظہار کیا، وہ اردو افسانے کا ایک بہترین وقوعہ ہے۔

منٹو نے اردو افسانے کے لئے فنی سطح پر بہت سارے نئے تجربے کیے۔ ڈرامائیت اور ظرافت، طنزیہ سفاکی ابھارنے کے لئے منٹو نے اردو افسانے کی ایک علاحدہ زبان تلاش کی۔ پریم چند کے یہاں سادہ زبان کا ایک تصور تھا، اس زبان میں بیان کے لیے کچھ اضافی نظریے بنائے جاتے تھے۔ کہنا چاہئے کہ انشاپردازی کا آخری عنصر پریم

چند کے یہاں ابھی بچا ہوا تھا۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے بیان کے لئے ایسے مناظر حذف کیے۔ منٹو نے اپنے جملوں کو مختصر کیا، چار پانچ لفظوں میں ان کا ایک جملہ پورا ہو جاتا تھا۔ بظاہر بے کیف سادہ سے بول چال کے لفظوں میں منٹو نے موضوعاتی تاثر کے سارے لوازمات شامل کیے، اسی وجہ سے یہ ممکن ہوا منٹو نے کم عمری کے باوجود اردو کو بہترین افسانوں کی ایک بڑی تعداد دی اور بجا طور پر موضوعاتی، فکری، اسلوبیاتی اور تکنیکی خوبیوں کی وجہ سے پریم چند عہد کے بعد کے سب سے بڑے افسانہ نگار قرار دیئے جاتے ہیں۔

پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانے کی جو نسل سامنے آئی، اس میں خواتین کی صف میں عصمت چغتائی سب سے اہم قرار دی گئیں ہے۔ عصمت سے پہلے 'انگارے' کی رشید جہاں کے افسانے اپنے غیر روایتی انداز کی وجہ سے لائق توجہ بن چکے تھے۔ عصمت نے اپنی خود نوشت، کاغذی ہے پیرہن میں رشید جہاں کو اپنا آئیڈیل قرار دیا ہے، لیکن فنی طور پر رشید جہاں اپنی ابتدائی فتوحات کے باوجود ایک اوسط درجے کی مصنفہ ہیں۔ وہیں اردو افسانے کی تاریخ میں عصمت ایک مستقل اور روشن ستارہ ہیں۔ دیہی سماج کی قصہ گوئی پریم چند نے جہاں حقیقت کا ایک مقبول تصور ہندوستانی سماج کو دیا تھا، منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت نے ان کی روایت کے علاحدہ زاویے تلاش کیے۔ سب کے یہاں سماج کا تصور بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ منٹو اور عصمت چغتائی نے زندگی کی نفسیاتی گرہوں کو زیادہ کھلے اظہار کا موضوع بنا کر اردو افسانے میں ایک انقلاب آفریں اقدام کیا۔

عصمت نے یوپی کے مسلمان گھرانوں کی زندگی کو موضوع بنایا۔ جاگیردارانہ طبقے میں لٹی پٹی اور گھٹ رہی زندگی میں عصمت نے اندر تک جھانکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی بنیادی توجہ عورتوں کی سرگرمیوں پر مرکوز کی۔ عصمت سے پہلے اردو شاعری اور افسانوں یا ناولوں میں عورتوں کا ذکر تو ہوتا تھا لیکن امراؤ جان ادا کے علاوہ آزادانہ طور پر کوئی عورت اپنی باتیں کہتی ہوئی نظر نہیں آتی ہے۔ امراؤ جان کی عظمت اپنی جگہ لیکن اس کے اصل جذبے، خواب اور تمنائیں کہاں ناول کے صفحات پر موجود ہیں۔ وہ ناصح، عالم اور ادیبہ تو ہے لیکن اس کے داخل میں جو طوفان اٹھا ہے، اس کی ترجمانی کہاں ہوئی ہے۔ عصمت چغتائی نے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اپنے خاتون کرداروں کو ان کے اصل کی ترجمانی کے لیے وقف کیا۔ اب یہ عورت صرف محبوبہ نہیں، محبت کی گڑیا بھی نہیں، محبوبہ سے پہلے دوسرے شکایت تو کرتے تھے لیکن اسے شاید اس کا حق ہی حاصل نہیں تھا۔ عصمت کا یہ تاریخی کارنامہ ہے کہ اردو ادب کی خاموش عورت کو انہوں نے نہ صرف یہ کہ زبان عطا کی بلکہ اس کے داخل اور باطن کے سارے دروازے کھول دینے کا حوصلہ بھی دکھایا۔ اسی لئے ان کی بے باکی اور بند دروازے اور کھڑکیوں کو کھول دینے کی اداؤں سے روایتی طبقہ خوش نہیں ہوا۔

عصمت چغتائی کی شہرت 'لحاف اور دوزخی' جیسی تحریروں سے ہوئی۔ 'ٹیڑھی لکیر' کی اشاعت نے یہ ثابت کر دیا کہ ہماری گھریلو زندگی کے بظاہر مطمئن زندگی کے نظام میں کتنا شور، اتھل پتھل اور بے چینی موجود ہے۔ دھیرے

دھیرے انہوں نے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں طبقے کو اپنے حلقے میں لیا۔ عصمت دکھانا چاہتی ہیں کہ عورتیں ہر معاشرے میں بے آواز ہیں۔ آزادانہ طور پر انہیں محسوس کرنے کے لئے بھی سماج نے اجازت نہیں دی، اسی لئے عصمت چغتائی کے اکثر کردار شہ زور، اتاولے اور بے خوف ہو جاتے ہیں۔ کم سے کم اس سے یہ سہولت انہیں ضرور ملتی ہے کہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی وہ اپنے خوابوں کے آسمان میں اڑ تو سکتے ہیں۔ نوجوان اور ادھیڑ عورتوں کی زندگی کو موضوع بنانے کی وجہ سے عصمت چغتائی کے یہاں فطری طور پر جنس کا بیان ملتا ہے۔ روایتی معاشرہ اسے جنس زدگی کہے لیکن عصمت کے ایسے افسانے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کو معاشرتی جبر کا نتیجہ مان رہی ہیں۔ جب تخلیق کے مقاصد اتنے وسیع ہوں تو بیان کے سلسلے کو بے وجہ ملامت نہیں کرنا چاہئے۔

عصمت چغتائی نے اردو افسانے کے لیے ایک علاحدہ اسلوب پیدا کیا۔ پریم چند نے سادہ زبان اور کم پڑھے لکھے لوگوں کی زبان کو افسانوی وقار عطا کیا تھا۔ عصمت چغتائی نے گھریلو عورتوں کی فطری زبان کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ اس زبان کی ظرافت، برجستگی، معقولیت اور طنز کی قوت کو انہوں نے پہچانا۔ آج عصمت سے زیادہ نشتریت اردو کے کسی افسانہ نگار میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ایک جملے سے سامنے والے کا وجود چھلنی ہو جائے، یہ صلاحیت صرف عصمت چغتائی میں ہے۔ الغرض عصمت نے نہ صرف نیا موضوع منتخب کیا بلکہ اسے نئی تکنیک میں بھی لکھا اور اس کے لیے ایک نئی زبان بھی بنائی۔ اسی لیے اردو افسانے کی تاریخ میں عصمت چغتائی کا آزادانہ وجود صدفی صد تسلیم شدہ ہے۔

☆☆☆

قطعہ

نامور ماہر تعلیم اور دانشور **پروفیسر محمد میاں**

(معزز وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسیٹی، حیدرآباد) کی نذر

نئے وی سی مانو کے ہیں پروفیسر محمد میاں
دانشور ہیں علم کے ماہر علم ہے رخ سے عیاں
علم کے گلشن میں آئی ہے تازہ ایک بہار
کیسا ہے رنگین یہ موسم کیسا دلکش سماں

☆.............ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

فروغ اُردو کی علامت: ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ

کشمیر کی رنگارنگ وادیوں سے ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کا تعلق ہے اور اس وقت ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ، اردو زبان (این سی پی یو ایل) میں ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز ہیں ــــ جینیس شخصیتیں رنگارنگ خوبیوں کی مالک ہوتی ہیں اس لئے شخصیت کے ایک پہلو کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ اس کے اندر کتنے جوہر چھپے ہوئے ہیں۔ حمید اللہ بھٹ کو بھی دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ وہ محض انتظامی امور کے ماہر ہیں یا ادبی دنیا سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ کیونکہ جو شخص انتظامی امور میں لگ جاتا ہے تو اسے فرصت کے اوقات کم ملتے ہیں اور وہ اپنے اندر چھپے ہوئے جوہر کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا اس کی نمایاں مثال مولانا آزاد ہیں جن کے اندر ادبی جولانیاں بے پناہ تھیں لیکن سیاسی اور انتظامی امور کے سبب سب کچھ ان کی زندگی میں سامنے نہ آسکا۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کی مدیرانہ صلاحیت تو NCPUL کے رسائل سے جگ ظاہر ہے اگر یہ اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو ادب میں کشمیری شناخت کی جھلک'' کو کتابی شکل دے دیتے تو یہ اردو ادب کے مطالعہ میں حوالے کی چیز ہوتی کیونکہ کشمیر ادبی Inspiration کا ذریعہ رہا ہے اور زبان کی نزاکت و ملاحت کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کی علامت رہی ہے۔ یوں تو ہندوستان کے تمام خوبصورت علاقوں کی رنگارنگی اردو زبان کے اندر موجود ہے لیکن کشمیر چوں کہ ہندوستان کا دل ہے تو اردو کا بھی دل ہے کشمیر کی دھڑکنیں آپ کو اردو شاعری میں جا بجا دیکھنے کو مل سکتی ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے اپنی فرض شناسی، عمدہ انتظامی شعور، تدبر اور اپنے دائرۂ عمل میں جدت و انفرادیت کے ساتھ نمایاں خدمات انجام دینے کی لگن کا اظہار، یونیورسٹی آف کشمیر کے دوران ملازمت (90-1980) کر کے ابھرے۔ اس درمیان یہ ڈیولپمنٹ آفیسر، اسسٹنٹ رجسٹرار اور ڈپٹی رجسٹرار کے منصب پر فائز ہو کر U.G.C. حکومتِ جموں و کشمیر اور حکومت ہند کے منصوبہ جاتی و غیر منصوبہ جاتی پالیسی ساز مباحثے و مذاکرے میں کشمیر یونیورسیٹی کی نمائندگی کی۔ علاوہ ازیں بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز، بورڈ آف اسٹڈیز اور اکیڈمک کاؤنسل کی بحیثیت سکریٹری بھی خدمات انجام دیں اور اپنی ایک مخصوص پہچان بنائی۔

یہی پہچان انہیں نوزائیدہ ہمدرد یونیورسٹی کھینچ لائی، اس توقع کے ساتھ کہ کالج کی شکل میں موجود یونیورسٹی کو جدید ترین معیاری یونیورسٹی کی حیثیت دینے میں موصوف کی منفرد سوچ، فعالیت اور پختہ انتظامی شعور معاون ہو سکے گی۔ موصوف اس توقع پر پورے بھی اترے اور تشکیلی دور میں بحیثیت رجسٹرار 1991 تا 1995 انہوں نے انتظامی اور تعلیمی انفراسٹرکچر کی تنظیم نو کی، اس کے قواعد و ضوابط کی توضیع نو کی اور ایک قلیل مدت میں ملک کے تعلیمی نقشہ پر جدید تعلیمی سہولیات سے آراستہ ''ہمدرد یونیورسٹی'' کے وجود کا احساس دلا دیا۔ قائم شدہ شعبہ جات، ہندوستانی طریقہ دوا سازی، فارمیسی اور اسلامی تعلیمات کو عصری تقاضے کے مطابق نئی روش پر گامزن کیا۔ زمانہ کی

مطابقت و مسابقت اور وسائل روزگار پیدا کرنے والے جدید طرز کے نئے شعبے مثلاً Environmental Botany, Industrial Chemistry, Toxicology & Bio-chemistry وغیرہ کھولے جانے کا پروجیکٹ تیار کیا۔ اس طرح آج ہمدرد یونیورسٹی دہلی کو جو معیار و مقام حاصل ہے اس کی بنیاد میں ڈاکٹر بھٹ کے اختراعاتی درک، تدبر اور انتظامی حسن کارکردگی کا بڑا ہاتھ ہے۔

اپنے وطن، اپنی زبان، اپنے کلچر اور اپنی ملت سے جذباتی لگاؤ تو فطرت انسانی میں داخل ہے مگر اس کا اظہار مثبت و تعمیری سطح پر، وسیع تناظر میں، ان کے تئیں فلاحی ورفاہی اقدام حوصلہ مندانہ طور پر انجام دے کر کرنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہوتا۔ ایسے اقدام کا ظہور مصلحین و تاریخ ساز ہستیوں کے ذریعہ ہی ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر بھٹ اسی روش پر گامزن نظر آتے ہیں۔ حسنِ اتفاق انہیں لگاتار دو ایسے جامعات میں کام کرنے کا موقع ملا جس نے ان کے لگاؤ اور لگن کو اور بھی دو آتشہ کر دیا۔

مرکزی وزارت تعلیمات کو جب توسیع کر کے "وزارت فروغ انسانی وسائل" کر دیا گیا تو اس وزارت کے تحت قائم "ترقی اردو بورڈ، دہلی" جو اردو کتابوں کی طباعت اور اردو ادباء و شعراء کو نوازنے تک محدود تھا، اسے بھی "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" بنا دیا گیا اور اس کے سابقہ بجٹ میں قدرے اضافہ کر کے 84 لاکھ کر دیا گیا۔ باوجود اس کے یہ اپنے سابقہ دائرۂ کار میں کوئی نمایاں تنوع اور وسعت پیدا نہ کر سکا مگر جب 1997 میں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ اس کے ڈائریکٹر بنائے گئے تو اس کی روش و رفتار دونوں بدل گئے۔ جس ادارہ یا محکمہ کو سیاسی نقطۂ نظر سے اردو والوں کے لئے توشہ دان کی حیثیت سے وجود بخشا گیا تھا سے موصوف نے اردو زبان کی تعلیم و ترویج کا منبع، اردو کو روزگار سے جوڑنے کا وسیلہ، اردو دانوں میں تعلیمی تحریک کا مرکز، اردو زبان کو عصری تقاضے پورے کرنے کا اہل بنانے کی ایجنسی، ادبی و ثقافتی ورثے کی بازیافت کا محرک و امین، مدارس اسلامیہ اور اقلیتی تعلیمات کی جدید کاری کا تحریک کار سرکاری ادارہ بن کر ملک گیر سطح پر ابھرا۔ ڈاکٹر موصوف کی پر خلوص اور حوصلہ مندانہ عملی جدوجہد کے نتیجہ میں NCPUL اردو اور اردو والوں کے لئے وسیع پیمانے کا "قومی نوڈل ایجنسی" بن گیا جس کا اب سالانہ بجٹ 1900 لاکھ پر پہنچ گیا ہے۔ ملک کے ۲۶ صوبوں کے 1182 اضلاع میں ملٹی لینگول ڈی ٹی پی سنٹر اور 357 کمپیوٹر Application کے قیام کے ذریعہ انفارمیشن ٹکنالوجی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس طرح 17000 لڑکے اور لڑکیاں جو اردو بولنے والی ہیں اور اقلیتی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں ایک سال کا ڈپلومہ ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لینگول ڈی ٹی پی کر رہی ہیں۔ ان چند برسوں میں اس پروگرام سے 58094 طلبا و طالبات مستفید ہوئے ہیں اور انہیں ملازمت پیشہ ورانہ سطح پر حاصل ہوئی ہے جس میں TDP آپریٹر، ویژول ڈیزائنر اور ڈاٹا انٹری آپریٹر شامل ہیں۔ وہ لوگ تعلیم کو قومی تناظر میں اقلیتی غیر سرکاری تنظیم تعلیمی اداروں اور ماہرین تعلیم کے درمیان اسے پھیلاتے، مستحکم کرتے اور لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ ڈائرکٹر موصوف نے نمایاں طور سے اقلیتی فرقوں میں جدید تکنیکی تعلیم اور اداروں کے قیام اور اعلیٰ تعلیم کو بڑھاوا دینے میں حصہ لیا ہے اور اسے

ابتدائی تعلیم کے قومی پروگرام سے جوڑا ہے۔ اس کوشش میں مناسب حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اور اب اقلیتی ادارے قومی ترجیحات کی طرف دھیان دے رہے ہیں۔ موصوف نے اقلیتی لیڈروں کے ساتھ بہت اہم نشستیں منعقد کیں اور گفت وشنید کے نتیجہ میں ایک خاکہ مستقبل کے تناظر میں اقلیتوں کی تعلیم کے متعلق مرتب کیا اور مدرسہ تعلیم کی جدید کاری اور اقلیتوں کی تعلیم کے لئے اہم کوششیں کیں۔ جدید نصاب تجویز کر کے Text material کو معیاری بنایا تاکہ یہ قومی مقصد اور قومی معیار کے موافق ہو۔

یہ ایک اہم حصولیابی ہے کہ تمام NCERT کے ٹکسٹ میٹریل اور ان کی معاون کتابیں اردو میں منتقل ہوگئی ہیں۔ ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں آل انڈیا اردو اخبارات کا نیٹ ورک قائم کیا گیا تاکہ قومی مسائل کے متعلق آراء ہم آہنگ ہوں اور یو این آئی کے آل انڈیا نیٹ ورک سروس سے مشہور اردو روزنامے جوڑے گئے۔ یہ اسکیم اردو پریس کو اصل دھارے میں لانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

اردو عربی تدریس کے لئے فاصلاتی تعلیم کا 648 اردو اسٹڈی سنٹرس ہندوستان کے ۲۲ صوبوں میں قائم کیا گیا جن میں 42345 طلباء اردو زبان میں ڈپلومہ کورس کر رہے ہیں۔ ۲۱ صوبوں میں 592 عربی اسٹڈی سنٹرس قائم کئے گئے ہیں۔ 41638 سے زائد طلباء سرٹی فیکیٹ اور ڈپلوما کورس عربی میں کر رہے ہیں۔ اقلیتی طبقہ کے تعلیمی مسائل کے سلسلہ میں قومی سطح کے سمینار، مباحثے، مذاکرے، منعقد کئے گئے تاکہ انہیں اصل قومی دھارے میں لایا جائے۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے اردو زبان کے فروغ کے لئے اتنا کام کیا ہے کہ اردو کے ترقیاتی پروگرام کے سفر میں NCPUL سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقام تک پہنچانے کے لئے ان کے وژن کی داد دینی چاہئے کیونکہ ان کے دیکھنے کا نظریہ ان کے کام کرنے کے طریقہ، ان کے انتظامی امور، ان کے سابقہ تجربے، اردو کے مسائل سے وابستگی اور فکری اور تعمیری وسعت نظری نے اس ادارہ کو اس مقام تک پہنچایا۔

ان کی مدبرانہ کارکردگی کے پیش نظر حکومت ہند نے وزارت فروغ انسانی وسائل کے ماتحت ایک ذیلی شعبہ ''اقلیتی تعلیم'' کا ڈائریکٹر 2007 میں بنایا۔ اس عہدہ پر مامور رہتے ہوئے مدرسہ کی جدید کاری تحریک کو نیا موڑ دیا۔ اس کے تحت مدرسہ کی ڈگری کو مساوی بنانا، جسٹس سچر کمیٹی رپورٹ کے فریم ورک میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی حکمت عملی وضع کرنا، قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارے کو مستحکم کرنا اور اقلیتوں کی فلاح کے لئے وزیراعظم کا پندرہ نکاتی پروگرام کے نفاذ کی راہ ہموار کرنا، اسی شعبہ کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

انہوں نے ماہنامہ اردو دنیا اور سہ ماہی فکر و تحقیق کے مدیر کی حیثیت سے اردو صحافت میں ایک نیا رخ اپنایا۔ بحیثیت چیف ایڈیٹر انہوں نے متذکرہ رسائل میں انسانی معلومات کے تقریباً ہر زاویے پر 1000 ٹائٹلس بشمول بچوں کے ادب، سائنس اور ٹکنالوجی پر پیش کئے۔ اردو کی اشاعتی میدان میں ایک نیا کارڈ قائم کیا۔ فروغ تعلیم سے رغبت اور اسے تنوع بخشنے کی لگن میں مختلف عہدوں پر متمکن رہتے ہوئے بین الاقوامی سیمنار رکانفرنس، منعقدہ یو۔ کے، فرانس اور متحدہ عرب امارات مدعو کئے گئے۔ کامن ویلتھ میں انڈین یونی روسٹی کی نمائندگی کی اور پرمغز مقالہ

پیش کیا جس کا عنوان ہے: "Changing Scenario and Static Education Systems."

اس کے علاوہ فروغ اردو کے سلسلہ میں جو ان کے عزائم ہیں وہ بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ گذشتہ دنوں انڈیا اسلامک کلچر سنٹر، دہلی میں ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''آزادی کے ۶۱ سال بعد بھی اس بات کو محسوس کیا جارہا ہے کہ اردو کے فروغ کے لئے ایک نئے وژن اور نئی قومی حکمت عملی کی ترتیب نو کی ضرورت ہے۔ یہ نئی حکمت عملی اور وژن اس تہذیبی تشخص کی بازیابی کو ممکن بنائے گا جو اردو زبان سے منسلک ہے اور خوبصورت آرٹ سے متعلق ہے۔''

انہوں نے یہ بھی کہا کہ: ''اردو سے وابستہ آرٹ فارم جیسے خطاطی، غزل، فن تعمیر اور سنگ تراشی آج کے ہندوستان میں گویا ناپید ہورہے ہیں۔ اس خوبصورت ورثے کو بچانا بہت ضروری ہے اور این سی پی یو ایل یہ فرض نبھائے گی..... نئی حکمت عملی کی ترتیب کے لئے ایک دستاویز تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کونسل اردو اور اردو کلچر سے وابستہ شخصیتوں کی ایک راؤنڈ ٹیبل تشکیل دینا چاہتی ہے اور زبان و ادب اور کلچر سے وابستہ ان اہم شخصیات کے مشورہ سے مستقبل کا ایجنڈا تیار کیا جائے گا۔''

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ جن عہدوں اور فرائض کو انجام دے رہے ہیں یا انجام دے چکے ہیں ان تمام شعبہ جات میں ان کی نمائندگی کا عکس ان کی کارکردگی، صلاحیت اور تجربہ کے مثبت نتائج سامنے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ آنے والے برسوں میں NCPUL اردو کی ایک نمائندہ ناڈل تنظیم ہی نہیں رہے گی بلکہ یہ نئے تحریکات اور اردو کو دنیا کے جدید علمی اور فنی ٹیکنک سے واقف کرانے میں اس کا عمل دخل اردو کے روزانہ استعمال میں ہونے لگے گا۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ ایک متحرک اور فعال شخصیت کا نام ہے اور اردو دنیا کو جدید ٹکنک سے لیس کرنے کے لئے وہ بہت ہی عملی اقدام اٹھارہے ہیں۔ انہوں نے زبان کی ساخت و مزاج کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ حمید اللہ بھٹ وسیع النظر اور وسیع الفکر کے ساتھ ساتھ کچھ کرنے کا پرخلوص جذبہ رکھتے ہیں جو اردو دنیا کے لئے خوش آئند بات ہے:

بڑے ذی وقار حمید اللہ بھٹ — ہیں اردو کے یار حمید اللہ بھٹ
ہیں این سی پی یو ایل کے روح رواں — سخن تازہ کار حمید اللہ بھٹ
ہیں خود آپ میں جو اک انجمن — بہ رنگ ہزار حمید اللہ بھٹ
برائے فروغ زباں ہوگئی — فضا سازگار حمید اللہ بھٹ
زمانہ کی پیاری زبانوں میں بھی — ہیں اپنا شمار حمید اللہ بھٹ
دعا ہے قیادت رہے آپ کی — بس لالہ زار حمید اللہ بھٹ
بہت ساری امید اعظم کو ہے — نہ اترے خمار حمید اللہ بھٹ

☆☆☆

شمع اختر کاظمی، ۱۲/۱۴، سائی نگر، بھیونڈی، (مہاراشٹرا)

''آج غالب غزل سرا نہ ہوا''

پاورلوم صنعت کے شہر بھیونڈی مہاراشٹر میں منعقدہ ایک تمثیلی مشاعرے کی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی روداد

سماجی و ادبی بیداری اگر کسی شہر کے زندہ ہونے کی دلیلیں ہیں تو بھیونڈی بجا طور پر ایک ایسا شہر ہے جو اپنی مشترکہ تہذیبی روایات، رواداری اور شعری و ادبی نشستوں کے انعقاد کی تاریخ رکھتا ہے۔ اردو شاعری کے ناخدائے سخن، جو ہندوستان کے مختلف شہروں، قصبوں سے سفر کرتے ہوئے اس سرزمین پر آکر ٹھہرے تو یہاں کی معتدل فضا میں نہ صرف بود و باش کو ترجیح دی بلکہ علم و ادب اور شاعری کے گل بوٹے بھی اس کے آنچل میں ٹانک دیئے۔ اس کے وقار و عظمت کو نئی پہچان دی۔ اس کارواں کے لب و لہجے میں سفر کی کوئی تکان نہیں بلکہ مدغم ہونے کی ادا نے ہی یہاں کی مٹی سے اٹھے شعراء کی صف آرائی میں ان کے نام بھی شامل ہوئے اور ان کے کلام کو سامع نے احترام بخشا۔ شعر و شاعری اپنے دامن میں جناب زید عابد، ایوب واقف، عبدالقیوم نازاں، شبیر احمد راہی، محمد عمر شفیق، قمر پرتاپ گڑھی، انس الہ آبادی، ظریف نظام پوری، عرش جونپوری، فیضی نظام پوری، ابوبکر جناب، شاکر ادیبی، جان عالم رہبر، راز پرتاپ گڑھی، امیر حمزہ ثاقب، اختر جمال اور وسیم الماس جیسے نگینے رکھتی ہے۔ جو آنے والے کارواں کے قلمی سفیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آل انڈیا مشاعرہ اس شہر میں ہر سال کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ مقامی شعراء اور باذوق حضرات کی کوششوں سے شعری و ادبی نشستوں کا دور دورہ رہتا ہے۔ شعر گوئی کی فضا بنی رہتی ہے تو سامع بھی شب انتظار رہتے ہیں۔ پاورلوم کی کھٹ کھٹ اور زندگی کے تانے بانے میں الجھی مصروف زندگیاں بھی مشاعرہ گاہ کے قریب بکھری غزل کی خوشبو سے خود کو معطر کرنے کے لئے پہنچ ہی جاتی ہیں۔

جس شہر میں اردو پر فدا پروانے اور جانثار موجود ہوں، گیسوئے غزل کے خم نکالتے اس کے دیوانے بے قرار ہوں تو تمثیلی مشاعرے کے نام سے ہی مسند سخن پر غالب اور میر کی غزلیہ روایت، دلوں کو مسخر کرتی نظیر اور اکبر کی نظمیں تو جگر اور فیض کے کلام کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ مشاعروں کے باذوق سامع ایسی مجلس میں اپنی دیرینہ روایات، اس کی اصل روح اور اس شمع انجمن کے سحر آگیں سے خود کو بچا نہیں پاتے۔ تشنگان علم و ادب تمثیلی مشاعرے کے ذریعہ چند لمحے ہی سہی اس دور گذشتہ کو جی لینے کی تمنا لئے شاعری کی کہکشاں میں خود کو ڈبو دینا چاہتے ہیں۔

گذشتہ دنوں ایک تمثیلی مشاعرہ بھیونڈی میں منعقد ہوا جس میں سابقہ روایات کی طرح مرد حضرات کثرت سے موجود تھے۔ خواتین اور طلبہ کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی باوجود شب تار کے والدین اس شوق جنوں میں اپنی بچیوں کو اجازت دینے پر مجبور ہوئے کہ اردو سے دوری کو قربت اسی بہانے نصیب ہو جائے پھر اپنی مادری زبان کی حفاظت انہی معماروں کو تو کرنی ہے۔

پردہ ہٹا، مشاعرے کی نشست پر بہادر شاہ ظفر، غالب، مومن خاں مومن، نعیم اختر برہانپوری، بشیر بدر، وسیم

بریلوی، ماجد دیو بندی، انور جلال پوری، راہی بستوی، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، حق کانپوری، نور اندوی، جوہر کانپوری، رفیق شادانی اور الطاف ضیا سب کے سب شان تمکنت سے براجمان تھے۔ مشاعرے کی صدارت بہادر شاہ ظفر فرما رہے تھے اور نظامت کے فرائض انور جلال پوری کے ذمے تھی۔ پرجوش سامعین نے تالیوں سے سبھوں کا خیر مقدم کیا۔ اشتیاق دید کے بعد سامعین کی شوق تمنا مزید بڑھ گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک شعراء کرام مائیک پر آ کر اپنا کلام سنا رہے تھے۔ کبھی حقیقت کے قریب تو کبھی شائبہ کے پیچھے لپکتے جھپکتے۔ کبھی تقریر پر اتر آتے تو کبھی زبان کی کجی سے اشعار کو سنگ کر جاتے۔ عجب سماں تھا جہاں لفظوں کے نور کارواں کے گذر کا امکان تھا وہاں بیجا جوش و ولولے کی گولہ باری جاری تھی۔ تمثیلی مشاعرے کا حق کہیں سے ادا نہیں ہو پاتا تھا۔ اردو شاعری کے آباء و اجداد کی غزلیں تمثیلی انداز بیان میں سنانے کے ساتھ ساتھ تخاطب باوقار، لہجے میں حلاوت اور شعر کے مفہوم سے بھی شاعر کے انداز بیان ربط رکھتے ہوں۔ مگر جب الفاظ اپنے درست تلفظ کو ترس رہے ہوں، شعر کی ادائیگی پر تسکین قلب نہیں کسک پیدا ہو جائے، مسند سخن پر جیدرقم طرازوں کی بھیڑ اُمڈ رہی ہو تو بھی سامعین عش عش کرنے کے بجائے ہر ہر کرنے لگتے ہیں۔ پھر غزل گوئی کی تہذیبی روایات کا حق کیسے ادا ہو کہ اس میں انسانیت کی چارہ گری رہی نہ زندگی کی کڑواہٹوں اور چبھن کا ادراک رکھنے والوں کو سیرابی نصیب ہوئی تب غزل خود تشنہ تشنہ سی لگنے لگتی ہے۔

اس مشاعرے کی صدارت مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر فرما رہے تھے۔ جو ڈائس پر اپنے تھرماکولی قلعے کی گرتی دیوار سے سخت نالاں تھے جو ابھی پر آ پڑتی تھی۔ اپنی حیات میں بہادر شاہ ظفر نے ملک پر چھائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و دبدبے میں بھی لال قلعے کی دیواروں کو اس طرح تھرتھراتا اور کپکپاتا کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ جسے گاؤ تکیئے سے سہارا دیئے خود عالم پناہ نالاں اور منتظمین پریشان نظر آئے۔

صدر مشاعرہ بہادر شاہ ظفر کی ایک جانب مومن خاں مومن تو دوسری طرف مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ براجمان تھے۔ مومن خاں مومن نے "تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا" کے مصداق اپنی زلف پریشاں کو بدستور سنوارتے اور چمپئی چغے میں کافوری جوش و ولولے اور سیمابی کیفیت کے ساتھ پوری غزل مطلع سے مقطع تک سنا کر ہی دم لیا اور اس شان بے نیازی سے اپنی نشست پر جا بیٹھے جیسے کوئی شہنشاہ جنگ جیت کر شاداں و فرحاں اپنے وطن واپس آتا ہے اور بس منتظر رہتا ہے کہ اب وزیر مملکت رعایا میں ان کی فتح کا اعلان کرنے والا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی دوسری جانب رونق افروز مرزا اسد اللہ خاں غالب کے غالب ہونے اور نہ ہونے کا گماں بار بار گزرتا رہا۔ اردو شاعری کے آداب اور مرزا غالب کی شبیہ کا ایک عکس بھی ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ رکھنے والوں نے یقیناً غالب کی دودھیا شبابی رنگت گھڑی مخملی چھتے دار ٹوپی، شاہانہ ٹھاٹ، رعب و دبدبہ، آداب محفل اور مغلیہ خدوخال سے واقف ہونگے۔ مگر یہاں مرزا اسد اللہ خاں غالب کی زبان میں نہ حرکات میں، وہ حرارت نہ قدرت، نہ اشعار کی ادائیگی میں دم خم، نہ تلفظ درست، نہ جملوں میں دروبست مائیک سنبھالتے ہی کہا" کچھ اسعار ارج ہے۔ پھر گویا ہوئے" کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں۔ آج گالب گجل سہرانہ ہوا" پھر کیا کہنے، غالب کی ایسی جان لیوا لغزش پر غزل کی آبرو خطرے میں پڑ گئی۔ سامعین کے درمیان سے قہقہے بلند ہونے لگے، فقرے بازی شروع ہوگئی ایسی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ غالب نے ہی تو یہ موقع فراہم کیا تھا۔ ویسے بھی اب سامعین تماش بین بن گئے ہیں، ادبی مجلسوں میں بھی مجمعے سے ٹھٹھولوں اور بھانڈوں جیسے داد ملتے ہیں پھر یہاں

غالب کی کیا خیر، ناظم مشاعرہ انور جلال پوری نے معاملے کو سنبھالا اور غالب کے تلفظ درست کروائے۔
وسیم بریلوی نے مشاعرے اور منتظمین دونوں کی لاج رکھ لی اور باذوق سامعین کے ذوق تسکین کا سامان بھی بنے۔ ظاہر ہے کہ کامیاب کاوش پذیرائی سے خالی نہیں رہتی۔ راہی بستوی، خمار بارہ بنکوی، نعیم اختر برہانپوری، اور انور جلال پوری کو سامعین نے پسند بھی کیا اور داد بھی دی۔ اسی داد بیداد کی یلغار خواتین کے مجمعے سے بھی بلند ہو رہی تھیں۔ شاید اس شہر میں یہ پہلا موقع تھا جب خواتین تالیوں سے ہی نہیں جملوں فقروں اور جوش وولولے سے اپنی حس طبع اور موجودگی درج کروا رہی تھیں۔
ہمیں گمان ہی نہیں یقین بھی ہے کہ ایک ہی نشست میں اتنے سخن ور، اور سخن فہم، یکجا ہرگز نہیں مل سکتے جنہیں املے کی درست ادائیگی میں بڑی دشواریوں کا سامنا تھا۔ ہر بار ہیں کہ جگہ ہے۔ کی ادائیگی جو شعر کے حسن و نزاکت اور معنویت کو معدوم کر رہی تھی۔ غزل کی قدر و قیمت اور مجلس شعر و ادب کی آبرو و وقار کا احساس جن ذہنوں میں موجود تھا، ان پر تو سکتہ طاری تھا۔
''بزم علم و ادب'' کی یہ کوشش اچھی ضرور تھی لیکن کامیاب اور لائق ستائش تب ہوئی جب شعراء کو اسٹیج پر پیش کرنے سے قبل ان کے طرز تخاطب اور تلفظ کی کلاس لے لی جاتی تاکہ بھری محفل میں مومن اور غالب کی آبرو کو یوں خطرہ لاحق نہ ہوتا ——

☆☆☆

اردو زبان و ادب سے مایوس لوگ دیکھیں ''تمثیل نو''

فنکاری، کاوش، خلوص، ریاضت سب یکجا ملیں گے

جو لوگ اردو کے مستقبل سے مایوس ہیں اور جن کو کہیں بھی کوئی بھی زبان و ادب کی بقا کے لئے کوشاں نہیں نظر آتا ان کے لئے دربھنگہ بہار کا ''تمثیل نو'' یقیناً امید افزا ہوگا۔
''تمثیل نو'' ایک ایسا جریدہ ہے جس میں وہ سب کچھ ہے جو کہ اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار سمجھنے والے کو درکار ہو۔ یہ رسالہ اس لحاظ سے اپنی نوعیت کا بالکل منفرد ہے کہ اس کا اداریہ کم و بیش تمیں صفحات پر مشتمل ہے جو کہ ایڈیٹر ڈاکٹر امام اعظم نے لکھا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کی رفتار اور تحریک سے جتنے واقف ہیں شاید بہت ہی کم ادیب اور صحافی ہوں گے۔ انہوں نے اپنے تمیں صفحات کے اداریے میں پورے اردو ادب کو کھنگال کر رکھ دیا۔ ہندوستان کا کوئی بھی گوشہ اور کوئی بھی اہم ادبی واردات ایسی نہیں جس کا انہوں نے ذکر نہ کر دیا ہو۔ اس باخبری اور ریاضت کے لئے وہ ہمیشہ مبارکباد کے مستحق رہیں گے۔
اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء کا شمارہ مولانا ابوالکلام آزاد پر خصوصی مضامین کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ مضامین بالکل نئے انداز اور نئی فکر کو پیش کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے باوقار ادیب اور رہنما تھے اسی وقار سے ان کی خدمات کا جائزہ لے کر ہر طرح انہیں سمجھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔
''تمثیل نو'' کے تمام مضامین، نظمیں، افسانے، غزلیں وغیرہ رسالہ تیار کرنے والوں کی ایمانداری اور محنت کا احساس دلاتی ہیں اور اگر اسی محنت اور لگن سے ہمارے ادیب صحافی منہمک رہیں تو پھر کسی کو اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہ ہوگی۔
(بہ شکریہ: ابراہیم احمد علوی، مدیر: روزنامہ آگ لکھنو مورخہ ۱۲ فروری ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ، (بہار)

کلکتے کا ایک یادگار سفر

'مسلم انسٹی ٹیوٹ' کولکاتا کے زیر اہتمام منعقدہ قومی سیمینار ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا رول'' مورخہ ۵ ر تا ۷ ر فروری ۲۰۱۰ء میں شرکت کی دعوت پر کلکتہ جانے کا موقع میسر آیا۔
گرچہ کلکتہ کا یہ میرا تیسرا سفر ہے۔ پہلا سفر ۱۹۷۲ء میں اپنے والد بزرگوار جناب ایم۔ زیڈ۔ ایم۔ زیڈ۔ فاروقی جو اس وقت ضلع مغربی چمپارن کے بتیا ٹاؤن تھانہ میں پولس آفیسر تھے، کے ہمراہ گیا تھا۔ ساتھ میں پولیس فورس تھی اور سکے علی پور میں واقع ٹکسال میں جمع کرنے تھے۔ ہمارے چھوٹے چچا محمد مظفر عالم مغربی بنگال پولیس میں تھے اور علی پور میں پوسٹیڈ تھے۔ ہم لوگ علی پور بیرک میں ٹھہرے تھے۔ کمسنی کا زمانہ تھا، کلکتہ کی رنگارنگی مرزا غالب کی نظروں سے دیکھی اور مبہوت و مسرور ہوا۔ دوسرا سفر مانو کا ریجنل ڈائرکٹر بننے کے بعد ''مسلم انسٹی ٹیوٹ'' میں قائم ریجنل سنٹر میں منعقد مانو کے کوآرڈینٹرس میٹنگ میں شرکت کے لئے ہوا۔ ۴ر جنوری ۲۰۰۶ء کو مسلم انسی ٹیوٹ کولکاتہ میں واقع مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے ریجنل سنٹر پر شمالی جنوبی بہار اور مغربی بنگال کے اسٹڈی سنٹرس کے کورڈ ینیٹرس کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم پروفیسر کے آر اقبال احمد اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر اے آر موسوی کے علاوہ دربھنگہ کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم ، اے آر ڈی ڈاکٹر عمران احمد پٹنہ کے انچارج ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر عید محمد انصاری اے آر ڈی ڈاکٹر محمد ثنا اللہ کورڈینٹرس شکیل احمد سلفی (دربھنگہ) شکیل چشتی (مظفرپور)، اعجاز حسین آزاد (سمستی پور) وجیہہ اللہ انصاری (مدھوبنی) اور غلام مشاہد (کشن گنج) وغیرہ کے علاوہ مغربی بنگال اور بہار کے جملہ کورڈینٹرس نے بھی شرکت کی۔ مانو کولکاتہ کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر قاضی رفیق الدین نے پروگرام کی نظامت کی۔ اے آر ڈی ڈاکٹر بدرالدین (رجیل صدیقی) نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ کولکاتہ اسٹڈی سنٹر کے کورڈینیٹر ڈاکٹر نعیم انیس نے تمام شرکا کو مانو کے طلبا کا رسالہ ''پرواز'' پیش کیا۔ میرے فرزند نوا امام نے اپنی سریلی آواز میں مانو کا ترانہ پیش کیا۔ مذکورہ میٹنگ میں مانو کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کے آر اقبال احمد نے کورڈینٹرس سے براہ راست گفتگو کی اور ان سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اسٹڈی سنٹر چلانے میں کن کن دشواریوں سے گذرنا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے ۲۰۰۶ء کو ''مسائل کے حل کا سال'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ اب ریجنل سنٹرس کو بہت ساری ذمہ داریاں دی جارہی ہیں اسے نباہنے کی کما حقہ کوشش کی جائے۔ میٹنگ کے اختتام کے بعد یہاں کی کئی مقتدر شخصیتوں میں احمد سعید ملیح آبادی، علقمہ شبلی سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ تھوری دیر کے لئے اپنے چچا کی قیام گاہ (سد کچھنا اسٹریٹ گوریا نزد پدوشری سنیما) بذریعہ ٹیکسی گیا جہاں تمام لوگوں سے ملاقات ہوئی۔
بعد ازاں شام میں معروف ادیب و شاعر ابوذر ہاشمی کی رہائش گاہ نیشنل لائبریری کوارٹر میں

ایک شعری نشست کا اہتمام زیر صدارت سابق ڈائرکٹر دوردرشن جناب انیس رفیع ہوا۔ جس میں شکیل احمد سلفی، عادل حیات، ابوذر ہاشمی فراغ روہوی، ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے اپنے کلام اور تاثرات پیش کئے۔ آخر میں صدارتی خطبہ میں انیس رفیع نے موجودہ ادبی منظرنامہ پر گفتگو کی اور دربھنگہ سے شائع ہونے والے ادبی جریدہ تمثیل نو کے گذشتہ دو شمارے کے نئے انداز فکر اور پیشکش کو سراہا۔ صدر موصوف نے یہ بھی کہا کہ غزل اب صرف عورتوں سے گفتگو کرنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس میں تمام موضوعات پیش کئے جارہے ہیں لیکن انہوں نے اس پیشکش میں تغزل پر زور دینے کی بات کی اس کے بعد ہم تمام لوگوں نے عشائیہ میں نفیس ولذیز کھانوں کا لطف اٹھایا اور پھر اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹ آئے۔ مگر یہ تیسرا سفر کئی جہتوں سے میرے لئے یادگار ثابت ہوا۔

کلکتہ جسے انگریزوں نے سمندری راستے سے تجارتی مقاصد کے تحت دریائے ہگلی کے دہانے پر بسایا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں والئ بنگال نواب سراج الدولہ کو پلاسی کی جنگ میں شکست دے کر انگریزی سلطنت کی بنیاد ڈالدی اور کلکتہ کو دارالسلطنت بنادیا۔ پھر تو رفتہ رفتہ یہ شہر مشرقی ہندوستان کا ایک بہت بڑا اقتصادی اور سماجی مرکز بن گیا۔ کاروبار کی غرض سے اگر انگریز، پرتگالی، آرمینین جوق در جوق آنے لگے تو ہندوستان کے حکمرانوں کے انتشار اور افرتفری کے درمیان انگریزوں کی بڑھتی قوت کے زیر سایہ اپنے جان و مال کی حفاظت اور تلاش روزگار کی غرض سے ملک کے کونے کونے سے ہندو مسلمان آکر بسنے لگے اور شہر کلکتہ ایک نئی تہذیب وتمدن کا علمبردار بن کر ابھرا۔ ہندوستان میں نہ صرف سب سے بڑا اور عظیم الشان عمارتوں کا شہر بن گیا بلکہ تاریخ میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، تمدنی، ثقافتی، علمی وادبی اور صحافتی کئی جہتوں سے انتہائی گہرے اور انمٹ نقوش بھی ثبت کئے۔

کلکتہ سے تجارتی سلسلے کو دراز کرتے ہوئے انگریزوں نے ملک پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ آریائی بھی آئے لیکن وہ اسی Khyber pass اور Bowlan pass سے آئے جو مغربی علاقہ تھا اور ہے۔ ہندو آریائی ہوں یا مسلم آریائی وہ سب ہندوستان کے مغرب سے آئے۔ دہلی اور آگرہ کو دارالسلطنت بنایا لیکن انگریزوں نے اپنی حکومت کلکتہ میں قائم کی اور دھیرے دھیرے مغرب کی طرف بڑھے اور پورے ہندوستان پر چھا گئے۔ اس لئے انگریزوں کی تہذیب وثقافت کے بیشتر نمونے آج بھی یہاں موجود ہیں جس میں وکٹوریہ میموریل، ہوڑہ برج اور خضرپور میں کھلتا اور بند ہوتا ہوا پل۔ بنگالیوں کے کلچر میں بھی انگریزیت کا اثر آج بھی نمایاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ فٹن گاڑی سے لے کر کار تک ہندستانیوں کو کلکتہ میں ہی سب سے پہلے دیکھنے کو ملا۔

وہاں کے لوگوں میں بڑا طبقہ نوکری پیشہ ہے۔ دیہی علاقوں میں کاشتکاری کا سلسلہ ہے اور فٹ پاتھ سے لے کر بڑی دکانوں تک تجارت کا جال بچھا ہے۔ محنت مزدوری کرنے کے لئے بہار اور دیگر علاقے سے لوگ کلکتہ میں معاش کا مسئلہ کے حل کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ انگریزوں کی شان کا مظاہرہ کرنے والے وہ ہتھ رکشے، جس پر شان سے بیٹھنے والا بھی انسان ہوتا ہے اور اسے کھینچنے والا بھی انسان

ہوتا ہے۔ آج بھی موجود ہیں۔ یہ رکشہ کھینچنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ یہ سارے علاقے لال سلام کے علاقے ہیں اور رکشہ چالک ان کے ممبران۔ ان کا لہو ہی لال سلام کی سرخی قائم رکھتا ہے۔ ٹرام بھی کلکتہ کی ایک پہچان ہے۔ زندگی وہاں بھاگ دوڑ کی ہے۔ اسٹیشن پر اگر آپ اتریں گے تو دیکھیں گے کہ لوکل ٹرینوں سے اترنے والے لوگ چل نہیں رہے ہیں بلکہ دوڑ رہے ہیں۔

میں ۵؍فروری ۲۰۱۰ء کو دربھنگہ سے بذریعہ گنگا ساگر ٹرین سے سیالدہ کے لئے روانہ ہوا۔ ۶؍فروری کی صبح سیالدہ پہنچا۔ وہاں سے بذریعہ ٹیکسی مقررہ قیام گاہ پرنس لاج پہنچا مگر وہاں کمرہ خالی نہیں ہونے کے سبب ڈاکٹر نعیم انیس (کنوینر سیمینار) نے مجھے وکٹوریا گیسٹ ہاؤس بھیج دیا۔ پروفیسر وہاب قیصر صاحب یہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں اپنے کمرہ سے فریش ہو کر موصوف سے ملنے گیا۔ انہوں نے ناشتہ کرایا۔ تھوڑی دیر بعد ادبی ماہنامہ ''انشاء'' کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز آ گئے۔ کچھ دیر ان سے بھی باتیں ہوئیں پھر وہ چلے گئے۔ وہاب قیصر صاحب حسب پروگرام سیمینار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب اور پہلے سیشن کی صدارت سے ۵؍فروری کو ہی فارغ ہو چکے تھے۔ آج انہیں کلکتہ کتاب میلہ میں ''اخبار مشرق'' کے اسٹال پر ایک کتاب کی رسم اجراء کر کے شام کی فلائٹ سے حیدرآباد واپس جانا تھا۔ اس لئے نعیم انیس صاحب نے موصوف کے لئے ایک گاڑی فراہم کردی اور مانو کے ایک طالب علم اختر حسین کو تواضع کے لئے ساتھ کر دیا۔ مجھے چونکہ اگلے دن آخری سیشن میں اپنا مقالہ پیش کرنا تھا لہٰذا مجھے بھی انہوں نے ساتھ لگا دیا۔ یہ میرے لئے باعث مسرت ٹھہرا۔ ہم لوگ کلکتہ کی سیر کرتے ہوئے سائنس سیٹی کے قریب واقع ملن میلہ گراؤنڈ میں منعقدہ کلکتہ کتاب میلہ پہنچے وہاں شائقین کا سیلاب دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جس میں بچے، عورتیں، جوان اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ ٹکٹ لینے والوں کی لائن دیکھ کر ہوش ٹھکانے آ گئے۔ جیسے تیسے اختر حسین نے ٹکٹ لیا اور ہم لوگ میلہ کے اندر داخل ہوئے۔۔ معلوم ہوا کہ اس پبلشرز اینڈ بک سیلرس گلڈ نے کلکتہ بک فیئر کا اہتمام ۱۹۷۶ء سے شروع کیا جو رفتہ رفتہ بین الاقوامی معیار کا کتاب میلہ بن گیا۔ یہ ۳۴واں کتاب میلہ بارہ دنوں کا تھا جس میں ملکی اور غیر ملکی ۱۶۰۰ بک اسٹال لگے تھے اور مقام حیرت ہے کہ کوئی بک اسٹال سونا نہیں لگا۔ کیوں کہ یہ اسٹالس صرف کتب فروشی نہیں کرتے تھے بلکہ علمی، ادبی، معلومات عامہ کے فروغ اور مختلف نوعیت کے تربیتی پروگرامس، علم نوازی اور ادب نوازی کے توسیعی پروگرامس کر رہے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ لوگ محض تماش بین تھے اور تفریحاً بھیڑ لگا رہے تھے بلکہ اسٹال سے کتابیں بھی خالی کر رہے تھے۔ اردو کے حوالے سے چند خوش آئند معلومات حاصل ہوئیں۔ اس میلہ میں پہلی بار کثیر تعداد میں اردو والوں نے دلچسپی لی اور ہر اردو اسٹال سے اردو کتابیں بٹورتے دیکھے گئے پہلی بار میلے کے ارباب اختیار نے اس سال کے تھیم ملک میکسیکو پویلین کے سائن بورڈ پر اردو کو بھی جگہ عنایت کی۔ جس کے نتیجہ میں تقریباً ہر سائن بورڈ پر اردو بھی نظر آئی۔ پورے میلہ میں سب سے زیادہ بھیڑ ''اخبار مشرق'' کے اسٹال پر اُمڈتی رہی کیونکہ اس اسٹال پر مسلسل بچے اور خواتین کی دلچسپی نیز ادباء و شعراء کو

نوازنے کے نت نئے پروگرامس کا اہتمام ہو رہا تھا۔ بہر حال ہم لوگ گھومتے گھامتے حسب پروگرام'' اخبار مشرق'' کے اسٹال پر پہنچے۔ وہیں مشتاق دربھنگوی جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں سے ملاقات ہوئی۔ استقبال و ضیافت کی رسم پوری کرنے کے بعد ڈاکٹر رحیل صدیقی کے کتابچہ'' حیات پریم چند'' کا اجرا پروفیسر وہاب قیصر نے کرتے ہوئے کہا کہ'' کلکتہ کتاب میلہ میں لوگوں کی بھیڑ خصوصاً اردو والوں کی بھیڑ اور دلچسپی دیکھ کر کافی خوشی ہوئی۔ یہ بھیڑ ثابت کرتی ہے کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ پروفیسر موصوف نے اردو کے فروغ کے لئے اخبار مشرق کی اس نئے انداز کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اخبار کا یہ قدم اردو کے مستقبل کے لئے فال نیک ثابت ہوگا۔ اس اسٹال پر طلبا و طالبات میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور ان کی صلاحیت کو بھارنے کے لئے طرح طرح کے پروگرامس کر کے نہ صرف بچوں کو انعامات و اکرامات سے نوازا گیا بلکہ ادباء و شعرا میں شفیع تمنا، منور رانا، نصر غزالی، ف۔س۔ اعجاز، مشتاق اعظمی، محبوب انور، عشرت بیتاب، رونق نعیم بھی نوازے گئے۔ مہتمم میلہ گلڈ کے سکریٹری تری دیب چکرورتی کے اعلانیہ کے مطابق قبل کے کتاب میلہ میں کتابوں سے دلچسپی رکھنے والوں کی عینی تعداد ہوا کرتی تھی، لیکن اس میلہ میں کتاب سے محبت کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تقریباً ۳ لاکھ شائقین اس میلہ میں پہنچے اور ۲۳ لاکھ کتابیں فروخت ہوئیں جو ایک ریکارڈ ہے۔ غرض اس نوعیت کا اور اتنا بڑا میلہ مجھے پہلی بار دیکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

میلے سے پروفیسر وہاب قیصر صاحب کو سبھاش چندر بوس ایئرپورٹ چھوڑتے ہوئے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے منعقدہ سیمینار میں پہنچے۔ جہاں کئی مقتدر شخصیتوں سے ملاقات ہوئی اور وہاں سے جاوید اختر کے ہمراہ نیشنل لائبریری کے ابوذر ہاشمی کی دعوت عشائیہ پر روانہ ہوئے۔ یہ ہاشمی صاحب سے ملنے کی بھوک تھی یا گھر کے عشائیہ کی طلب ہم وقت سے ذرا پہلے ہی وہاں جا پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ہاشمی صاحب جسٹس سید امیر علی لائبریری، اقبال پور کی انتظامیہ میٹنگ میں ہیں۔ ہم لوگ بھی وہیں چلے گئے، ڈاکٹر افتخار احمد (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج)، ایس ایم زماں، تسنیم حسین خاں، غلام ربانی صاحبان نیز دیگر اشخاص موجود تھے۔ ''تمثیل نو'' لائبریری کو تحفتاً پیش کیا پھر وہاں سے پاپیادہ ابوذر ہاشمی صاحب کے یہاں آئے۔ ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر افتخار احمد، جاوید اختر اور خاکسار سبھوں نے مل کر نفیس و پرتکلف کھانا تناول فرمایا اور دیر رات اپنے اپنے مستقر پر لوٹ گئے۔

گرد و نواح سے کافی لوگ کلکتہ میں نوکری کرنے کے لئے روزانہ آتے اور جاتے ہیں۔ وہاں ڈاک لیبر بورڈ، کلکتہ پورٹ میں کافی لوگ نوکری پا جاتے تھے۔ کیوں کہ پہلے سامان تو دوسرے ممالک میں بھیجنے کا ذریعہ پانی کے جہاز تھے اور غیر ملکوں سے آنے والے سامان بھی پانی کے جہاز سے ہی آیا کرتے تھے اس لیے کثیر تعداد میں مزدوروں کی ضرورت پڑتی تھی جس طرح آج کل خلیج میں لوگ جا کر نوکریاں کرتے ہیں کلکتہ بھی کسی زمانہ میں دیگر علاقہ کے لوگوں کو ملازمت دینے کے معاملہ میں خلیج سے کم نہ تھا۔

انگریزوں نے جو اسمبلیاں اور سکریٹریٹ بنائیں اس میں رائٹرس بلڈنگ کا کوئی جواب نہیں

ہے۔ انگریزوں نے جان گلکرائسٹ کی قیادت میں فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) وہیں قائم کیا جس میں ہندوستانی زبان اور بالخصوص اردو سے واقف کرانے کے لئے انگریز افسران کو یہاں خصوصی ٹریننگ کا انتظام تھا۔ دانش فرنگ نے کلکتہ کو نئے طرز و اسلوب پر ڈھالنے کے لئے ۲۴ رجنوری ۱۸۵۷ء کو لندن یونیورسٹی کے طرز پر کلکتہ یونیورسٹی قائم کی۔ پہلے چانسلر Viscount canning اور وائس چانسلر James William Colvile بنائے گئے۔ یہ یونیورسٹی اسی شہر کا طرۂ امتیاز ٹھہرا۔ کیونکہ اس نے سوامی وویکانند، نوبل انعام یافتہ رابندناتھ ٹیگور، بنکم چندر چٹرجی، سرجگدیش چندر بوس، سبھاش چندر بوس، پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، دوسرے صدر جمہوریہ سرو پلی رادھا کرشنن، نوبل انعام یافتہ بین الاقوامی سائنسداں سر چندر شیکھر وینکٹ رمن اور ماہر اقتصادیت امرتیہ سین، فلمی دنیا کی ممتاز ہستی ستیہ جیت رے، مرنال سین، ممتاز فیزیشین سبھاش مکھوپادھیائے، ہندی کی ممتاز ادیبہ مہا شویتا دیوی، بنگلہ دیش کے صدر شیخ مجیب الرحمٰن اور جسٹس عبدالستار، بابو جگ جیون رام، پاکستان کے دو وزرائے اعظم محمد علی بوگرا اور حسین شہید سہروڑی، پروفیسر شیاما پرشاد مکھرجی (بانی ہندو مہا سبھا اور بھارتیہ جن سنگھ) ممتاز ماہر لسانیات اور کئی کتابوں کے مصنف پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، مشہور سائنسداں پروفیسر میگھناتھ ساہا، مشہور مورخ جادوناتھ سرکار اور اکھل داس بندھوپادھیائے، انگریزی کی مشہور ادیبہ بھارتی مکھرجی، ممتاز شاعر و ادیب، سنیل گنگوپادھیائے (موجودہ صدر ساہتیہ اکادمی)، ہندی کے ممتاز ادیب آچاریہ کبیر ناتھ رائے، پاکستان کی معروف مصنفہ شائستہ سہروردی اکرام اللہ اور انگریزی ادیبہ زیب النسا حمید اللہ وغیرہ جیسے علم و ادب کے آفتاب و ماہتاب کلکتہ یونیورسٹی کی دین ہیں۔

یہاں اردو کا بول بالا تھا۔ بنگلہ کے ساتھ اردو بھی اپنی مقبولیت میں کسی قدر کم نہ تھی۔ اس کی گواہ آج بھی مدرسہ عالیہ ہے۔ وہ لق ودق عمارت اور وہاں پڑھنے پڑھانے کا انتظام آج بھی ہے۔ اردو کے لئے بہت ہی مقدس جگہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اب یہ عالیہ یونی ورسٹی ہوگئی ہے۔ اس مدرسہ میں مرزا غالب نے مشاعرہ پڑھا ہے۔ اردو کی شناخت سنیتی کمار چٹرجی اور اس کی اہمیت کو بتانے کا کام اسی کلکتہ کی سرزمین پر اسی لسانایت کے ماہر نے کیا۔ بیشتر ادارے اس زمانہ میں بھی قائم تھے جو اردو کی آبیاری کر رہے تھے اور غالب بھی کولکاتہ سے پذیرائی حاصل کر کے بیحد محظوظ ہوئے۔ اتنا ہی نہیں طرحی مشاعروں کا ایک دراز سلسلہ تھا۔ داغ دہلوی اور جگر مرادآبادی کی گاہے گاہے کلکتہ آمد سے یہاں کے شعری ماحول کو جلا ملتی رہی۔ استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی بھرپور روایت یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ عہد بدلتے رہے لیکن ابراہیم ہوش، وحشت کلکلوی، نوح ناروی، جرم محمد آبادی، شاہ مقبول احمد عبدالعلیم آسی، اشک امرتسری، پروفیسر عباس علی بیخود، نواب دہلوی وغیرہ نے شاعری کو اور عبدالرزاق ملیح آبادی، ل۔ احمد اکبر آبادی، احمد سعید ملیح آبادی، نامور صحافی ایم۔ جے۔ اکبر، کلیم الدین شمس (سابق ڈپٹی اسپیکر)، ہاشم عبدالحلیم (اسپیکر مغربی بنگال) نے ادب، صحافت اور سیاست کو صحت مند بنانے میں کافی اہم

کردار ادا کیا۔ اردو کے ساتھ خاص طور پر فارسی زبان و ادب کے فروغ میں ایران سوسائٹی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بانی پروفیسر محمد اسحاق تھے۔ یہ سوسائٹی حکومت ایران کے ثقافتی تعاون سے ہمیشہ سرگرم رہی ہے اور اس کا مجلّہ ''انڈو ایرانیکا'' حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی اپنی منفرد حیثیت ہے۔ کیوں کہ اس کے پہلے چیئرمین آنجہانی جیوتی بسو ہوئے۔ انہوں نے بھی اردو کے فروغ کے لئے بہت کام کیا۔ عربی و فارسی کے اسکالر مولانا عبدالکریم معصومی وائس چیئرمین بنگال اردو اکادمی رہے اور وہیں مدفون ہوئے۔ مرحوم مدرسہ کے پرنسپل بھی تھے۔ دورِ حاضر میں بہت سے شعرا یہاں موجود ہیں جن میں ناظم سلطان پوری، حبیب ہاشمی، نصر غزالی، اعزاز افضل، قیصر شمیم، سالک لکھنوی، علقمہ شبلی، شہود عالم آفاقی، احمد رئیس، منور رانا، عین رشید، سفیر الدین کمال، ف۔ س۔ اعجاز، ڈاکٹر شہباز نبی، ڈاکٹر یوسف تقی، شمیم انور، انجم عظیم آبادی، معصوم شرقی، ابوذر ہاشمی، بازغ بہاری، نعیم انیس، فراغ روہوی، نوشاد مومن، ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، عمران راقم، شگفتہ یاسمین غزل وغیرہ، اردو ڈرامہ نگاروں میں ظہیر انور، کمال احمد، نوشاد رضا وغیرہ، افسانہ نگاروں میں محمد یونس احمر، نشاط الایمان، شاہ خلیل الرحمٰن لکھیموی، ضیا عظیم آبادی، ڈاکٹر ظفر اگانوی، انیس رفیع، فیروز عابد، محترمہ شہیرہ مسرور، مشتاق انجم، مقصود دانش وغیرہ کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔

اردو صحافت کو یہاں عروج حاصل ہوا۔ اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' یہیں سے شائع ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' یہیں سے جاری کیا اور آج بھی مغربی بنگال کے اخبارات آزاد ہند، آبشار، اخبار مشرق اور دیگر رسائل و جرائد یہیں سے شائع ہوتے ہیں۔ ادبی جرائد ہمیشہ سے کلکتہ سے شائع ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ جب محمڈن اسپورٹنگ، ایسٹ بنگال، موہن بگان کے فٹ بال کے عروج کا زمانہ تھا اس زمانہ میں بھی اردو کے چھوٹے بڑے رسالے اسپورٹس کے نام پر شائع ہوتے رہے جس میں اسپورٹس اور تفریح قابل ذکر ہے۔ اس میں بھی ادبی حصے ہوا کرتے تھے اور کلکتہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں امیروں کی بھی گنجائش ہے اور غریبوں کو بھی جینے کے تمام وسائل کم قیمتوں میں دستیاب ہیں جو دوسرے بڑے شہروں میں موجود نہیں۔ کلکتہ خود اپنے آپ میں ایک ریاست ہے۔ اس سے جڑے ہوئے اضلاع کو بھی شامل نہیں بھی کیا جائے تو آبادی اور رقبہ کے حساب سے کلکتہ بہت بڑا ہے۔ کلکتہ میں تھیٹر کا رواج رہا ہے اور اردو ڈرامے بھی وہاں اسٹیج کئے جاتے رہے۔ ربندر و سنگیت کا چلن عام ہے۔ ملک میں یوں تو علاقائی فلمیں بہت جگہ بنتی ہیں لیکن بنگلہ فلموں میں کہانی کا تانا بانا ہندی فلموں سے بھی بہتر ہے اور بنگلہ ناولوں میں کہانی اور کہانی کی رفتار بہت تیز ہے۔ لیکن اردو والوں نے ان کہانی کاروں سے کلکتہ میں کچھ حاصل نہیں کیا۔ کلکتہ کی سرزمین فنکاروں کا گہوارہ ہے۔ امید کہ نئی نسل کے لوگ بہت کچھ اور بھی کلکتہ سے اردو کے خزانہ میں اضافہ کریں گے۔

کلکتہ کے نیشنل لائبریری میں آج بھی اردو والوں کے لئے ذوق کی تسکین کے بیحد سامان موجود ہیں۔ یہاں ہندوستان کی ہر زبان میں کتابیں موجود ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کے شعبے بھی قائم ہیں۔ یہ

ایشیا کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ پورے طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ داخلہ بلا فیس ہے۔ کئی دہائی قبل کلکتہ کو مرکزیت حاصل تھی۔ شاعر، ادیب، فن کار، صحافی یا مزدور کسی کو بھی اگر باہر جانا ہوتا تو وہ کلکتہ ہی کا رخ اختیار کرتا۔ دہلی کی طرف برائے نام لوگ جاتے تھے۔ لیکن اب کلکتہ کے بجائے دہلی لوگ جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز نے کلکتہ ہی سے اپنی ادبی شناخت بنائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے ہفت روزہ ''نقاش'' اور روزانہ ''کارواں'' کے مدیر یونس نظری کے بلاوے پر جناب مظہر امام بھی کولکاتہ گئے۔ وہاں کئی روزناموں سے وابستہ ہوئے پھر سی ایم او ہائی اسکول میں استاد رہے۔ ان کا تشکیلی دور کلکتہ ہی سے شروع ہوتا ہے۔ معروف شاعر جناب پرویز شاہدی سی ایم او ہائی اسکول میں پرنسپل رہے اور یہیں مدفون ہوئے۔ اسی طرح اویس احمد دوراں، ڈاکٹر ظہیر ناشاد دربھنگوی کی علمی و ادبی خدمات کلکتہ کی رہین منت ہے۔ واضح ہو کہ معروف شاعر احسان دربھنگوی اپنے چھوٹے بھائی اویس احمد دوراں کو کلکتہ لے گئے۔ ڈاک لیبر بورڈ میں ادھر کے کافی لوگ تھے جن میں سید رضی حیدر، سید تقی حیدر دونوں بھائی بھی تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے فراخ دل وائس چانسلر سر آسوتوش مکھرجی نے شعبۂ اسلامیات، شعبۂ عربی و فارسی اور شعبۂ اردو قائم کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں اردو کی یونیورسٹی سطح کی تعلیم میں اس یونیورسٹی کو قدامت حاصل ہے۔ اردو کی پہلی پی ایچ۔ ڈی۔ بھی یہیں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کو تفویض ہوئی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی (پروفیسر اقبال چیئر) کافی عرصہ تک وہاں رہے۔ ترقی پسند تحریک کے اہم رکن اور ممتاز نقاد، افسانہ نگار، مترجم اختر حسین رائپوری نے کئی اہم ترجمے کیے جن میں کالی داس کی شکنتلا، قاضی نذرالاسلام کی نظموں کے ترجمے اور پرل بک کے ناولوں کے ترجمے مشہور ہیں۔ ادیب سہیل اور انور عظیم بھی عرصے تک کلکتہ کی سرزمین پر ادب کی خدمت کرتے رہے۔ فارسی کے ممتاز اساتذہ میں فارسی میں علامہ وحشت کلکتوی، پروفیسر عباس علی خاں بیخود، پروفیسر مسعود حسن، پروفیسر مجیب الرحمٰن، پروفیسر عطا کریم برق وغیرہ کے نام بھی اہم ہیں۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری، پروفیسر کوکب مرزا (علی گڑھ)، پروفیسر جمیل مظہری نے کلکتہ یونیورسٹی سے فراغت حاصل کی۔ جمیل مظہری کا تعلق یہاں سے گہرا تھا۔ چونکہ ان کے چھوٹے بھائی رضا مظہری یہیں رہتے تھے اس لئے جمیل مظہری کی آمدرفت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر جاوید نہال اور پروفیسر عبدالمنان صاحبان کی بھی کئی کتابیں ہیں اور درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ معروف افسانہ نگار شین مظفر پوری، کلام حیدری، ممتاز نقاد پروفیسر وہاب اشرفی، وکیل اختر، معین اعجاز، کمال جعفری، اشہر ہاشمی کی نسبت بھی اس شہر سے رہی۔ ایل این ایم یو کے سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر رئیس انور کی تعلیم و تربیت بھی یہیں سے ہوئی۔ ابھی میں کلکتہ گیا تو اسی وقت سرکاری اعلان یہ ہوا کہ مسلم اقلیتوں کو ۱۵ فیصد ریزرویشن دیا جائے گا۔ کلکتہ سیاسی اعتبار سے لال سلام کا علاقہ ہے۔ ابھی کچھ علاقوں میں ترنمول کانگریس نے بھی جگہ بنائی ہے جس کی ایک مثال حالیہ بلدیاتی انتخاب ہے۔ لیکن تمام سیاسی بیداری کے باوجود مسلم اقلیت کے ۲۷ فیصد آبادی کا ۵۷ فیصد حصہ ناخواندہ ہے۔ ملازمت میں ایک فیصد بھی نہیں ہے اور آبادی کا بڑا حصہ خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزار

رہا ہے، اشتراکی پارٹیوں نے دعوے تو بڑے بڑے کئے لیکن اردو اور قلیت کو راحت پہنچانے کا کوئی کام نہیں کیا۔ اس لئے یہ سب دیکھ کر کچھ مایوسی ہوتی ہے لیکن ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ :

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں   میرا حق ہے فصل بہار پر

ہم مایوس نہیں ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اردو جیسی زبان کو بولنے والے اور پسند کرنے والے اپنا حق لے کر رہیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو کے ساتھ بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ کہیں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ فرقہ پرستوں کی طاقت اس قدر ہے کہ اردو کے فروغ کے لئے بنیادی تعلیم کے ڈھانچے کو مضبوط بنانا ہے اور ہم نے جو اس سفر میں لوگوں سے ملاقات کی اور فعال لوگوں کی جماعت دیکھی تو اس سے میں نے اندازہ کیا کہ زبان اردو کو وقتی طور پر دشواریوں سے گزرنا پڑ رہا ہے لیکن نئی نسل اپنے فرض اور تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اس طرح مجھے لگا کہ کلکتہ کو لکاتہ بننے کے مرحلہ تک بہت کچھ کھو بھی چکا ہے اور بہت کچھ بدل چکا ہے۔ البتہ کلکتہ میں مسلم ہوٹلوں کی کمی نہیں۔ اچھے اور نفیس قسم کے ہوٹل وہاں ہیں جو کل بھی اچھے تھے اور آج بھی اچھے ہیں۔ مثال کے طور پر امینیہ (بریانی) کارپوریشن اسٹریٹ، صابرس (رزالہ) چاندنی چوک، ہوٹل گرینڈ دھرم تلہ، ہوٹل عالیہ بینٹک اسٹریٹ، رائل انڈین لکھنو ہوٹل (چاپ اور رومالی روٹی) ناخدا مسجد کے قریب، نظام ریسٹورنٹ (کھیری کباب، اور پراٹھا) نیو مارکیٹ کے قریب، ہوٹل ارسلان (تمام مغلئی کھانوں کے لئے) پارک اسٹریٹ، ہوٹل ذیشان سید امیر علی اوینو غیرہ وغیرہ ہوٹل مشہور ہیں۔ جو آج بھی اپنے مغلئی کھانوں کے لئے کافی شہرت رکھتے ہیں۔

۷رفروری کی صبح بزرگ شاعر جناب علقمہ شبلی سے ملنے چلا گیا۔ میرے برادر نسبتی شہیر امام (انڈس انڈ بینک میں وائس پریسیڈینٹ) ہیں ان کے یہاں بھی جانا تھا لیکن فاصلے اور وقت کی کمی کے سبب نہ جاسکا۔ ہمارے خسر محترم پروفیسر سید منظر امام (دھنباد) بھی تشریف لائے تھے وہ اپنی بھتیجی فرزانہ امام (بنت جناب مظہر امام) سے ملنے آئے تھے لیکن ہماری ملاقات ان سے نہ ہوسکی۔ کولکاتہ کی بے حد فعال سماجی شخصیت سلمان اختر جو کئی اداروں سے وابستہ ہیں اور ملی درد رکھتے ہیں سے مل کر کافی خوشی ہوئی۔

مسلم انسٹی ٹیوٹ جس نے اپنے قیام کے ۱۰۸ سال پورے کر لئے ہیں آج بھی ملی اور ثقافتی سرگرمیوں کا سب سے بڑا اور معتبر مرکز ہے۔ یہاں ہر سال مختلف موضوعات پر سیمینار ہوا کرتا ہے۔ انجمن اسلامیہ پٹنہ کی طرح ''میرج ہال اور کمرشیل مال'' نہیں بنا ہے کہ اس کی زمام دانشوروں کے ہاتھوں میں ہے جو ملّت کا درد رکھتے ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ سے گم ہوتے مسلم تاریخ ساز کرداروں کی بازیافت کے لئے ایسا سیمینار منعقد کرایا جو میرے خیال میں تحریک آزادی پر ملک بھر میں منعقدہ متعدد سیمیناروں میں قدرے الگ نتائج کا حامل رہا۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں کے مشاہیر و دانشور و محققین نے مسلمانوں کے تئیں تعصب پرست مورخین کے منفی رویے کو باطل قرار دیتے ہوئے تاریخ کے نئے ابواب کھولے۔ خطیبوں، مقالہ نگاروں اور سامعین میں دونوں فرقے کے لوگ تھے اور دونوں پلڑے برابر تھے۔ بیرون کلکتہ سے آئے مقالہ

نگاروں میں پروفیسر بنجامن ذکریہ (شفلیڈ یونیورسٹی، انگلینڈ)، انیس رفیع، پروفیسر وہاب قیصر (انچارج رجسٹرار مانو حیدرآباد) امام اعظم (ریجنل ڈائرکٹر مانو، دربھنگہ)، ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر باقی مرزا اور ڈاکٹر رضوان قیصر (جامعہ ملیہ)، ڈاکٹر ارشاد نیر (این سی ای آر ٹی، نئی دہلی) اور مقامی مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر گوتم بھدرا، ڈاکٹر آنند بھٹا چاریہ، پروفیسر برون ڈے، پروفیسر المند وڈے، ڈاکٹر امیٹ ڈے، پروفیسر ارون بندو پادھیائے، پروفیسر سلیمان خورشید، ڈاکٹر انور حسین (رجسٹرار عالیہ یونیورسٹی)، پروفیسر بولائی بروئی، پروفیسر گوتم باسو، ڈاکٹر نندنی بھٹا چاریہ، ڈاکٹر شروتی گپتو، ڈاکٹر عقیل احمد (ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سیمینار پانچ نشستوں میں ہوا۔ پروفیسر برون ڈے نے تاریخی دلائل سے ثابت کیا کہ جنگ آزادی کا بگل سب سے پہلے مسلمانوں نے بجایا تھا۔ ڈاکٹر کیکا دتہ نے یوم راشد علی کے اسباب اور ۱۹۴۶ء کے حوالے سے مسلم طلبا کی تحریک کو اجاگر کیا تو ڈاکٹر شروتی گپتو نے کہا کہ نیتا جی سبھاش چندر بوس کے آزاد ہند فوج میں لوگ صرف جنرل شاہنواز اور کرنل محبوب کو جانتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام بڑے عہدے پر مسلمان ہی فائز تھے اور یہی افسران نیتا جی کو پروجیکٹ کرتے تھے۔ تاریخ کے بند باب میں بیر بھوم کی رانی لال بی بی کا ذکر تو قدرے مل جاتا ہے مگر بنگال کی سینکڑوں مسلم خواتین جنہوں نے بنگال کے شعلہ تحریک کو جولا بنایا اسے تاریخ میں جگہ نہیں ملی۔ اس سیمینار نے ان کی خدمات کو روشن کیا۔ راقم الحروف نے جنگ آزادی کے حوالے سے مولانا آزاد کی گرانقدر خدمات پر روشنی ڈالی۔ مسلمانوں کو جہلاء کی امت باور کیا جاتا ہے لیکن پروفیسر پردیپ مجمدار نے ایشیاٹک سوسائٹی کی ایک کتاب کے حوالے سے تقریباً سو مسلم سائنس دانوں اور ماہر ریاضیات کے نام گنوائے اور کہا کہ عطاء الحکیم علم ریاضی میں کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے پی ایچ۔ ڈی تھے۔ اور زیب النساء پہلی خاتون تھیں جنہوں نے مدراس یونیورسٹی سے ریاضی میں پی ایچ۔ ڈی کیا تھا۔

اختتامی خطاب میں بھی لوگوں نے زور دیا کہ سیمینار کے ذریعہ کھوجے گئے تاریخ کے گمشدہ صفحات کو تاریخ کا حصہ بننا چاہئے اور پروفیسر ارون بندو پادھیائے کے موقف کا اعادہ کیا گیا کہ اس طرح کے سیمینار بار بار اور ملک کے مختلف گوشے میں کرائے جائیں تاکہ گمراہ کن تاریخ سازی کے رویے کو ضرب لگے۔ سیمینار بہت کامیاب رہا نہ کہ صرف تقریریں ہوئیں اور مقالے ہی نہیں پڑھے گئے بلکہ گرما گرم بحث و مباحثے بھی ہوئے۔ ایسے کامیاب سیمینار کے اہتمام کے لئے ارباب مسلم انسٹی ٹیوٹ بالخصوص صدر انسٹی ٹیوٹ جناب ایم۔ ایچ۔ صفوی، جنرل سکریٹری پروفیسر سلیمان خورشید اور کنوینر ڈاکٹر نعیم انیس قابل مبارک باد و تحسین ہیں۔

تیسرے روز سیمینار کی بساط سمٹ گئی تو شام کے ۶ بجے سے کل ہند مشاعرہ شروع ہوگیا۔ کلکتہ میں مشاعرے کی روایت اس کے وجود سے جڑی ہوئی ہے۔ گورنر جنرل لارڈ وارن ہسٹنگو نے ۱۷۸۱ء میں

مسلمانوں کو اسلام کے ساتھ عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے ویلیز لی اسکوائر (موجودہ حاجی محمد محسن اسکوائر) میں مدرسہ عالیہ قائم کیا۔ ہندوستانی حکمرانوں کی طرز پر انگریز حکمراں بھی مشاعرے کے اہتمام میں دلچسپی لینی شروع کی اور مدرسہ عالیہ مشاعرہ گاہ بن گیا۔ کلکتہ میں پناہ گزیں اور انگریزی سرکار سے وابستہ ہندو مسلم امرا اور رؤساء کے چند نفوس پر مشتمل ایک انجمن بنائی ہوئی تھی جو مشاعرے کے اہتمام میں سرگرم رہا کرتی تھی۔ اس کی باقاعدگی اور ہماہمی ایسی تھی کہ اس سے متاثر ہو کر زبان اردو سے آشنا انگریزوں نے بھی شاعری شروع کر دی تھی۔ اس کی کئی نشستوں میں مرزا غالب کے شرکت کی بھی شہادت ملتی ہے۔ اس طرح کلکتہ میں مشاعرے کی مستحکم روایت قائم ہوئی جس کا سلسلہ آج تک بھی اسی ذوق و شوق سے قائم ہے مگر اب اس کا مرکز ''مدرسہ عالیہ'' کے بجائے اکثر ''مسلم انسٹی ٹیوٹ'' ہوا کرتا ہے۔

میں اپنے کمرہ سے تیار ہو کر مشاعرہ گاہ آ رہا تھا کہ راستے میں ڈاکٹر افتخار احمد مل گئے اور انہوں نے نوجوان قلم کار ڈاکٹر ہمایوں جمیل خاں سے ملاقات کرائی۔ ان سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کا آڈیٹوریم سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا۔ آغاز مشاعرہ سے قبل ڈاکٹر عبدالباقی مرزا بیگ کی نئی تصنیف ''جہانِ رومی'' کی رسم رونمائی پروفیسر سلیمان خورشید کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ بعد ازاں پروفیسر موصوف نے بحیثیت جنرل سکریٹری مسلم انسٹی ٹیوٹ کی کارگزاری اور سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ ان کے بعد ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے اپنی نعت پاک سے مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ناظم سلطانپوری کی صدارت اور منصور عثمانی کی نظامت میں نہایت خوش اسلوبی سے رات کے دو بجے تک مشاعرہ چلا جس میں افضال احمد سید (کراچی)، الطاف ضیاء، مالیگاؤں، جمیل خیر آبادی، تنویر غازی امراوتی، ممتاز عارفی کولکاتہ، نعیم اختر برہان پوری، انجم عظیم آبادی، نزہت نگار مراد آباد، لتا حیا، زینت اعظمی مراد آبادی، رستم رامپوری، شکیل انصاری، ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ، ڈاکٹر مرزا عبدالباقی بیگ دہلی، آغا سروش حیدر آباد، نوشاد مومن، عقیل نعمانی مراد آباد، حبیب ہاشمی، دلکش مراد آبادی، طاہر فراز، منصور عثمانی اور ناظم سلطان پوری نے اپنے کلام کی داد خوب خوب وصول کی۔ ان کے علاوہ دیگر مقامی شعراء کے بھی کلام سے سامعین محظوظ ہوئے۔ پاکستان کے افضال سید کی شرکت سے یہ مشاعرہ بین الاقوامی سطح پا گیا اتنے کامیاب مشاعرہ کے انعقاد کا سہرا ارباب انسٹی ٹیوٹ کے سر جاتا ہے۔

۸؍فروری کو میری واپسی تھی۔ کمرے پر ملنے ڈاکٹر نعیم انیس صاحب آ گئے۔ ان کے ہمراہ مشتاق احمد بھی تھے جو ہائی اسکول میں انگریزی کے استاد ہیں۔ نعیم انیس نے اپنی کئی کتابیں تحفتاً پیش کیں۔ دن کے کھانے کے بعد ٹیکسی سے سیالدہ اسٹیشن پہنچا جہاں سے وقت مقررہ پر تو ٹرین کھلی لیکن جھاجھا اسٹیشن سے پہلے ٹرین رک گئی کیونکہ ماؤنوازوں نے ریلوے پٹری اکھاڑ دی تھی۔ ٹرین انتہائی اکتا دینے والی تاخیر سے ۹؍فروری ۲۰۱۰ء کو دربھنگہ پہنچی۔ اس طرح کلکتہ کا یہ دلچسپ سفر میرے لئے یادگار بن گیا۔

☆☆☆

اردو تلفظ کی زبان ہے۔

اقبال انصاری، ایف۔176 پانڈو نگر، لین نمبر 3، دہلی 110091

ایک کمزور عورت

ان پر نگاہ پڑتے ہی ایک بڑا خوش گوار جھٹکا ذہن پر بھی محسوس ہوا اور دل پر بھی۔ نگاہ ان کے چہرے پر جم گئی۔ اچانک لمحے بڑی سرعت سے پیچھے کو بھاگنے لگے۔

پچیس برسوں کو ماضی میں سمٹنے میں پچیس سیکنڈ بھی نہیں لگے۔ آن کی آن میں وہ پچیس برس ماضی میں بہت اندر تک سرک گئے۔ مجھے یاد آیا... وہ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کا آغاز تھا... تب ان کے سر کے بال سیاہ تھے، چمکیلے سیاہ، اور جسم دبلا پتلا۔ بہت دبلا پتلا نہیں، بس اوسط... اور ہاں، تب آنکھوں پر کوکا کولا کلر کا چوڑے سے فریم والا چشمہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہر صبح نو بجے دفتر جاتے ہوئے میرے پروویژن اسٹور پر آتے تھے... خاموشی سے آتے، خاموشی سے فور اسکوائر کا پیکٹ میرے ہاتھ سے لیتے، خاموشی سے قیمت کاؤنٹر پر رکھ دیتے اور خاموشی سے چلے جاتے۔ بس پہلی بار جب وہ آئے تھے تو دھیمی سی آواز میں بڑے مہذب طریقے سے کہا تھا "پلیز، فور اسکوائر کا ایک پیکٹ دے دیجئے۔" اس کے علاوہ کبھی ایک لفظ بھی انہوں نے مجھ سے نہیں کہا تھا۔ میں بھی کبھی ان سے نہیں بولی تھی۔ کچھ تھا ہی نہیں تھا بولنے کو کیا بولتی؟ ان کی شائستگی بہت اچھی لگتی تھی، اور خاموشی بھی۔

ان کا ملازمتی ہفتہ بھی پانچ دن کا ہوتا تھا، مگر وہ سنیچر اور اتوار کو بھی صبح نو بجے میرے پروویژن اسٹور پر آتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میں سگرٹ کا پیکٹ ریک سے اٹھا کر انہیں پکڑا دیتی تھی۔ وہ خاموشی سے قیمت کاؤنٹر پر رکھ کر چلے جاتے تھے۔ کالونی میں چوتھی گلی میں ان کا مکان تھا۔ چھوٹی سی پرائیوٹ کالونی تھی، اس لئے جو یہاں کے باشندے تھے، سب ایک دوسرے سے واقف تھے، جو کوئی کسی دوسری جگہ سے آ کر یہاں آباد ہو جاتا تھا، اس سے پوری کالونی جلد ہی واقف ہو جاتی تھی۔ مجھے بھی جلد ہی ان کے بارے میں علم ہو گیا۔ ان کا نام نیلیش پرتاپ سنگھ تھا، دو بچے تھے، پتنی بہت سندر تھیں، اور بہت گھمنڈی اور بدمزاج، پتی سے کچھ، بہت زیادہ بنتی نہیں تھی، بڑے باپ کی بڑی لاڈلی بیٹی تھیں۔ ان کے پتا نے ہی کالونی میں سو گز زمین خرید کر تین کمروں کا ایک اچھا خوبصورت مکان بنوا دیا تھا۔ نیلیش ریلوے میں ملازم تھے۔ دفتر بڑودا ہاؤس میں تھا۔

میرے پتی شری ملاپ چند دھیگر دن بھر سندر جی کی بگیا میں اپنے ہی جیسے چند لوگوں کے ساتھ بیٹھے تاش کھیلتے رہتے تھے۔ سگرٹ پیتے رہتے تھے شام کو مجھ سے پیسے لے کر ٹھیکے پر جا کر دارو کی بوتل خرید لاتے تھے۔ رات کو دارو پینے کے بعد کچھ دیر گالی گلوج کرتے، کبھی کبھار ایک آدھ تھپڑ تماچہ بھی رسید کر دیتے، کھانا کھاتے، دو تین سگرٹیں پی لیتے، اپنی ضرورت پوری کرتے اور سو جاتے تھے۔ ہمارے تینوں بچے حالانکہ اسکول جاتے تھے، مگر ویسی ہی اٹھان اٹھ رہے تھے جیسی اٹھان ایک نکمے، نکھٹو اور شرابی باپ کے بیٹے اٹھتے ہیں۔ مکان ہمارا اپنا تھا، میرے پاپا نے میرے نام بنوا کر ہمیں دے دیا تھا۔ اس کے سامنے والے حصے میں رولنگ شٹر لگوا کر میں نے دیواروں میں ریکیں بنوائی تھیں اور اس میں ایک چھوٹا سا پروویژن اسٹور قائم کر لیا تھا۔ پروویژن اسٹور اچھا چل رہا تھا۔ عورت اگر گریجویٹ، خوش اخلاق اور خوش شکل ہو تو بڑی آسانی سے پروویژن اسٹور بھی اچھا چلا لیتی ہے۔ میں پروویژن اسٹور بھی چلا رہی تھی اور اس کی آمدنی سے گھر بھی چلا رہی تھی۔ بچوں کی پڑھائی بھی چلا رہی تھی، اپنے پتی کی دارو اور سگرٹیں بھی چلا رہی تھی۔

دو برس ہو گئے نیلیش جی کو میرے پروویژن اسٹور سے ہر صبح سگریٹ خریدتے۔ ایک دن سگریٹ کا پیکٹ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے دھیرے سے کہا "سگرٹ نہ پیا کیجئے... اچھی چیز نہیں ہے۔"

ان کی نگاہ میرے چہرے پر جیسے چپک کر رہ گئی۔ کئی پل... شاید بہت سے پل گذر گئے۔ پھر وہ چونک پڑے۔ سگرٹ کا پیکٹ میرے ہاتھ سے لیا، قیمت کاؤنٹر پر رکھی اور چلے گئے۔

اس دن سے انھوں نے آنا بند کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کا نہ آنا مجھے کیوں اچھا نہیں لگا.... مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا آنا مجھے کیوں اچھا لگتا تھا۔ بہر حال مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ہلکا سا صدمہ پہنچا ہے۔ صبح نو بجے اگر میں مصروف بھی ہوتی تو بھی ۔ بے ارادہ وہ بے اختیار نگاہ اٹھ جاتی، اور گلی کے نکڑ تک جا کر بجھی بجھی سی واپس آ جاتی۔

ایک دن اپنے آپ معلوم ہو گیا کہ نیلیش پرتاپ سنگھ کی ترقی ہو گئی ہے اور الہ آباد تبادلہ ہو گیا ہے۔ وہ الہ آباد کے ہی رہنے والے تھے۔ مکان کرایے پر اٹھا کر مع فیملی کے الہ آباد چلے گئے تھے۔ وہی دھیما دھیما سا صدمہ کچھ زیادہ ابھر کر محسوس ہوا۔

رفتہ رفتہ نیلیش پرتاپ سنگھ ماضی ہوتے چلے گئے۔

آج پچیس سال بعد اچانک انہیں دیکھ کر چونکنا لازمی تھا... چونکنا بھی اور اچھا لگنا بھی۔ پھر اپنے آپ نظر ان کے چہرے سے ہٹ کر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر گئی۔ صبح کے نو بجے تھے۔

شاید میری آنکھوں یا میرے چہرے سے عیاں ہونے والی شناسائی اور شاید... شاید خوشی کی جھلک نے انہیں بولنے کی تحریک دی... اپنی دھیمی آواز اور شائستہ لہجے میں انہوں نے پوچھا "کیسی ہیں مسز ڈھینگرا؟"

"ٹھیک ہوں" میری آواز مجھے خود اچھی لگی "آپ کیسے ہیں؟ کیا دہلی واپس آ گئے ہیں؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں" دھیمے سے تبسم نے ان کے چہرے کو اور خوشگوار بنا دیا" جوائنٹ ڈائریکٹر ویجیلنس کی حیثیت سے پرموشن ہو گیا ہے اور تبادلہ دہلی ہو گیا ہے" بے اختیار میرے منہ سے نکلا، خوشی ہوئی.... اچھا لگا"۔

کچھ اور نکھری مسکراہٹ کے ساتھ بولے کیا؟ پرموشن یا دہلی واپس آنا؟"

میں نے کہا "دونوں" اور ہاتھ بڑھا کر ریک سے فوراً اسکوائر کا پیکٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔

انہوں نے میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولے "پچیس برس پہلے ایک دن کسی نے بڑے اپنے پن سے کہا تھا "سگرٹ نہ پیا کیجئے" اچھی چیز نہیں ہے".... سگرٹ کا پیکٹ تو میں نے لے لیا تھا، لیکن اس دن سے بلکہ اس وقت سے میں نے سگرٹ پینا چھوڑ دیا تھا۔ آج تک نہیں پی۔ وہ پیکٹ البتہ میرے پاس آج تک رکھا ہے۔ میں تو دھوپ بتی لینے آیا ہوں۔"

اچانک گھر کے اندر سے کھانسی کی تیز آواز آئی اور پھر آتی ہی چلی گئی۔ نیلیش جی نے متحیرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور کہا "میرے ہسبنڈ ہیں۔ سگرٹ کا ایک کش لینے کے بعد دو منٹ تک بغیر رکے ہوئے کھانستے ہیں... سارا دن سگرٹ پیتے رہتے ہیں، سارا دن کھانستے رہتے ہیں۔ ہاتھ پیروں کی نسوں کے، پھیپھڑوں کے اور دل کے کتنے ہی مرض لگا لیے ہیں۔ لیکن سگرٹ نہیں چھوڑتے۔"

نیلیش جی کی نرم نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ دھوپ بتی کا پیکٹ میں نے ان کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا اور بڑے افسردہ لہجے میں کہا "میں بڑی کمزور عورت ہوں۔ باوجود تمام کوششوں کے میں اپنے ہسبنڈ کی سگرٹ نہ چھڑا سکی۔"

"کمزور عورت!" نیلیش جی نے زیر لب صرف اتنا کہا، ایک بڑی اچھی سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور دھیرے سے سر ہلا کر چلے گئے۔

☆☆☆

یٰسین احمد، حیدرآباد

درماں

ہتھیلی پر آڑی ترچھی لکیریں بنا کر قدرت نے انسان کو مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ دولت کی لکیر، علم کی لکیر، شہرت کی لکیر، شادی کی لکیر، اولاد کی لکیر، خوشیوں اور غموں کی لکیر....جو ان پر بھروسہ کرتا ہے وہ پریشان اور جو بھروسہ نہیں کرتا وہ بھی پریشان...میں نے ہاتھ کی ان لکیروں کو کبھی اہمیت نہیں دی ہے لیکن کبھی کبھی ایسے واقعات سامنے آئے ہیں کہ عقل دنگ رہ گئی ہے۔

اس رات کو بیگم مرزا کے ہاں پارٹی چل رہی تھی۔ قریبی دوستوں کا اچھا خاصا جم گھٹا وہاں موجود تھا۔ بیگم مرزا دہلی کی رہنے والی تھیں۔ نو دس سال سے وہ یہاں سنگاپور میں مقیم تھیں۔ جب بھی مرزا صاحب یا بیگم مرزا کو اپنے وطن کا کوئی فرد نظر آتا وہ فوراً اسے دوست بنا لیتے۔ ویک اینڈ پر اسے لنچ یا ڈنر پر مدعو کرتے اور اپنے دوسرے دوستوں سے اس کو متعارف کراتے۔ اس کی ملازمت اور رہائش کے مسائل کو سلجھانے میں مدد کرتے۔ دو تین گھنٹوں کی اس تقریب میں اچھی خاصی رونق رہتی اور دیارِ غیر میں اجنبیت کا احساس باقی نہیں رہتا۔

ایک پرائے ملک میں ایسے تقاریب بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور بہت مزہ دیتے ہیں۔ حالانکہ سنگاپور ایسا شہر ہے جہاں تفریحی مقامات کی کمی نہیں یہ اور بات ہے کہ جہاں بھی جائیے گا جیب کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس قسم کی تفریحات کو ہم ترجیح دیتے تھے۔ مسز اور مسٹر مرزا کا یہ عمل ہم سب کو اتنا بھایا تھا کہ ہم لوگوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ہر ویک اینڈ پر کسی نہ کسی کے پاس کوئی تقریب ہو جاتی تھی۔ ہم سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انٹیلکچوئل تھے۔ حالاتِ حاضرہ پر بھرپور نظر رکھنے والے اور جدید علوم سے آراستہ...لیکن تلاشِ رزق میں اپنے اپنے وطن کی مٹی سے بچھڑے ہوئے۔

اتفاق سے اس دفعہ بھی بیگم مرزا کے فلیٹ میں تقریب چل رہی تھی۔ دو تین ہفتے پہلے رویندرا اور رجنا کی منگنی ہوئی تھی اس سلسلہ میں بیگم مرزا نے دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ہم سب نے ان دونوں کو پرجوش طریقہ سے مبارک باد دی تھی۔ کھانے میں کچھ تاخیر تھی۔ اس لئے ہم لوگ مختلف قسم کے مشروبات کی چسکیاں لیتے ہوئے گپ شپ میں مشغول تھے کہ اتنے میں سوریا کانت آ گیا وہ ہمارے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن اس وقت اس کے ساتھ اور ایک مہمان نظر آیا جو ہمارے لئے اجنبی تھا اور باعثِ توجہ بھی۔ یقیناً اس کی شخصیت میں کچھ بات تھی۔ ایک ایسی کشش، ایک ایسی جاذبیت جو پہلی ہی نظر میں سامنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ غیر ارادی طور پر ہم سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کی وضع قطع بھی عام لوگوں سے مختلف تھی۔ اونچے دراز قد پر کس کر اجلی سلک کی لنگی لپیٹ رکھی تھی، جو عموماً چینائی میں بسنے والوں کا پہناوا رہا ہے۔ پورے آستین کی شارٹ کٹ قمیض، بھرا بھرا چہرہ، کھلتا ہو رنگ، بڑی بڑی آنکھوں سے بے پناہ ذہانت ٹپک رہی تھی۔ سر کے بال گردن تک پھیلے ہوئے تھے جس کو اس نے عین درمیانی حصہ میں منقسم کر کے سلیقے سے جما دیا تھا۔

سوریا کانت نے جب اس کا تعارف کرایا تو ہم سب کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اس کا نام وجے شنکر تھا اور وہ علم نجوم سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ ہاتھ کی ریکھائیں دیکھ کر گذرے ہوئے ماضی اور آنے والے واقعات بتا دیتا۔ میں نے سوریا کانت کے اس تعارف کو سنا، مسکرایا اور بدستور آرینج کی چسکیاں لینے میں مصروف رہا۔ میرے پہلو میں صدیقی بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے برابر صدیقی کی بیوی افشاں صدیقی۔ دو ماہ پہلے ہی صدیقی نے افشاں سے شادی کی تھی اور وطن سے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

افشاں صدیقی ہنس مکھ اور خوبصورت عورت تھیں۔ طرز تکلم انتہائی سبک اور نازک۔ بہت کم بولتی تھیں لیکن جب بولتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے دہن سے شبد نہیں شہد کی بوندیں ٹپک رہی ہوں۔ انہوں نے جھک کر اپنے شوہر کے کان میں کچھ کہا، صدیقی پہلے مسکرائے اور پھر اپنی جیب سے ڈائری کا ایک ورق پھاڑ کر بیوی کے حوالے کیا۔

افشاں صدیقی نے کاغذ کے اس پرزہ پر کچھ لکھا تھا اور وہاں سے اٹھ کر وہ وجے شنکر کے قریب آئیں، منہ سے کچھ کہے بغیر کاغذ کا پرزہ وجے شنکر کے ہاتھ میں تھما کر اپنا گورا گورا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ہم سب بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ افشاں صدیقی نے جو دریافت کیا تھا وہ کسی کے سامنے ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

وجے شنکر نے کاغذ کے اس پرزہ کو پڑھا، ہلکے سے مسکرایا اور پرزہ کو پھاڑ دیا اور بولا۔ ''آپ نے ایک راز کی بات پوچھی ہے، بھری محفل میں اس سوال کا جواب کیسے دے سکتا ہوں۔ اپنا کان میرے قریب لے آیئے۔''

وجے شنکر نے افشاں صدیقی کے ہاتھ کی ریکھاؤں پر ایک نظر ڈالی اور اس کے بعد ان کے کان میں سرگوشی کی۔ ہم سب اس منظر سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ افشاں صدیقی نے کیا پوچھا تھا اور وجے شنکر نے کیا جواب دیا تھا۔ لیکن ہم سب نے دیکھا کی افشاں صدیقی کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا اور ان کے منہ سے نکلا تھا۔ ''ونڈر فل''۔

افشاں صدیقی کے منہ سے نکلے ہوئے اس لفظ کا یہی مطلب تھا کہ وجے شنکر نے جو بھی کہا وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے بعد مہمانوں میں تھوڑی سی ہلچل مچ گئی۔ تین چار مہمانوں نے وجے شنکر کو گھیر لیا۔ وہ باری باری سے اپنا ہاتھ وجے شنکر کو دکھا رہے تھے اور وجے شنکر ان کے ہاتھوں کی ریکھاؤں کو یوں پڑھ رہا تھا جیسے کوئی کھلی کتاب پڑھتا ہے۔

رویندر میرے قریب آیا اور بولا۔ ''یہ مہاشے کچھ کام کے آدمی لگتے ہیں۔''

میں استفہامیہ انداز میں اس کو دیکھتا رہا اس کے خیال کی تردید کی اور نہ تائید۔ رویندر بھی اپنا ہاتھ اس کو دکھانا چاہتا تھا۔ اپنے مستقبل کے بارے میں وہ بے حد فکر مند تھا، اس کی ذہنی کشمکش کا مجھ کو اندازہ تھا۔ وہ میرا دوست تھا اور ہم وطن بھی۔ وہ مجھ سے پہلے آیا تھا اور میرے یہاں آنے میں اس کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔

بالآخر رویندر کے دل کی بات زبان پر آئی۔ ''میں بھی اپنا ہاتھ دکھاؤں؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہماری شادی کب ہوگی؟''

رویندر کے لہجے سے بے تابی جھلک رہی تھی۔ اس کی بے تابی فطری تھی۔ وہ رجنا سے محبت کرتا تھا اور جلد سے جلد اس کو اپنانا چاہتا تھا۔ منگنی کے وقت اس کو کئی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ حالانکہ رجنا کے رشتے

داروں کی طرف سے کوئی اڑچن نہیں تھی لیکن رویندر کے ماں باپ اس منگنی کو ٹالنا چاہتے تھے کہ پہلے بیٹی کی شادی کریں اور پھر تین چار سال بعد رویندر کی شادی کریں۔ رویندر اتنی طویل مدت تک انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی کے ستائس اٹھائس برس بے کیف و بے رنگ گذر گئے تھے مزید انتظار کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں اور بیگم مرزا نے بڑی مصلحت سے کام لے کر اس کے ماں باپ کو منگنی کے لئے آمادہ کیا تھا۔ ورنہ ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا کہ جب رجنا کے بھائی بھابھی نے زچ ہو کر تعلقات توڑ دینے کی بات کہہ دی تھی۔

میں اور رویندر کرسی گھسیٹ کر وجے شنکر کے سامنے بیٹھ گئے۔ رجنا رویندر کے عقب میں کھڑی تھی۔ رویندر نے اپنا ہاتھ وجے شنکر کی طرف بڑھایا اور کہا۔ "ہماری منگنی ایک ماہ پہلے ہوئی ہے اور ہم چاہتے ہیں جلد سے جلد شادی ہو جائے۔ آپ بتائیں مجھ کو شادی کے لئے کب تک انتظار کرنا پڑے گا، ہم کب شادی کریں؟"

وجے سنکر نے ایک اچٹتی ہوئی نظر رجنا کے متبسم چہرہ پر دوڑائی اور پھر رویندر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بغور رویندر کے ہاتھ کی ریکھائیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا لیکن رویندر کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ رجنا تو بار بار پہلو بدل رہی تھی اور قبل اس کے وجے شنکر کچھ کہتا بیگم مرزا نے اونچی آواز میں اعلان کیا۔ "چلئے، پہلے کھانا کھالیں، باتیں تو رات بھر ہو سکتی ہیں لیکن کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

وجے شنکر نے رویندر کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا "چلئے کھانے کے بعد ہم باتیں کریں گے۔"

بیگم مرزا پکوان میں مہارت رکھتی تھیں۔ نئے نئے اور عمدہ ڈشز تیار کرتی تھیں کہ کھانے والے انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ اس وقت بھی انہوں نے کئی قسم کی لذیذ اور ذائقہ دار ڈشز بنائی تھیں۔ وہ رویندر اور رجنا کی بڑی خاطر مدارت کر رہی تھیں لیکن رویندر جیسے تیسے کھانا ختم کر کے اٹھ گیا۔ وہ وجے شنکر سے اپنے سوال کا جواب سننے کے لئے بے چین تھا۔ ہم سب نے سیر و شکم ہو کر کھانا کھایا اور اطمینان سے کھایا، کھانے سے فارغ ہوتے ہی مہمانوں کو فروٹ سلاڈ آئسکریم اور کوک پیش کیا جانے لگا۔ اسی وقت وجے شنکر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے بیگم مرزا کا شکریہ ادا کیا، ہم سب سے مصافحہ کیا وہ ایک ہفتہ کے لئے سنگاپور آیا تھا اور دوسرے ہی دن اس کو سنگاپور سے ملیشیا جانا تھا۔ اس لئے جلد سے جلد محفل سے اٹھ گیا۔

وجے شنکر باہر جانے لگا تو اس کے پیچھے پیچھے رویندر بھی چلا اور چلتے چلتے اس نے مجھ کو بھی آنے کا اشارہ کیا۔ فلیٹ سے باہر نکل کر لفٹ کے نیچے جاتے ہوئے رویندر نے وجے شنکر کو مخاطب کیا۔ "آپ نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا؟"

وجے شنکر کے چہرے پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ان دیکھے خدشات کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ وہ بولا۔ "مجھ کو اپنے علم پر پورا بھروسہ ہے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی کسی معاملہ میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

ہم لفٹ سے باہر نکل کر رک گئے۔ وجے شنکر کی گفتگو نہ صرف تشویشناک تھی بلکہ رویندر کی الجھن میں اضافہ کر رہی تھی۔ میرا بھی اشتیاق بڑھ گیا وجے شنکر بولا۔ "میں آپ کے ہاتھ کی ریکھاؤں کے بارے میں کچھ بتانا نہیں

نہیں چاہتا بہتر ہے کہ آپ اصرار نہ کریں۔‘‘

روبندر جلدی سے بولا ’’آپ ضرور بتائیں، مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ ہر اچھی بری خبر کو برداشت کر سکتا ہوں۔‘‘

وجے سنکر نے کہا۔ ’’تو سنئے میرا مشورہ ہے کہ آپ شادی نہ کریں۔‘‘

’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘ روبندر نے حیرت سے پوچھا۔

’’آپ کی ہاتھ کی ریکھائیں دیکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔‘‘ وجے شنکر نے سنجیدگی سے بولا۔ ’’شادی کرنے پر آپ کی موت واقع ہو سکتی ہے۔‘‘

میں نے جلدی سے پوچھا ’’کیا رجنا سے شادی کرنے سے روبندر کی زندگی کو خطرہ ہے؟‘‘

’’صرف رجنا سے ہی نہیں۔‘‘ وہ بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا۔ کسی بھی عورت سے شادی کرنے پر آپ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتے ہیں۔‘‘

وجے شنکر نے ایک ایک لفظ کو تول کر کہا اور پھر وہ وہاں سے چلا گیا لیکن روبندر کی حالت ایسی ہی تھی جیسے روح پرواز کر گئی ہو۔ ہم دونوں دیر تک ساکت و جامد کھڑے رہے۔

اس واقعہ کو تین ساڑھے تین سال گذر گئے۔

روزی روٹی کا چکر انسان کو کہاں سکون سے رہنے دیتا ہے؟ میں نے سنگاپور چھوڑ دیا اور اپنے وطن چلا آیا۔ سنگاپور کی دعوتیں دوست احباب سب آہستہ آہستہ ذہن سے محو ہو گئے۔

ایک دن میں بگ بازار کے سرکل سے گذر رہا تھا وہاں میری کار رکھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا، میری کار کے کچھ فاصلہ پر ایک چمچماتی کار کے قریب رجنا کھڑی تھی اور روبندر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ رجنا نے وہیں سے مجھ کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے لیکن روبندر تیزی سے میرے قریب آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ’’کیسے ہو؟‘‘

’’اچھا ہوں اور آپ دونوں؟‘‘ میں پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ وہ دونوں ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ چہرے مہرے سے اطمینان اور آسودگی عیاں تھی۔ میری نظر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ایک گول مٹول خوبصورت بچے پر پڑی۔ ایک ہی لمحہ میں کئی خیالات ذہن میں امڈ آئے۔ میں اس کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ کار میں جو بچہ بیٹھا ہوا ہے اس کی جنس کیا ہے۔ میں نے پوچھا ’’تمہارا لڑکا ہے۔‘‘

’’ہاں‘‘ رجنا نے خوش ہو کر کہا۔ ’’لیکن لڑکا نہیں لڑکی ہے۔‘‘ میں نے رکتے رکتے پوچھا ’’شادی کب کی‘‘

وہ رجنا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ’’میں رجنا کو بیوہ کیوں بناتا‘‘ کیا ہم شادی کے بغیر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟‘‘

میرے منہ پر تالا پڑ گیا۔ میں نے پلٹ کر ان کی بیٹی کو دیکھا۔ جو گڑیا کی طرح خوبصورت اور فرشتہ کی طرح معصوم نظر آ رہی تھی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک ٹیڈی بیر سے کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

فیض الحسن فیض، 7/11/B، بیلپا اسٹیٹ، جری مری، اندھیری کرلا روڈ، ممبئی۔۷۲

تلاش

ندیم ایک دوست کو طیران گاہ پر الوداع کہہ کے لوٹ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ حدود سے باہر نکلا وہ ایک پیڑ کے نیچے آ گیا۔ وہ یوروپی باشندہ لگ رہا تھا۔ پسینے سے شرابور ہو کر کافی بے چین نگاہوں سے گذرنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر ندیم اس کے قریب آ گیا۔

''ہلو....!'' ندیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے اسی نگاہ سے دیکھا مگر خاموش رہا۔

"Perhaps you are in trouble__ May I Help You?"

وہ ندیم کے چہرے کو پڑھنے لگا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس اجنبی سے امیدیں باندھی جا سکتی ہیں؟ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ایک اسکاٹش اس کی کچھ سنے بغیر ساری کہتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ ستم یہ کہ اس کا ایک ہم وطن بھی طنزیہ مسکراہٹ اچھالتا ہوا تیزی سے نکل گیا تھا.... تو کیا یہ نوجوان اس کی سنے گا؟.... وہ سوچتا رہا.... سوچتا رہا.... پھر اس کی سوچوں کا رو ندیم کے نرم لہجے پر رک گیا۔ تب اس کی آس بندھی تو اس نے یوں اپنی روداد سنائی.... وہ لندن کے ڈاؤننگ اسٹریٹ کا رہنے والا فرانسسی کرسٹو فر تھا۔ اس ملک کی سیاحت کے لئے یہاں کی عوامی زبان کی شد بد حاصل کر کے آیا تھا۔ گو اسے واپسی میں چھترپتی شیواجی انٹرنیشنل ایئر پورٹ تک پہنچنے سے پہلے کس نے اس کا بیگ اڑا لیا تھا۔ اس میں اس کا پاسپورٹ، ایئر ٹکٹ، اے ٹی ایم کارڈس اور کچھ رقم تھے۔ ایسی صورت میں اب اسے وطن لوٹنا مشکل نظر آ رہا تھا.... وہ کرے بھی تو کیا کرے.... اجنبی ملک..... پرائی دھرتی..... پرائے لوگ... اوہ مائی گاڈ....

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ندیم نے اسے دلاسہ دیا۔

''نو پرابلم فرانسیسی، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پہلے ہم لوگ پولیس اسٹیشن چلیں گے۔ پھر برٹش قونصل خانہ....''بٹ آئی ٹولڈ یو میری جیب میں سنگل پنی بھی نہیں اے....''

''ڈونٹ وری....تم میرے مہمان ہو۔ کم آن....

فرانسیسی نے اطمینان کی سانس لی۔ دونوں پولیس اسٹیشن گئے وہاں سے برٹش قونصل خانہ گئے۔ اس درمیان فرانسیسی نے اپنے ڈیڈ سے فون پر بات بھی کی۔ جب وہ ندیم کے گھر جا رہا تھا تو شام ڈھل چکی تھی۔

ادھر ندیم کی والدہ نجمہ خاتون اپنی رہائش گاہ کے ہال میں بیٹھی دونوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ دراصل ندیم نے انہیں فون سے فرانس کے بارے میں بتلا دیا تھا۔ اب وہ دیوار گھڑی پر نگاہ ٹکائے، آہٹوں پر کان لگائے بیٹھی تھیں تب ہی ندیم ہال میں داخل ہوا۔ مگر اکیلا تھا۔ نجمہ خاتون اسے حیرت سے دیکھتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

''اسے کہاں چھوڑ آئے....؟'' ندیم مسکرایا..... ''وہ اندر آنے سے ہچکچا رہا ہے۔''

نجمہ خاتون بسرعت باہر نکلیں۔ وہ سامنے سہمی سی صورت بنائے کھڑا تھا۔ ندیم نے تعارف کرایا۔

''یہ میری ممی ہیں...! ''گڈ ایوننگ میڈم.....!''

''خدا تمہیں سلامت رکھے.... آؤ آؤ اندر آؤ۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔''

فرانس داخل ہوا تو نجمہ خاتون نے ندیم سے کہا۔ ''پہلے فرانس کو اس کا کمرہ دکھلا دو۔ تروتازہ ہو جائے تو ڈائنگ ٹیبل پر لے آؤ۔ جانے کب کا بھوکا پیاسا ہوگا۔''

جب دونوں کمرے میں آئے تو وارڈ روب میں ندیم کی ناپ کے کچھ لباس ٹنگے تھے۔ ندیم نے فرانس کو بتلایا کہ یہ سارے نئے کپڑے اسی کے لیے ہیں۔ ممی ابھی شوروم سے لے کر آئی ہیں۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ڈائننگ ٹیبل پر وہ اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ فرانس نے ان کپڑوں کو حیرت سے دیکھا۔

''یہ میرا اے......؟'' ''ہاں...... میں نے ممی کو فون پر بتلا دیا تھا کہ تم میری عمر اور جسامت کے ہو...''

''بٹ یو نو میری جیب میں......!'' ''کیا تمہیں بار بار یاد دلانا پڑے گا کہ تم یہاں مہمان ہو۔''

وہ خاموشی سے کپڑوں کا جوڑا لے کر ٹوائیلٹ میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ڈائننگ ہال میں آیا تو ندیم کے والد حسن عباس بھی آچکے تھے۔ بہت گرم جوشی سے ملے۔ مشفقانہ باتیں کرتے رہے۔ اس دوران نجمہ خاتون ٹیبل پر کھانے سجاتی رہیں۔ کھانا شروع ہوا تو فرانس کو محسوس ہوا کہ طعام میں یوروپی ذائقے کا خاص طور سے خیال رکھا گیا تھا۔ خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ اپنے ذہن کا سارا تکدر بھول گیا۔ اجنبیت کا اثر بھی زائل ہو گیا۔ صبح ہوئی تو ندیم نے فرانس کے لیے کئی پروگرام بنالیے۔ وہ ممبئی کے قابل دید مقامات پر از سر نو گئے۔ دوستوں سے تعارف ہوا۔ یعنی فرانس کافی خوش تھا۔

اس روز وہ ندیم کے ساتھ ایک دعوت سے واپس آیا تو پشپا نے دروزہ کھولا۔ وہ ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی فرانس کی آنکھوں میں بجلی کوند گئی۔ وہ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تفسیر بن گیا۔ مگر اس کی نگاہوں سے بے نیاز ہو کر پشپا نے ندیم کو بتایا کہ اندر ممی بخار سے تپ رہی ہیں۔ ڈاکٹر آ کر جا چکا تھا۔ ندیم بدحواس ہو کر کمرے میں آیا۔ نجمہ خاتون بستر پر دراز تھیں۔ وہ ان تینوں کو مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔

''ممی آپ نے ہمیں فون نہیں کیا......؟''

''کیوں.... موسمی بخار ہے۔ ذرا دیر میں اتر جائے گا.... اور پشپا تو میرے ساتھ تھی......''

ندیم نے پشپا کو ممنون نگاہوں سے دیکھا۔ اسی وقت حسن عباس بھی آگئے۔ وہ بار بار نجمہ خاتون کا سر چھو کر حرارت کا اندازہ کرتے رہے۔ ندیم بھی قریب بیٹھا رہا۔ پشپا چلی گئی۔ فرانس بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ باپ بیٹا نجمہ خاتون کی معمولی علالت سے اتنا فکر مند کیوں ہیں؟.... فکر مند کیوں ہیں...؟ پھر اس کا ذہنی رو پشپا کے گرد سمٹ آیا.... اس کا ملکوتی حسن..... بوٹا قد..... اٹھتی ہوئی جوانی..... غلافی آنکھوں میں حیا کی چمک ..... رفتار میں نسوانی وقار..... زلفیں ایسی کہ..... ایسی کہ..... وہ اپنی سوسائٹی کی کسی بھی حسینہ میں پشپا کی شباہت، حسن اور ادا نہیں ڈھونڈ سکا..... پشپا میں دلاویزیاں ہی دلاویزیاں تھیں..... اور وہاں بے باکیاں ہی بے باکیاں..... شہوت انگیزی کا اشتہار..... بے جا سپردگی..... کہاں اس کی گرل فرینڈس جولی..... لزا..... مارتھا..... اور یہ پشپا..... نسوانیت کی توقیر..... سراپا احترام..... فطری حجاب میں مستور..... وہ بہت دیر تک پشپا کے خیالوں میں گم رہا۔ جب ندیم کمرے میں آیا تو بلا تاخیر وہ پشپا کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''وہ گرل کون تی....؟'' ''میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم ایک ہی ساتھ یونیورسٹی میں ماسٹر کر رہے ہیں....''

''وہ تمارا گرل فرینڈ اے.....؟'' ''ہاں.....لیکن تم جس معنی میں سوچ رہے ہو وہ رشتہ ہم میں نہیں ہے۔''

''ڈیٹنگ پر نہیں جاتے.....؟''

''بالکل نہیں۔ ہم اپنی حد میں رہنا جانتے ہیں۔ بدن کی تہذیب کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہم صرف اچھے دوست ہیں ۔اس کی منگنی بھی پرکاش سے ہو چکی ہے.....'' ''آئی سی.....''

فرانسس سنجیدہ ہو گیا.....کافی دیر تک سنجیدہ رہا.....مگر اس کی سنجیدگی اس وقت کافور ہوئی جب برٹش قونصل خانہ سے اطلاع ملی کہ اس کی واپسی کے سارے کاغذات مکمل ہو چکے ہیں۔ اگلی شام کو اسے پرواز کرنا ہے۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بہت دیر تک اپنے ذہن میں کسی ابھرتی دھن پر رقص کرتا رہا.....اور رقص کرتے کرتے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اسی رات جب کھانے پر بھی جمع ہوئے تو فرانسس کافی خاموش تھا۔ وہ لقمہ اٹھانے کے درمیان رہ رہ کر نجمہ خاتون کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک فیصلہ کے تحت اس نے نجمہ خاتون سے پوچھا کہ وہ کتنے دنوں سے اپنے شوہر کے ساتھ ہیں؟ جب نجمہ خاتون نے بالکل سہل انداز میں بتایا کہ ستائیس برسوں سے تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"I Don't Believe it"

وہ کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو گیا اور آہستہ آہستہ لقمہ اٹھانے لگا جیسے نجمہ خاتون کے انکشاف کو نگلنے کی کوشش کر رہا ہو.....وہ خاموشی اس وقت تک قائم رہی جب طیران گاہ پر جانے کا سمئے آ گیا۔ الوداع کہنے تک نجمہ خاتون کو مطمئن نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ قریب آیا اور بھرائے لہجے میں کہنے لگا۔

''میں بہوت Little تھا تو میرا ممی ڈیڈ سے Divorce لے کر کسی اور کے ساٹ چلا گیا۔ میں Stranger جیسا ڈیڈ کے ہاؤس میں رہنے لگا۔ unattached سا ایک دن بائی چانس بریڈ فورڈ اسٹیشن پر وہ مل گئیں تو ڈیڈ نے مجھے Introduce کرایا۔.....ایک Formal Introduction.....نہ کوئی اموشن.....نہ اپنا پن.....وہ میرا Cheepat کر کے چلی گئی.....اب سنا ہے وہ کسی Third مرد کے ساٹ رہتی ہے۔ میرے ڈیڈ نے بھی دوسرا Marraige کر لیا۔ تم کو ونڈر ہوگا کہ میرا Age کے جیادہ Boys and Girls کا یہی Tragedy ہے۔ اس Tragedy نے مجھے ایک تلاش کے Riddle میں ڈال دیا۔ مجھ کو کس کی تلاش ٹی میں اس کا نام نہیں دے سکا۔ وہ.....ایک Uneasiness بن کر میرا Existance کو Destroy کرتی رہی.....بٹ.....بٹ ممی آپ کو دیکھ کر.....آپ کے ساتھ رہ کر.....آپ کی ممتا کو Feel کر کے.....میری تلاش اور Uneasiness ختم ہو گیا ہے۔ I Am Satisfied Now.....میں جا رہا ہوں.....بٹ آپ سے ملنے.....آپ کی ممتا کے لئے آتا رہوں گا.....آتا رہوں گا.....؟

فرانسس ہاتھ ہلاتا ہوا دیگر مسافروں کے ساتھ طیران گاہ میں داخل ہو گیا۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے جھلملا رہے تھے.....وہ اوجھل ہو گیا۔

ادھر نجمہ خاتون بھی آنچل میں اپنے آنسوؤں کو جذب کر رہی تھیں۔

☆☆☆

اسد رضا، E-11/47 حوض رانی مالویہ نگر، نئی دہلی-17

اردو کا اغوا

اور جیسے ہی ہمارے ایک ادیب نما قریبی دوست جناب نمائش خاں نے ہمیں یہ خبر بذ ٹیلی فون پر سنائی کہ اردو کا اغوا ہو گیا ہے ویسے ہی طرح طرح کے اندیشوں، خدشات اور سوالات نے ہمیں گھیر لیا اور ہم سوچنے لگے کہ یا اللہ اتنی دلکش زبان جس کی شرینی کے دشمن بھی معترف ہیں اور جس کی زلف گرہ گیر میں میر تقی میر جیسے عظیم شاعر اسیر ہوئے، جس کے لیے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنی مادری زبان فارسی کو چھوڑا اور جس کے لب و رخسار کو داغ دہلوی، میر انیس، رنگین لکھنوی، آتش اور انشا نے اپنے خونِ جگر سے لالہ زار بنایا اس خوبصورت اردو زبان کو آخر کس نے اغوا کر لیا؟ کہیں یہ اردو کو ہندی کی ایک شیلی (اسلوب) بتانے والوں کی سازش تو نہیں۔ کہیں یہ کار بد اردو زبان کو ناگری رسم الخط میں لکھنے کا مشورہ دینے والے چند مشہور شعراء اور ادیبوں نے تو نہیں کیا۔

لیکن ہمارے ایک قریبی رشتے دار اور دور کے دوست میر فن نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اردو کا اغوا ضرور ان فلم سازوں نے کیا ہوگا جو اپنی فلموں کے نغمے اردو شعراء سے اور مکالمے اردو افسانہ نگاروں سے لکھواتے ہیں، اپنی فلموں کے نام اردو زبان میں رکھتے ہیں، بولتے اردو ہیں لیکن نہایت فخر و شان کے ساتھ اپنی اردو فلموں کو سرٹیفکیٹ "ہندی" فلم کا دلواتے ہیں۔ لیکن ہمارے ایک خالص دوست شیخ شفو نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ کہیں غالب کے منہ لگی اس زبان کا اغوا فارسی رسم الخط سے نابلد اور ناگری اسکرپٹ میں لکھ کر اردو اشعار کہنے والے کسی نو دولیتے شاعر نے تو نہیں کیا۔ کیونکہ ایسے شاعر جب "جلیل" کو "ذلیل" اور "پھول" کو "فول" (بمعنی بیوقوف) لکھتے اور پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جیسے اردو کو اغوا کرنے کی سازش رچ رہے ہیں۔

تاہم اپنے بچوں کو اردو پڑھانے والے اور اردو کے نام پر لڑنے مرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہنے والے ایک ہندو شاعر جناب سریواستو نے آہستہ سے ہمارے کان میں کہا مجھے "تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا اغوا ان مسلمانوں نے کیا ہے، جو محفلوں اور جلسوں میں تو اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتے نہیں تھکتے مگر اپنے بچوں کو اردو تعلیم سے محروم رکھتے ہیں۔"

چار کتابوں کے مصنف ایک غریب ادیب نے جو ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے، فوراً اغوا کا الزام ان اردو ناشرین پر عاید کر دیا جو مصنفین کی کتابیں چھاپ کر لاکھوں کا منافع کماتے ہیں لیکن بے چارے مصنف کو رائلٹی دینے کے بجائے خود مصنف سے کتاب کی اشاعت کا خرچ لینے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ اب اردو کتابیں بکتی ہی نہیں ہیں۔ دریں اثنا ایک اردو ویکلی میں کام کرنے والے صحافی مرزا مزار آ گئے۔ ہم نے جب اردو کے اغوا ہونے کی خبر کا تذکرہ مزار صاحب سے کیا تو انہوں نے نہایت نحیف آواز میں کہا "اس اغوا میں لازمی طور پر ان نام نہاد اردو صحافیوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے، جنہوں نے اردو صحافت کے نام پر کروڑوں بلکہ اربوں کمائے ہیں اور اردو کے حقیقی صحافیوں کا بری طرح استحصال کیا ہے۔ ارے صاحب ان صحافی نما مالکوں نے اردو سے کمائی تو خوب کی لیکن اپنے بچوں کو امریکہ و انگلینڈ میں انگریزی تعلیم دلوائی اور اردو تعلیم سے دور رکھا۔ لہذا اردو کو اغوا

کرنے کے الزام میں ان نام نہاد اردو صحافیوں کے خلاف پولس میں رپورٹ درج کرائی جائے۔ یہی نہیں بلکہ مبینہ اردو ڈائجسٹوں کے ان مالکان کے خلاف بھی مقدمہ قائم کیا جائے جو غیر ملکی اردو ڈائجسٹوں کے نام کی چپی لگا کر ہزاروں کی تعداد میں ڈائجسٹ چھپواتے ہیں اور ہر ماہ اس چوری اور سینہ زوری سے لاکھوں روپے کماتے ہیں۔ چند ایسے ہی لوگوں نے اردو کو اغوا کر رکھا ہے۔" مرزا مرزا ابھی خاموش ہی تھے کہ ایک اردو ریسرچ اسکالر اپنے ہاتھوں میں فائلیں اور بغل میں چند کتابیں دبائے ہوئے تشریف لے آئے۔ ان سے جب اردو کے اغوا کی خبر پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ نہایت مایوسی کے ساتھ فرمانے لگے "اس اغوا کی سازش کے پس پردہ مجھے اردو کے ان لیکچررس، ریڈرس اور پروفیسران کا ہاتھ نظر آتا ہے جو کلاس میں کم آتے ہیں اور اس سے بھی کم پڑھاتے ہیں۔ نیز اکثر و بیشتر بامعاوضہ مقالات لکھنے، پڑھنے، ادبی جلسوں اور مشاعروں کی صدارت یا نظامت کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے ماتحت ریسرچ اسکالرس کی علمی، ادبی و لسانی رہنمائی کے بجائے ان سے اپنے گھریلو کام کراتے ہیں اور اپنے لیے سمینار میں پڑھنے کے لیے مقالات لکھواتے ہیں۔"

ریسرچ اسکالر کی تقریر دلپذیر جاری ہی تھی کہ ایک ترقی پسند شاعر اور ایک مابعد جدیدیت ادیب آدھمکے۔ اردو کے اغوا کی خبر سن کر ترقی پسند نے فوراً کہا "یہ حرکت ضرور کسی جدیدیے یا مابعد جدیدے کی ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے اردو کو قاری سے کاٹنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔" لیکن یہ سن کر مابعد جدیدیے ادیب بھڑک اٹھے اور گویا ہوئے "یہ سب ترقی پسندوں کی سازش کا نتیجہ ہے کیونکہ انہوں نے اردو زبان و ادب کو اشتراکیوں کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔" ابھی مابعد جدیدیے اور ترقی پسند کا جھگڑا جاری ہی تھا کہ ایک برسر اقتدار پارٹی کے کارکن اور ایک اپوزیشن پارٹی کے کارکن نے بغیر کسی جھجک کے برسر اقتدار پارٹی کو اردو کے اغوا کے لیے ذمے دار قرار دیا جب کہ برسر اقتدار پارٹی کے ورکر نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اعلان کیا کہ اپوزیشن پارٹی نے ہی اپنے ۴۵ سالہ دور اقتدار میں اردو کو دیش نکالا دیا تھا اور یہ کہ اردو کے اغوا میں ضرور اپوزیشن پارٹی ہی کا ہاتھ ہے۔

اور اس سے پہلے کہ اردو کے اغوا کا مباحثہ سیاسی رنگ اختیار کرتا ہم نے دونوں کارکنان کو سمجھا کر خاموش کیا اور جناب نمائش خاں کا ٹیلی فون نمبر ڈائل کر کے اس اغوا کی تفصیل جاننا چاہی تو نمائش صاحب نے بتایا کہ دراصل دہلی کے ایک ہال میں اردو کے فروغ کے لئے دانشوران کرام، ناقدین عظام، محققین، شعراء و ادباء کا ایک جلسہ تھا جس میں اردو کے فروغ کی باتیں تو نہیں ہوئیں بلکہ کچھ دانشوروں نے ایک پروفیسر کے لفظ "اغوا" کے تلفظ پر اعتراض کر دیا اور کہا کہ لفظ "اِغوا" نہیں بلکہ "اَغوا" ہے یعنی الف پر زبر ہے زیر نہیں اور پھر اس اعتراض کے بعد جوابی اعتراضات اور پھر جواب در جواب اعتراضات شروع ہو گئے۔ اردو دانشور اور ادباء اس قدر زیر و زبر ہوئے کہ اس بحث و مباحثہ اور کہا سنی میں اردو کا فروغ تو پس منظر میں چلا گیا اور "اغوا" اس قدر منظر عام پر آیا کہ ایک طنز نگار یہ کہہ کر جلسہ سے چلے گئے "آپ حضرات نے تو بے چاری اردو کا ہی اغوا کر لیا" اور صاحب! اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

مرزا رفیق شاکر، حاجی نگر، آکولہ

BRIGADIER بریگیڈیر عین غین

ان کا نام سنکر گمان ہوا موصوف فیروز خان نون۔ظ۔انصاری، بابو آر۔کے، ۔م۔ ناگ، ایس۔ایس۔علی، ش۔خ۔طالب جیسے مخففات سے ہیں۔یاالف۔ب۔حوا۔ط۔ظ۔تختی جیسے فصیح و بلیغ فقرات کے جزو ضربی ہیں یا پھر الف۔ب۔ج۔ن۔م جیسے جومیٹری کے نقاط۔لیکن زبانِ خلق سے معلوم ہوا کہ ''عین غین'' ان تمام بہتانات سے مبرا ہیں۔بچپن ہی سے اپنے ہم عصروں کو کسی معاملے میں الٹی پٹی پڑھا کر اور ورغلا کر ''مورچہ'' پر لا کھڑے کرتے پھر خطرے کی گھنٹی بجتے ہی فوراً غائب ہو جاتے۔اسی لئے ان کے احباب نے انھیں ''عین غین'' کے خطاب سے نوازا تھا۔رقیبوں نے رپورٹ یوں لکھوائی کہ ان کی ہر وہ چیز جو حرف ''عین'' سے شروع ہوتی غائب ہو جایا کرتی تھی۔اسی لئے ''عین غین'' کہلاتے ہیں۔واللہ اعلم باالصواب

ہیں مصاحب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

موجودہ دور میں مسلمانوں کا بچہ بچہ ''ریسرچ اسکالر'' ہے۔لہٰذا ہم نے بھی بریگیڈیر سے متعلق ریسرچ کیا۔ موصوف نہ تو ملٹری میں تھے، نہ ہی سرکاری ملازم۔صوبیدار خاں فوجی کی طرح بریگیڈیر ان کا تخلص بھی نہیں ہے۔۔۔

بار بار سجدہ سہو سے بہتر ہے کہ تحقیق کر لی جائے کہ، جمعدار کی تہہ میں محلے کے، جمعدار نیز 'سید' کے غلاف میں مداری یا فقیر تو نہیں؟ حولدار، ماسٹر، ڈاکٹر، پٹیلنی، رسالدار، انعامدار، انصاری، علوی، فاطمی سے متعلق تحقیق کو لینے میں کیا حرج ہے۔

بریگیڈیر کا ذریعۂ معاش بندر ہانکنا تھا۔پتھر لے کر بندر کے پیچھے دوڑتے۔زیادہ جذباتی ہو جاتے تو دوڑ میں بندر سے آگے بھی نکل جاتے ایسے موقعوں پر بندر کی پہچان مشکل ہو جاتی۔

ٹیکنی کلر سے بلیک اینڈ وہائٹ

چنگیز خاں کے زمانے میں ان کے آباء واجداد خاقان کہلاتے تھے۔اکبر اعظم کے عہدِ حکومت میں خان خاناں اور انگریزی عملداری میں خان بہادر ہوا کرتے تھے۔ اگر موجودہ حکومت پٹھان رجمنٹ (Regiment) اور خان بہادر کا اعزاز ختم نہ کرتی تو وہ حقیقی بریگیڈیر ہوتے۔یا حکومتی نقطہ نظر سے سماجی خدمت کر کے خان بہادر کہلاتے۔گویا ان کے بزرگوں کی گذاری ہوئی ٹیکنی کلر زندگی ان تک پہنچتے پہنچتے بلیک اینڈ وہائٹ ہو کر رہ گئی تھی۔اس میں ان کی بلیک کی آمدنی کا بھی عمل دخل ہے۔

کافر کا بچہ

رمضان المبارک میں روزانہ مسجد میں تشریف لاتے وہ بھی صرف افطار کے لے۔اور بڑی ضد و جہد کر کے دو تین صحنکیں اٹھا لیتے۔ہم نے کہا دن بھر سرِ بازار بیڑیاں پھونکتے ہو پھر افطار کے وقت ایسا کرتے اچھا لگتا؟ کہنے لگے۔۔۔ہم نماز نہیں پڑھے گا، روزہ نہیں رکھے گا، سحری نہیں کرے گا تو کیا افطار بھی نہیں کرے گا، پورا کافر کا بچہ بن جائیگا۔

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوتا

دس بارہ سال قبل ہم نے ان سے قرض لیا تھا۔ تب سے انکا معمول ہے کہ تنخواہ کے دو روز قبل سے ہمارے گھر کے اطراف، خصوصی گشت، کرتے اور تنخواہ کے دن آفس میں آدھمکتے۔ ہم بال بچوں کی فاقہ مستی کا رونا رو کر تنخواہ کا کچھ حصہ رکھ لیتے، بقیہ رقم ان کے حوالے کر دیتے۔ اور وہ منت پذیر شانہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اک نگاہ غلط انداز ہم پر ڈال کر چلے جاتے گویا کہہ رہے ہوں۔ قرض سے چھڑوائے گی یہ فاقہ مستی ایک دن

پھر دوسرے ہی ہفتہ ہمارے گھر تشریف لاتے۔ خیر و عافیت دریافت کرتے اور نئی شرح سود پر قرض دے کر چلے جاتے۔ گویا ان کا خیر و عافیت دریافت کرنا قبر و عاقبت کی طرف روانہ کرنے کی تمہید ہوتا۔

ہوں چاروں بیویاں ایسی کہ ہر بیوی سے نو بچے

گذشتہ چالیس برسوں سے انہوں نے افطار پارٹی (وہ بھی مسجد کی صحنک سے) اور چار شادیوں کو ہی شریعت سمجھا۔ اور مذکورہ دونوں نکات کے منکر کو کافر کا بچہ ہی کہا۔ گاہے ماہے ان کے گھر چلے جاتے تو۔ جمعہ خاں، پیر خاں، رمضان خاں، شعبان گاں، مدار خاں، چھوٹے خاں، ننھے خاں، منے خاں، چاند خاں، لال خاں، کالے خاں، گورے خاں، خیراتی خاں، شبراتی خاں، بقاتی خاں، سیلانی خاں، دگڑو خاں، چھترو خاں، فقیرا خاں، گھسیٹا خاں، جیسے ناموں کے بچوں کی پلٹن دکھائی دیتی۔ گویا کرکٹ کی ٹیمیں ہیں اور ون ڈے میچ (one day match) شروع ہونے والا ہے۔ پھر انہیں جیمس بانڈ (James Bond) کی طرح مار دھاڑ کرتے دیکھتے تو ہندوستانی پارلیامنٹ کے اجلاس کا منظر نظروں کے سامنے آجاتا۔

ض۔و۔ق۔فروش

سیاست اور اہل سیاست سے الرجک (Allergic) رہتے لیڈروں کو بے ایمان، دغاباز، مفاد پرست، بدکردار، چور، مفت خور اور ض۔و۔ق۔ (ضمیر، وطن، قوم) فروش جیسے القابات سے نوازتے۔ اکثر فرماتے کہ پارٹیوں کے صرف انتخابی نشان، ٹوپی کے رنگ اور حلیے مختلف ہوتے ہیں۔ لیڈروں کا نظریاتی تصادم ہوتا ہے مفادی تصادم نہیں ہوتا۔ نیز ان کے "قیام امن" کی کوششوں کی وجہ سے گھر گھر میں فساد پھوٹ پڑا ہے۔

مجموعۂ اغلاط ہے انساں ہرے آگے

آپ یہ نہ سمجھیں کہ خان صاحب میں کوئی برائی ہے ہی نہیں۔ غلطی کرنا تو دختران حوا اور فرزندان آدم کا پیدائشی حق ہے۔ لہٰذا عین غین بھی مجموعہ اغلاط ہیں۔ وہ دور حاضر میں بھی قول کے پکے اور وعدہ کے سچے ہیں۔ مسلمان بھائی کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو جاتے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے اس کی مدد کو دوڑ پڑتے ہیں۔ ہر کسی کے دکھ سکھ، بیماری اور موت مٹی میں پیش پیش رہتے۔ ایسے موقعوں پر بے دریغ، فی سبیل اللہ خرچ کرتے اور پھر کسی پر احسان بھی نہ جتاتے۔ وبا اور فساد کے زمانے میں ان کی تجوری اور غلہ کی بوری کا منہ عوام کے لئے کھل جاتا۔ پچھلے تین فسادات میں اپنی جان پر کھیل کر انہوں نے کئی بہو بیٹیوں کی عصمت اور قوم کی عزت بچائی ہے۔

ان کی انہیں غلطیوں کے باعث ہم اور ہماری طرح بے شمار لوگ ان سے محبت کرتے اور ان کی دوستی پر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

☆☆☆

اس شمارہ کے مخصوص شاعر: خورشید اکبر

خورشید اکبر کی ولادت ۱۴ر مئی ۱۹۵۹ء کو ملکی چک بر بیگھہ ضلع شیخ پورہ میں ہوئی۔ ان کا آبائی وطن مرزا گنج بڑھیا ضلع لکھی سرائے ہے۔ انہوں نے سیاسیات اور اردو میں ایم اے کیا ہے۔ ان کی کتابیں سمندر خلاف رہتا ہے (۱۹۹۴ء)، بدن کشتی بھنور خواہش (۲۰۰۴ء) فلک پہلو میں (۲۰۰۸ء) اور دیوناگری رسم الخط میں آسماں سے آگے (۲۰۱۰ء) (شعری مجموعے) اور ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب: ایک تنقیدی تجزیہ (۲۰۰۷ء) (تنقید و تحقیق) منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ خورشید اکبر گوپال گنج میں سی او اور بی ڈی او کے عہدہ پر فائز تھے۔ ۴ر اپریل ۲۰۱۰ء سے سمستی پور میں اس ڈی او ہیں۔

شعری لسانیات اور شعری لفظیات کو جاننا اور برتنا بڑی فنکاری کا کام ہے۔ تصورات کی دنیا جیسی بھی ہو خوابوں کے دھند لکے اپنی تہوں میں ایک نرمی اور نمی کی بازیافت کرتے ہیں۔ عکس در عکس جسے امیجری بھی کہتے ہیں اس میں پیکروں کا ابھرنا جدید آرٹ میں تو دیکھا جاتا ہے اور پینٹنگ کرنے والا کچھ نہ کہہ کے بھی بہت کچھ کہہ جاتا ہے حالانکہ تجریدی تجربوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی طور پر بھی افہام و تفہیم کے مرحلوں میں زیادہ پیچیدگیاں نہ پیدا کریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ لسانیات اور لفظیات پر قدرت حاصل ہو۔ خورشید اکبر کو ان دونوں جہتوں میں غضب کا ملکہ حاصل ہے۔ اس لئے ان کے اشعار کو پڑھ کر ایک کہر آمیز فضا کی تشکیل ہو جاتی ہے جس سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا اور دیر تک غنائی اور صناعی قوتوں کی گرفت میں اپنے کو محسوس کرتا ہے۔ یہی خوبی خورشید اکبر کو ایک منفرد شاعر اور تازہ کار شعری تخلیق کا خالق بناتی ہے۔ اسی انفرادیت کے سبب خورشید اکبر نے اپنی ڈگر روایت سے ہٹ کر جدیدیت سے منحرف ہو کر بنائی ہے اور معنویت کی گہرائی اور گیرائی بھی وہ شعری قالب میں بحسن و خوبی ڈھال لیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا لہجہ تر و تازہ، سبک اور دلپذیر ہے۔

............امام اعظم

غزلیں

(۱)

کنارِ ٹوٹ جاتے ہیں غضب کی دھار چلتی ہے
جنوں سیلاب سے پہلے ہوا تیار چلتی ہے

قیامت ہے طلسم ہوش پیما سے نکل پانا
جہاں رستہ نکلتا ہے وہاں دیوار چلتی ہے

بہت انمول ہوتی ہے سزا روشن ضمیری کی
جہاں سکہ نہیں چلتا وہاں دستار چلتی ہے

نیا کچھ بھی نہیں چلتا کہو ظل الٰہی سے
ادھر میں سر اٹھاتا ہوں ادھر تلوار چلتی ہے

تصور کے کٹوروں میں بہشتیں تیر جاتی ہیں
عبادت یوں تو ساری خواہشوں کو مار چلتی ہے

کہ اپنا درد وہ رقاصۂ جاں کہہ نہیں سکتی
مگر پازیب دنیا کی جھنن جھنکار چلتی ہے

یہاں خورشید اکبر ترا چلنا کیا ضروری تھا
ادب سے بات کر پیارے یہاں سرکار چلتی ہے

(۲)

کیا غزل سادگی تمہاری ہے
دو جہاں شاعری تمہاری ہے

صبح کا نور باوضو چہرا
کیا کنول تازگی تمہاری ہے

جنبشِ آرزو پہ جھک جانا
شاخِ گل کیا خوشی تمہاری ہے

پنکھڑی کیا تمہارے لب کی تراش
کیا کہوں ناز کی تمہاری ہے

کیا ندی ریگزار کیا دنیا
اور کیا تشنگی تمہاری ہے

شمع سے مہر و ماہ و انجم تک
کچھ نہیں روشنی تمہاری ہے

کانپ جاتا ہے سامنے خورشید
کیا ادا شبنمی تمہاری ہے

☆☆☆

علقمہ شبلی، کولکاتہ

اجالوں کا بسیرا

(موتیا بند کے آپریشن کے بعد)

زمیں سے آسماں تک
بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا
نہ روشن صبح تھی اپنی
نہ شب کی چاندنی روشن گرِ چشم تمنا تھی
اندھیروں میں گھری تھی زندگی ایسی
کہ جینے میں نہ لطف و کیف تھا کوئی
نہ مرنا ہی تھا آساں کچھ
نہ شرف ہم کلامی میر و مومن سے
نہ سرگوشی تھی غالب سے
نہ صحبت تھی لسان الغیب حافظ کی
نہ سعدی کے گلستاں کی بہاریں تھیں
نہ تھی اقبال و خسرو سے نوا سنجی
تھی ایسی خاموشی
جاں پہ بن آئی تھی
مگر دست ہنر،
تیرا بھلا ہو
معجزہ ایسا دکھایا
کاٹ کر تو نے سپیدی کو سیاہی سے
کیا روشن مری دنیائے تیرہ کو
میں پھر سے ہم کلام میر و غالب ہوں
ہیں پھر سے ہم زباں سعدی و حافظ بھی
یہ دنیا میری دنیا ہے
بہاریں رقص کرتی ہیں
عنادل چہچہاتے ہیں
یہ ہر جانب اجالوں کا بسیرا ہے

خالد رحیم، کٹک

ماں۔ میری ماں

ماں۔ میری ماں
تو نہیں ہے تو کیا
ذہن میں آج بھی
نورِ شفقت سے روشن
دمکتی ہوئی
تیری ممتا کی بھولی
صورت کو۔ محفوظ پاتا ہوں میں

ماں۔ میری ماں
تیرے ہونٹوں سے نکلی ہوئی ہر دعا
سایہ بن کہ مرے ساتھ چلتی رہی
کامرانی کی منزل دکھاتی رہی
فکر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں
تیرے آنچل کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا رہا
تیری شفقت کے سائے کو نزدیک پاتا رہا
—— میں سدا

ماں۔ میری ماں
تیرے ہاتھوں کی روٹی کی سوندھی مہک
سبزیوں میں ترے پیار کا ذائقہ
اور گاجر کا حلوہ
ملذذ غذا
بھول سکتا نہیں
میں کبھی بھول سکتا نہیں
تیری یادوں کو دل میں بسائے ہوئے
ذہن میں تیری قربت کے لمحے سمیٹے ہوئے
دیکھتا ہوں تجھے

دور رہ کر بھی تو۔ میری ماں
آج بھی پاس ہے
مجھ کو احساس ہے
میرے بچپن کے دن
وہ شرارت کے دن
میرے اسکول جانے کی تیاریوں میں
۔ وہ مصروف ہونا ترا
مسکراتے ہوئے ڈانٹنا
اور پھر
مجھ کو روتا ہوا دیکھ کر
گود میں اپنی لے کر مجھے چومنا
تیری بے لوث الفت وہ شکوہ گلہ
آج بھی یاد ہے
میری تعلیم کے واسطے
تیری جد و جہد
ہر قدم مشکلوں سے وہ لڑنا ترا
میری خاطر پریشانیوں سے گزرنا ترا
مجھ کو پڑھتا ہوا دیکھ کر
رات بھر جاگنا
کامیابی کی ہر پل دعا مانگنا
آج بھی یاد ہے
میری ماں
تیری چاہت تھی میں۔ ایک دن
کامیابی کی منزل پہ آؤں نظر
تیری قربانیوں کو صلہ مل گیا
تیری ہر اک دعا ہو گئی معتبر!!

☆☆☆

ساحر شیوی، لندن

آن

تیرے ماں باپ سے گو بات ہوئی ہے، لیکن
کیا خبر کون سے خوش بخت کی تقدیر ہے تو
وہ دلوں کا نہیں ہوتا یہاں آسان ملاپ
مانتا ہوں کہ میری زیست کی تعمیر ہے تو
مری محبوب مگر میرے لیے دکھ نہ اٹھا
میں سمجھتا ہوں کہ کس واسطے دلگیر ہے تو

میں نے دیکھا ہے زمانے کی ستم ظرفی کو
کہ یہاں سکھ نہ ملا پیار کے دیوانوں کو
گلشنِ زیست کو روندا ہے خزاں نے ہمدم
شمع سے دور ہی رکھا گیا پروانوں کو
مجھ سے ملنے کی اگر دل میں تمنا ہے تیرے
ہاتھ سے چھوڑ نہ تو صبر کے پیمانوں کو

ساتھ رہنے کا عہد ہم نے کیا تھا، لیکن
ہم کو ملنے بھی اگر دیں نہ زمانے کے ستم
بے وفا تجھ کو کہوں گا یہ نہ کر فکر کبھی
تیری مجبوری سے میں خوب ہوں واقف ہمدم
ہاں مگر فرض ہے ماں باپ کی عزت کا خیال
جس طرح دل میں ہمارے ہے محبت محکم
بھاگ جانے کا تصور بھی نہ آنے پائے
جان بھی جائے تو کیا، آن نہ جانے پائے

اسحاق ملک، حیدرآباد

کشکول

یخ زدہ سرد ماحول میں
ایک وحشت نمایاں ہے فٹ پاتھ پر
جس کے ہاتھوں میں کشکول
بے نور آنکھوں میں الجھن کی رو
تشنگی بے سمندر
بے بصر سماعتیں
رُت جو مہکے تو صحرا میں بھی گلنار ہو
روشنی اور پھیلے سویرا لگے۔!!

دھواں دھواں نقشے

غریب لوگ تہی ہاتھ
بے طلب آنکھیں
بجھے بجھے کئی منظر
دھواں دھواں نقشے!
سڑک پہ رینگتے سائے تلاش کرتے ہیں
برہنہ جسم اداسی کا پیراہن اوڑھے
اماں نے کی یہ کشکول بیچ دین اپنا
کوئی بتائے کدھر ہے فقیہ شہر ستم!!

☆☆☆

اسد رضا، نئی دہلی

ہزل

کہہ رہی تھی ان سے اک دوشیزہ گھبرائی ہوئی
ہائے ظالم کی ضعیفی جوش پر آئی ہوئی

بال جو دو چار سر پر تھے وہ کالے کر لیے
محفلوں میں کس قدر پھر ہائے رسوائی ہوئی

نوٹ دے کر بھی نہ لے پایا وہ دس لوگوں کے ووٹ
ہارنے کے بعد رسوا اس کی نیتائی ہوئی

آپ نے جس کو ترنم سے پڑھا ہے بہن جی
وہ کسی شاعر کی لگتی ہے غزل گائی ہوئی

دال، آٹا اور سبزی کچھ بھی اب سستی نہیں
جان لیوا کس قدر اے یار مہنگائی ہوئی

بیس فیصد لے کے رشوت کا یہ افسر نے کہا
دودھ تو باقی ابھی ہے یہ تو بالائی ہوئی

جھاڑ جب بیوی سے کھائی دل نے چپکے سے کہا
یہ مصیبت تو یہاں ہے آپ کی لائی ہوئی

ہر قدم پر بے وقوفی کے لگے ملنے خطاب
کتنی پُر نادانیوں سے اپنی دانائی ہوئی

شکل میں ظاہر ہوا ہے آٹھ بچوں کی اسد
پھر رہی ہے عاشقی اب کیسی بولائی ہوئی

عبدالمتین جامیؔ، کٹک

رباعیات

کس دور میں ہملوگ ہوئے ہیں داخل
دنیا ہو کہ آخرت نہیں ہے حاصل
اقوام موسیٰ کی طرح ہیں ہملوگ
چلتے تو ہیں ملتی نہیں اپنی منزل

جانے دے اسے چھوڑ کے تنہا مجھکو
ہوتا ہے تو ہونے دے صدمہ مجھکو
خورشید بساط کا مجھے چھوڑ چکا
اب چھوڑ کے جاتا ہے سایہ مجھکو

کرشن پرویز کھرڑ، روپڑ، پنجاب

(مولانا آزاد کی خدمت میں)

سارا عالم ہے آج نوحہ کناں
سب کے دل میں ہی زخم تازہ ہے
صرف کندھوں پہ ہی نہیں موقوف
آج ہر دل میں اک جنازہ ہے

آج ٹوٹا ہوا ہر اک دل ہے
آج ہر آنکھ آبدیدہ ہے
ایک ہم ہی نہیں یہاں ناشاد
ایک عالم خزاں رسیدہ ہے

تا قیامت نہ مٹنے پائیں گے
نقش ایسے بٹھا گئے دل میں
جن سے روشن ہوئی ہر اک محفل
شمع ایسی جلا گئے دل میں

☆☆☆

پروفیسر راحت حسین برقی، کٹیہار

تم نہیں جاتے تو!

وہ میٹھی میٹھی سی کڑواہٹ، وہ رنجشیں
وہ روتے روتے مسکرانے کی کوششیں
بگڑ بگڑ کر منے کی ادا،
ہنس ہنس کر ہنسانے کی کلا!
روٹھ روٹھ کر منانے کی ادا،
کچھ دن اور یہ تماشہ ہوا ہوتا
تو کیا خدائی میں خلل پڑ جاتا؟!
تم نہیں جاتے تو کیا بگڑ جاتا؟!!

کیا اسی کو حیات کہتے ہیں؟!

ایک نہیں ہزاروں،
خوشیوں کے دروازے کھلے
تھرکتی زندگی کی لہروں پر
ارمانوں کے کنول کھلے
دھڑکتی زندگی کے پاؤں میں
ارمانوں کے پائل بجے
راگ ورنگ کی محفل سجی
مشرق و مغرب کے نہاں خانوں سے
زہریلے سنپولے آگئے
کیا اسی کو حیات کہتے ہیں؟!!

اپنی جنت

چاندنی رات تھی،
بھادوں کی رات تھی،
چاند کھیلتا تھا بادل کے سنگ
آنکھ مچولی!
بند کمرے میں کوئی بیوہ
اپنے نوزائیدہ بچے کو لئے
سونے کی کوشش میں،
شوہر کے غم کو بھولنے کی کوشش میں،
سوچتی تھی میرا یہ بچہ جوان ہوگا
اپنی جنت سجائے گا
آنکھ مچولی کھیلے گا
زندگی کے چاند سے
بھادوں کی رات میں
چاندنی رات میں
چاند کھو جائے گا
بادل کی اوٹ میں
پھر کوئی بچہ جوان ہوگا
اور اپنی جنت سجائے گا!"

راج پریمی، بنگلور

قطعات

مال و زر کو، فضول کہتا ہے
اہلِ ثروت کو، ڈھول کہتا ہے
راجؔ پریمی، عجب دوانہ ہے
وہ تو، کانٹوں کو پھول کہتا ہے

☆☆

خوشبو کی طرح، تابہ افق، پھوٹ چکا ہوں
جی بھر کے، حوادث کے، مزے لوٹ چکا ہوں
باہر سے مجھے، ہنستا ہوا، دیکھنے والو!
اندر سے میں، شیشے کی طرح، ٹوٹ چکا ہوں

☆☆

تاروں کو دیا، نور تو، ذروں کو، چمک دی
خاروں کو دیا، سوز تو، کلیوں کو مہک دی
بے جان سی، موجوں کو تڑپنا بھی سکھایا
رگ رگ میں، مری کس نے، یہ بے نام کسک دی؟

☆☆

پیار، دنیا کو، کب گوارا ہے؟
آج اخلاص، بے سہارا ہے!
دشمنوں سے، جو بچ کے نکلا تھا
دوستوں نے، اُسی کو مارا ہے

☆☆

افروز عالم، کویت

الزام

اہلِ زر ہر مفلس کو
کہا کرتے پاگل ہیں
دراصل
ہوس کا وہ آخری مرحلہ
ہم جسے
پاگل پن کہتے ہیں
کسی مفلس پر
طاری نہیں ہوتا
یہ تو
ایک الزام ہے
جو
مفلسی کے ماتھے کی
شوبھا ہے
جو اپنی کوکھ سے
کئی گناہوں کو جنم دیتا ہے
نئے
جہان کی تعمیر کرتا ہے!

☆☆

ڈاکٹر ظفر کمالی، سیوان

۱

ساقی نے جسے نام دیا جامِ احد
کون اس کی فضیلت میں کرے ردوکد
منصور کو اس نے ہی بنایا منصور
تھے واقفِ اسرار اسی کے سرمد

۲

موجود ہے ہر رند کی خواہش کا جام
رحمت کی عنایات کی بارش کا جام
اللہ رے ساقی کا مرے حسنِ سلوک
دیتا ہے گنہ گاروں کو بخشش کا جام

ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی

زندگی

زندگی
یہ میری زندگی
ایک کھلی کتاب کی مانند
اور تمہاری نظر
اس پر لکھا ہوا ہر حرف
تم نے پڑھ لئے
یہ سارے کالے حرف
لیکن، اس کا مطلب
نہ تمہیں سمجھ پائے
اور نہ میں ہی تلاش کر سکا ایسا کوئی معنی
جو اس کی تشریح کر سکے
ایسے حرف
جن کو پڑھ کر شاید
تم سمجھ سکتے
کہ میری زندگی کی حقیقت کیا ہے

☆☆

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند، لندن

ہم اپنی بدنصیبی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
بلائے آسمانی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
محبت میں جدائی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
ہم اُن کی بے وفائی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
جفاؤں کا تمہاری دے دیا بدلہ وفاؤں سے
تمہاری بدمزاجی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
جواں تو ہو گئے لیکن نشہ اُس کا نہیں آیا
ہم اس گزری جوانی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
نہ جانے کب تلک کرتے رہو گے اپنی من مانی
تمہاری ناخدائی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
نچاتے ہیں ہمیں اہلِ سیاست اپنی انگلی پر
ہم اُن کی بدنظامی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
قدم جب تک نہیں بڑھتے ہمارے سیدھے رستے پر
ہم امواجِ سونامی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
ہماری ہے یہ مجبوری ہم اپنے رہنماؤں کی
بھلائی یا برائی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
محبت کرنے والوں میں جو پیدا ہو غلط فہمی
کسی کی بدسلوکی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے
اگر خود کو بدلنے کا نہ ہو آنند تم میں دم
جہاں کی کج ادائی کا گلہ بھی کر نہیں سکتے

ڈاکٹر پریمی رومانی، جموں

مکاں جس کا ہو شیشے کا وہ کیا پتھر اُٹھائے گا
کوئی عالم بھی ہو دل کا نہ ہرگز چین پائے گا

لکھی ہے جس کی قسمت میں فقط غم کی فراوانی
وہ محفل شادمانی کی بھلا کیونکر سجائے گا

پروں میں پھڑپھڑاہٹ تک نہیں ہے جس پرندے کی
بھلا پیڑوں کی شاخوں پر وہ کیسے گھر بسائے گا

مجھے معلوم تھا انجام جو بھی ہونے والا ہے
مرا سچ بولنا آخر کسی دن رنگ لائے گا

ابھی تجھ کو نہیں پہچان اپنے آپ کی ناداں
پھر اُس پر زعم یہ تیرا اُسے پہچان پائے گا

مجھے معلوم ہے مشکل ہے اس پر دو قدم چلنا
یہ راہِ حق ہے اس پہ کون میرے ساتھ آئے گا

لٹادے اس کی راہوں میں تو اپنے آپ کو پریمی
کہاں خالی عبادت سے خدا کو ڈھونڈ پائے گا

ہما مظفر، نئی دہلی

جاری دن رات تم سفر رکھو — راستوں پر مگر نظر رکھو
شوق ہے جنگ جیتنے کا اگر — اپنے ہاتھوں پہ اپنا سر رکھو
توڑ ڈالیں جو سب سلاخوں کو — اتنے مضبوط اپنے پر رکھو
ہر کہانی سمجھ میں آئے گی — اپنے الفاظ پُر اثر رکھو
سب کریں گے ہما تمہیں تسلیم — عیب کی بھیڑ میں ہُنر رکھو

☆☆☆

دیپک قمر، میرٹھ

سحر لائی تجلّی آسمانی
سنا الہام طائرِ کی زبانی
گئی اک بار جو موجِ جوانی
نہ ہاتھ آئی وہ عمرِ زعفرانی
بہت محفوظ بیٹھے تھے گماں میں
اتر آئی بلائے ناگہانی
خدا کا شکر کہ کھولی زباں ہے
مگر کانٹوں بھری ہے گل فشانی
یہ ہے حسن بیاں کا کارنامہ
وہی الفاظ ہیں بدلے معانی
ہیں سوتے جاگتے فکر سخن میں
وہی ہم ہیں، وہی عادت پرانی
ابھی زندہ ہے مل جاؤ اسے تم
نہ ہے مرحوم اور نہ آنجہانی
نہ جانے کیوں جدائی پر ہی آخر
کہا اس نے تمہاری مہربانی

ظفر اقبال ظفرؔ، فتح پور، یوپی

ہیں سنگ چاروں طرف پھر بھی آئینہ ہوں میں
کہ خوف کھاتا ہوں میں اور نہ ٹوٹتا ہوں میں

نفس نفس مجھے لگتا ہے اجنبی اب تو
جب اپنی ذات کے منظر میں لوٹتا ہوں میں

مرے لبوں پہ ہنسی آئے کس طرح آخر
ازل سے تا بہ ابد غم کا سلسلہ ہوں میں

ہے حوصلہ تو اسی سے سحر بھی نکلے گی
ابھی تو ظلمتِ دوراں سے لڑ رہا ہوں میں

ظفرؔ یہ کون سی منزل کا ہے سفر درویش
قدم اٹھاتا ہوں رکھتا ہوں روکتا ہوں میں

عبدالحق امامؔ، گورکھپور

سازش مرے خلاف مری چال رچ گئی
میں خوش نصیب تھا جو مری جان بچ گئی
بے رنگ ساعتوں کا سفر اور اداس رات
چل اے حسین غم تری گولی یہ کچ گئی
یہ عرش و فرش، شمس و قمر، آب اور ہوا
جلوہ گری سے منطقی ٹہنی ہی لچ گئی
ہر شخص ہے لگائے تعصب کا آئینہ
اس دور میں اے دوست وہ اب رسم بچ گئی
امید ہے کہ ہوگی پھر ہندوستاں میں جنگ
حد سے زیادہ دھوم ہر اک سمت مچ گئی
کیا جانئے کہ بخت میں کیا ہے لکھا ہوا
کانٹوں کی سیج سخت بدن کو کھرچ گئی
ہوگا کسی طرح بھی نہ حل مسئلہ امامؔ
ہم متفق تھے جس پہ وہ اب بات بچ گئی

☆☆☆

ڈاکٹر محسن جلگانوی، حیدر آباد

کیا شہر ہے یہ کوئی کسی سے نہیں ملتا
ملتا بھی اگر ہے تو وہ جی سے نہیں ملتا

ہاتھوں کے ملا لینے سے رشتے نہیں ملتے
دل کہتے ہیں جس کو وہ کبھی سے نہیں ملتا

ہے جیب اگر خالی تو گھر سے نہ نکلنا
بے دام یہاں کچھ بھی کسی سے نہیں ملتا

اس شخص کو اس شہر سے ملوایا تھا میں نے
اب ملتا ہے سب سے وہ مجھی سے نہیں ملتا

کاغذ پہ تو مشہور ترا نام بہت ہے
کیوں تیرا پتہ تیری گلی سے نہیں ملتا

آواز کی پہچان بڑی بات ہے لیکن
کچھ کم نہیں لہجہ جو کسی سے نہیں ملتا

ڈاکٹر قطب سرشار، حیدر آباد

صفاتِ دل ہے نمائندہ شقاوتِ سنگ
گروہِ سنگ دلاں شیوۂ اطاعت سنگ

ذرا سا فاصلہ رکھ کر گذر چٹانوں سے
بنا نہ دے کہیں پتھر تجھے رفاقت سنگ

فلک سے بارش سنگ ہے زمیں بھی ہے سنگلاخ
زجاج گر بھی ہیں مائل پئے زراعت سنگ

تحیرات ہیں اہرام مصر و تاج محل
محیط فہم و فراست لگے سیادتِ سنگ

فسادِ ذہن نے منظر بنائے خون آشام
فسادِ جوش و خرد کی چھپی شجاعت سنگ

کرشمہ ساز ہے ہر سو فراستِ مغرب
رہی نہ طاعت یزداں نہ ہی عبادت سنگ

اقبالِ گرامی، کھڑگ پور، کھنڈوہ

آنگن میں تری تری ہے کہ برسات آگئی
سندیشہ لے کے آئے ہیں پربتوں کے غول
لب پہ گلوں کے اِن دنوں ساون کے گیت ہیں
مُرجھائے ہوئے چہرے پہ یارو کسان کے
اقبالؔ گرمیوں سے ملےگی ہمیں نجات

چاروں طرف خوشی ہے کہ برسات آگئی
چرچا گلی گلی ہے کہ برسات آگئی
شاداب کلی کلی ہے کہ برسات آگئی
مسکان آگئی ہے کہ برسات آگئی
ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے کہ برسات آگئی

☆☆☆

احسان ثاقب، نوادہ

"کوئی ملا نہ تری جلوہ گاہ سے آگے"
کہ اک خلا ہے سفید و سیاہ سے آگے

میں اور کتنے فریب و گمان سے گذروں
ملے تو حد کوئی رمزِ نگاہ سے آگے

نکال مت مجھے دیوانگی کے عالم سے
سکون ہے کہاں دل کی پناہ سے آگے

خریدنی ہے نہیں گر زمین پر جنّت
ملے گی تم کو محبت کی راہ سے آگے

یہ بحر و بر ترے پانو کو جھک کے چومینگے
فقیر بن کے دکھا خود کو شاہ سے آگے

ابھی سے اتنے اجالے نہ دیکھ اے ثاقبؔ
سمجھ کے بڑھ نئی شعری اتھاہ سے آگے

حماد انجم، سنت کبیر نگر، یوپی

کورا جسم، نئے پانی میں
درپن ڈوبا حیرانی میں
پھول بہت اچھے لگتے ہیں
اپنی چاک گریبانی میں
تیرا میرا ربط عجب ہے
محو زلیخا زندانی میں
لازم ہیں آداب و ضوابط
ناموزوں ہے من مانی میں
روز نیا درباز ہوا ہے
سیر جہانِ امکانی میں
سیکھ ذرا شیرازہ بندی
ہر قطرہ ہے طغیانی میں!
نرخ کرو دوبالا انجم!
کیوں ہو اتنی ارزانی میں

پھول محمد نعمت رضوی برہمپوری، نیپال

تجھ سے دامن چھڑا لیا ہم نے
اپنی دنیا بسا لیا ہم نے
تیری قربت کا فیض ہے یہ بھی
خود کو انسان بنا لیا ہم نے
تم محبت کی بات کیا جانو
اس میں کیا کیا دیا لیا ہم نے
تیرے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے
درد غم کی دوا لیا ہم نے
جس سے مل کر ہوئے ہیں ہم رسوا
اس سے رشتہ چھڑا لیا ہم نے
آپ سے کرکے خود کو وابستہ
اپنی قسمت جگا لیا ہم نے
ان سے مل کر ہمیں لگا نعمت
جو بھی چاہا تھا، پالیا ہم نے

قوس صدیقی، پھلواری شریف، پٹنہ

وہ پرندہ جو شفق شاخ پہ پر تولتا ہے
وقت میزان پہ فتراک سفر تولتا ہے

کتنی امید سے گھر آکے وہ گھر تولتا ہے
دھول کے مول حنا رنگ گہر تولتا ہے

اتنا بزدل ہے کہ بیمار ہواؤں کی طرح
شور شہباز کا ٹوٹا ہوا پر تولتا ہے

آنکھ کا شوق کہ محراب میں گم ہوجائے
خواب آوارہ کہ دیوار میں در تولتا ہے

دھند ، چپرائی بھی احسان نگاہی کی تڑپ
لاکھ ہلکان وہ ہوتا ہے، مگر تولتا ہے

سوچ پیمانہ بہت ہوش نظر ہوتا ہے
وہ زمانے کا ہر اک زیر و زبر تولتا ہے

عالمی گاؤں کی سنگینی ستاتی ہے قوسؔ
آدمی خود کو جہاں آٹھوں پہر تولتا ہے

☆☆☆

صلاح الدین نیر، حیدرآباد

ضرورت جب بھی ہو پر کھولتا ہوں
جہاں کچھ بولنا ہے بولتا ہوں

اتر جاتے ہیں چہرے دوستوں کے
ہمیشہ سب سے ہٹ کر بولتا ہوں

ہیں اوروں کو ہی شکایت یوں زیادہ
مری عادت ہے کم کم بولتا ہوں

پسِ پردہ کہوں عادت بھی ہے
میں سب کے سامنے ہی بولتا ہوں

جو خوش ہوتے ہیں میری بات سن کر
میں اپنی بات ان سے بولتا ہوں

تمہیں کیوں اس کا اندازہ نہیں ہے
تمہیں معلوم ہے کب بولتا ہوں

یہ اہل بزم جب سنتے نہیں ہیں
تو نہیں سے جب کچھ بولتا ہوں

☆☆☆

رؤف خیر، حیدر آباد

(ولی دکنی کی زمین میں)

ہمارے منہ بھلا کیا خاک مجروح و مجاز آوے
ظفر ناصر جلالی ہی نہ مشتاق و فراز آوے

وہ سر افراز ہووے اور کر کے سرفراز آوے
ولی جو اولیاے حرف و معنی کو نواز آوے

تیمم زاد منہ پر چوکھٹوں کی خاک ملتا ہے
وضو کرنا لہو سے آوے تو طرزِ نماز آوے

میں کب سے راہ تکتا گوش بر آواز بیٹھا ہوں
نہ جانے کب وہ یارِ خوش خرام و دلنواز آوے

سمندر ہو کہ قطرہ ہو رہے اوقات میں اپنی
سمندر ہو کہ قطرہ ہو اچھل جانے سے باز آوے

ہمیں شہ مات کیا دیتا وہ سب مہرے گنوا بیٹھا
وہ شاطر ہی سہی اب آخری بازی سے باز آوے

نہ کوئی رازداں اس کا نہ کوئی رازداں اپنا
زبانِ چشم و ابرو کے حوالے سے جو راز آوے

ہمیں آتا ہے بے غرقاب دریا پار کرنا بھی
مگر ہے شرط استقبال کو وہ پاکباز آوے

یہی ہونا تھا ہم تو خیر کب کے ہو گئے اس کے
وہ ہم پر ناز فرماوے کبھی بہرِ نیاز آوے

☆☆☆

حفیظ انجم، کریم نگر، آندھرا پردیس

ایسی چلیں ہوائیں کہ ممتاز ہوگیا!!
کاگا ہمارے شہر کا شہباز ہوگیا!!

خاموشیوں کو اپنی سمندر میں جھونک کر
اک گونج ہوگیا ہوں میں آواز ہوگیا!!

انجام سوچنے کی بھی مہلت نہ مل سکی
دشتِ جنوں میں پیار کا آغاز ہوگیا

جس آستیں کے سانپ سے ڈر خوف تھا اسے
اب دوست ہوگیا ہے وہ ہمراز ہوگیا!

اب سوچتی ہے چیونٹی خلاؤں میں جاؤں گی
اپنے پروں پہ اس کو بڑا ناز ہوگیا!!

آخر گلا وہ گھونٹ دیا اعتبار کا!!
جوش و خروش سے مرا غماز ہوگیا!

اک روز وہ بھی بولے گا پر دیکھتے ہیں کب؟
تیرے بغیر دیکھ میں بے ساز ہوگیا!!

اشعار کہتے رہنا بھی فرہنگ دیکھ کر!!!
اس کے لئے تو باعثِ اعزاز ہوگیا!!

ادراک کے شجر پہ کھلا اک گلاب ہے
انجم کے شعر کہنے کا انداز ہوگیا!!

راز سیوانی، سیوان

پتھر اور نوکیلا کر
پھر زہر اب میں گیلا کر
سوزِ غم میں لذت رکھ
کچھ لکڑی کو گیلا کر
مجھکو کوئی چھو نہ سکے
پھولوں کو زہریلا کر
عکس چہرہ دستی سے
کانٹوں کو شرمیلا کر
آگ دبالے سینے میں
لہجے کو برفیلا کر
زہر انا کا جبراً پی
رنگ لہو کا نیلا کر
جستہ جستہ خود کو مٹا
ہستی کو خرچیلا کر
اتم خواہش پوچھ تو لے
پھندے کو کچھ ڈھیلا کر
راز بھرم تو رکھنا ہے
کوئی بہانہ حیلہ کر

انجم سیوانی، سیوان

بھلا ہوگا زندگی کا کوئی اور کیا فسانا
کبھی کیف میں مچلنا کبھی غم میں مسکرانا
کبھی پھول اور پتھر بھلا مل کے رہ سکے ہیں
ترا طور حاکمانہ مرا طور عاجزانا
اسی رنگ میں تو ساری کٹی زندگی ہماری
کبھی ان سے صلح نامہ کبھی اِن سے شاخسانا
چلے آئے ہو تو سُن لو رہِ زندگی ہے مشکل
ذرا تم سنبھل کے چلنا کہیں ڈگمگا نہ جانا
یہی ہے مسافرت میں مری زندگی کا حاصل
کہیں شام کو بسیرا کہیں صبح کو ٹھکانا
جو عزیز تھے مسافر وہی لاپتہ ہوئے ہیں
کسی راہبر نے ایسی چلی چال شاطرانا
اس بات پر تو انجم رہی جنگ زندگی سے
کبھی صبح ماند پڑنا کبھی شام جھلملانا

سرور حسین، پٹنہ

سروں پہ جلتا ہو دشتِ آفتاب سہی
ملا نہ سوکھی زبانوں کو ایک بوند کا لمس
بہت دنوں سے درِ دل پہ تھی نہ بارش سنگ
عطا مجھے بھی خدا کردے جرأت انکار!
کھڑے ہیں دیکھنے تعبیر خواب دیوانے
کب اُس کے در پہ کوئی بے نیاز جاتا ہے
اندھیرے اپنا کہاں منہ چھپائیں گے دیکھیں
کہیں، غروب تو ہو اب عذاب کا سورج

عذاب شرطِ سفر ہے تو یہ عذاب سہی
وہ چاہے پانی ہو، آنسو ہو یا شراب سہی
اب اس نے کی ہے عنایت تو بے حساب سہی
بلا سے ہوتی ہے ہو عاقبت خراب سہی
اُٹھے جو چہرۂ منزل سے اب نقاب سہی
نگاہ لطف سہی نہ سہی عتاب سہی
نکل کے آیا کہیں سے جو آفتاب سہی
جھکے بھی دل پہ کوئی شاخ ماہتاب سہی

حباب ہاشمی، الہ آباد

عشق میں چاک گریباں نہیں ہوتا کہ نہ ہو
اپنی رسوائی کا ساماں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

دل میں ہر ایک کے ارماں نہیں ہوتا کہ نہ ہو
آدمی خود سے پریشاں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

پا شکستہ ہوں پہنچ جاتا ہوں جب منزل پر
وہ مجھے دیکھ کے حیراں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

چاہتا ہوں دم رخصت نہ ہو وہ آزردہ
ایک تارہ سر مژگاں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

کارواں سے جو الگ ہو کے چلا کرتا ہے
اُس کے لٹ جانے کا امکاں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

کوئی شاعر، متشاعر کہ ہو تکبندِ غزل
بزم شعرا میں غزل خواں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

جب نظر پڑتی ہے خود کردہ گناہوں پہ حبابؔ
دل چراغ تہہ داماں نہیں ہوتا کہ نہ ہو

محمود ظفر، ریاض (سعودی عربیہ)

اس عہد میں جینے کی سزا کاٹ رہے ہیں
ہم اپنے ہی زخموں کا لہو چاٹ رہے ہیں

آپس میں جو تفریق ہے مٹتی ہی نہیں وہ
گہری ہے، بہت کھائی جسے پاٹ رہے ہیں

کس درجہ ہیں مدہوش سیاست کے پجاری
جس شاخ پہ بیٹھے ہیں اسے کاٹ رہے ہیں

آزاد ہیں اس شہر میں اب سارے پرندے
چالاک شکاری یہ خبر بانٹ رہے ہیں

کشکول گدائی لئے پھرتے ہیں ظفرؔ آج
تسلیم کہ کل آپ بھی سمراٹ رہے ہیں

رشید نظر، بھوپال

شائستہ زباں رکھنا لہجہ بھی نیا رکھنا
ہر وقت مری کٹیا، جالوں سے چھپا رکھنا
رنگت بھی نہیں باقی نکہت بھی نہیں باقی
اک لہر مٹا دے گی سارا ہی وجود اس کا
ممکن تو نہیں لیکن کہنا ہے مگر میرا
یہ دیدہ وری ہے یا اس شوخ کی نادانی
موسیٰ کے اشارے پر دریا میں بنا رستہ
کچھ اہلِ نظر ہمکو یہ درس بھی دیتے ہیں

انسان کی عظمت کا معیار بنا رکھنا
محفوظ ہر آفت سے مجھکو بھی خدا رکھنا
مسلی ہوئی کلیوں کو اب یاد بھی کیا رکھنا
پانی پہ سمندر کے کچا نہ گھڑا رکھنا
دوبارہ جنم جب پھر راشی تلا رکھنا
جو کام ضروری ہے، وہ کل پہ اٹھا رکھنا
موجوں پہ پڑا بھاری پانی پہ عصا رکھنا
گر کام برا کرنا پر دل سے برا رکھنا

سہیل اختر، بھونیشور

بذاتِ خود تو اک سازِ فنا ہوں
ابھی جیون کے سُر میں بج رہا ہوں
نہ اندازہ بھی کر پاؤ گے میرا
میں ہر تخمینے سے باہر رہا ہوں
مرا منہ بند ہو یا کان تیرے
ترا سچ ہوں میں تجھ میں گونجتا ہوں
میں پہلی بار جب اس سے ملا تھا
لگا تھا جیسے پہلے مل چکا ہوں
ہوں پھر بھی کہکشاں در کہکشاں میں
گو اپنی ذات کے اندر چھپا ہوں
روایت کا رہا منکر ہمیشہ
قبیلے سے نکالا جا چکا ہوں
سہیل اب مجھ سے کیا حل کی توقع
کہ خود الجھا ہوا اک مسئلہ ہوں

م۔ع۔باسط، جالنہ (مہاراشٹر)

ہے ترقی کا نہاں بس اس میں راز
ذہن کے در تم کرو اب اپنے باز
مقصد تخلیق انساں بندگی
بندگی ہی میں نہاں ہے اس کا راز
وقت اور حالات سے مجبور ہو
پھر بھی باطل سے کرو مت ساز باز
زور بازو سے ہو تم محروم کیوں
ظلم کا یہ سلسلہ ہے کیوں دراز
کوششوں کا سب کو دیتا ہے ثمر
جانتے ہو رب ہے کتنا کارساز
ہم کو پتھر دل ملے انساں کئی
چند ہی ایسے ملے دل تھے گداز
جور اور ظلم و ستم ہیں جن کی خو
آنہیں سکتے کبھی عادت سے باز
مطربہ نے غم کی چھیڑا ہے اسے
بج اٹھا ہے پھر سے میرے دل کا ساز
ناز بہتوں کو ہے گو اعمال پر
پر ہے باسط کو کرم پر اس کے ناز

ظفر رانی پوری، حیدرآباد

نہ منزل ہے نہ کوئی راہ پھر بھی چل رہے ہیں ہم
ہمیشہ ہی لہو سے سرخیاں لکھی گئیں اپنے
وفا ہے پیار نہ اخلاق نہ مہر و محبت ہے
کوئی انکار کی جرات نہ کرسکتا یہ وہ سچ ہے
بہت دن تک طبیعت تھی معطر کیسی خوشبو تھی
یہ اب عالم ہے کہ ہم قید ہیں کتنے مسائل میں

نہ جانے کون سا پیکر ہے جس میں ڈھل رہے ہم
ہمیشہ ہی پڑھا کہ حاصلِ مقتل رہے ہیں ہم
تو کیا، اک اپنے اندر آگ ہے اور جل رہے ہیں ہم
زمانے کے لئے ہر دور میں مشعل رہے ہیں ہم
بہت دن بے سبب کیوں اس طرح پاگل رہے ہیں ہم
حقیقت یہ ہے کتنے مسئلوں کا حل رہے ہیں ہم

☆☆☆

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

☆ **کتاب کا نام: تذکرہ آل تراب**، مصنف: عبدالخالق خلیق مرحوم، مرتب: ڈاکٹر شائق احمد یحیٰ، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، رابطہ: پروفیسر شاکر خلیق، محلہ شاہ سوپن، دربھنگہ ۸۴۶۰۰۴، مبصر: ڈاکٹر حسن امام درد، دربھنگہ

زیر نظر کتاب برادر محترم حاجی عبدالخالق خلیق مرحوم کی خاندانی اور شخصی حالات وکوائف اور اس کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان کے دور کے معاشرتی اور سیاسی حالات کے تذکرے پرمبنی ہے۔ خالق بھائی سے میرے راہ ورسم رہے ہیں۔ وہ زندگی بھر تدریس، عملی سیاست اور سماجی بہبود کے لئے فعال رہے۔ مدرسہ امدادیہ کی مجلس شوریٰ میں اکثر ان سے ملاقات رہی اور وہاں کی ان کی صائب رائے نے مجھے اکثر متاثر کیا۔ امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سے ان کی عقیدت اور رفاقت پرخلوص رہی۔ یہاں اس حوالے سے ان بزرگوں سے میرے روابط کے بیان کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کتاب میں سلسلہ نسب کے کوائف کے علاوہ آپ بیتی کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے اساتذہ، ہم جماعتوں، یہاں تک کہ بعض شاگردوں کا اجمالی تذکرہ رقم کیا ہے۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے بی اماں، علی برادران، گاندھی جی، جناح، راجندر پرشاد، شفیع داؤدی وغیرہ کے ساتھ ان کی ملاقات اور بعض کے ساتھ قربت کا بھی تذکرہ ہے۔ بہت سے چشم دید روایات ایسے بھی ہیں جن کا تذکرہ تاریخ میں نہیں ہے۔

زبان بڑی خوبصورت اور رواں ہے۔ زبان کی شگفتگی اور معلومات کی فراوانی، قاری کو کتاب سے باندھے رکھتی ہے۔ کتاب کی غرض وغایت خود مصنف کی زبان سے سنئے: "میرا فرض ہے کہ مجملاً اپنا تجربہ اپنے خاندان کے آئندہ ہونے والے نوجوانوں کو بتادوں۔"

مرحوم عبدالخالق خلیق کے دو مسودے (۱) تذکرہ آل تراب و سرگزشت عبدالخالق خلیق (۲) سفرنامہ حج بیت اللہ پر مرکوز، ڈاکٹر شاہد احمد یحیٰ نے پروفیسر شاکر خلیق کی زیر نگرانی تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۹۸ء میں ایل این متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ زیر نظر کتاب ان کے پہلے مسودے کی مطبوع شکل ہے۔ کتاب صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے اہم ہے۔ خاص کر ملت کے نوجوان نسل کے لئے صحیفہ ہدایت ہے اور سنجیدہ قاری کے لئے نعمت بے بہا۔

☆ **کتاب کا نام: قد آوراں (نظمہائے فارسی)**، شاعر: پروفیسر عبدالمنان طرزی، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: عام اڈیشن ۳۰۰ روپے، لائبریری ایڈیشن: ۴۰۰ روپے، رابطہ: محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ، مبصر: ڈاکٹر حسن امام درد، دربھنگہ

زیر تبصرہ کتاب تمیں قد آوران علم وادب کا منظوم تذکرہ بہ زبان فارسی ہے۔ دور قدیم کے جلال الدین رومی اور ولی دکنی کو چھوڑ کر تمام حضرات عصر حاضر سے تعلق رکھتے ہیں جن کی علم وادب کی دنیا میں باوقار حیثیت ہے۔ کتاب پر مقدمہ ایرانی ایمبسی دربند کے مدیر مرکز تحقیقات فارسی وایرانی فرہنگی جناب علی رضا قزوہ نے رقم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "استاد پروفیسر عبدالمنان طرزی کے اشعار فارسی کا دفتر میرے سامنے ہے۔ میں نے اب تک موصوف کو نہیں دیکھا ہے۔ یہ اشعار مجھے پروفیسر محمود عالم کے ذریعہ شاعر کی تصویر کے ساتھ ارسال ہوئے ہیں۔ تاکہ اس مہربان اور اہل دل بزرگ کو دیکھوں اور شعر کے عطر وبو کو ان کی نگاہوں سے سنوں۔" مختصراً یہ کہ وہ آگے کہتے ہیں کہ اس سے پہلے ایرانی، افغانی، تاجیک شعراء کے مجموعہ کلام پر مقدمہ لکھ چکا ہوں اور ہند کے بھی دو فارسی شعراء، پروفیسر ولی الحق انصاری اور ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کے مجموعۂ کلام پر بھی مقدمہ لکھنے کا شرف حاصل

کر چکا ہوں۔ گو ان کے کلام ایران کی زبان سے مماسلت رکھتے ہیں لیکن یہ سعادت مجھے استادار جمند پروفیسر عبدالمنان طرزی کی چیزیں پڑھ کر ہوئی کہ اس کو یادگار کے طور پر رکھوں، ان کا اظہار خیال کی میری بضاعت تو نہیں ہے لیکن اس کلام سے عقیدت تو رکھ سکتا ہوں۔ ارادت اس لئے ہے کہ ان کے اشعار اصل پارسی ہیں اور اعلیٰ معیار کے ہیں۔ اس تبصرہ میں جناب علی رضا قزوہ کی تمام باتوں کا احاطہ ممکن نہیں ہے لیکن انہوں نے طرزی صاحب کے زبان کے ساتھ ساتھ بیان کو بہت سراہا ہے۔

پروفیسر طلحہ رضوی برق نے اپنے مضمون ڈکتر عبدالمنان طرزی۔ سخن گستر فارسی، کے تحت لکھا ہے کہ پروفیسر عبدالمنان طرزی کو مثالی نابغان عصر میں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے ایسی نظیر نہ ملی۔ ان کی شخصیت علمی میدان میں کثیر الجہات کی ہے۔ وہ وہبی شاعر ہیں۔ خوشگو و بسیار گو ہیں اور ساتھ طبع جواں و جولاں رکھتے ہیں۔ شعر و ادب میں دستگاہ کامل اور عربی اور فارسی زبان پر عبور رکھتے ہیں۔ ان کے فکر و خیال فارسی کے شعراء سے اثر پذیر ہیں۔ بعد میں ان کے ان اشعار سے جو مختلف دانشوروں کے حوالے سے کہے گئے ہیں چند مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ لیکن صرف مظہر امام کی وطنیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ شاید تر ہت اور مگدھ کے درمیان گنگا ندی کا پل ہوتا ہے۔

پروفیسر محمود عالم نے طرزی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کو بہ حسن وخوبی اجاگر کیا ہے۔ میں اپنے تبصرے کو انہیں کے الفاظ میں یہ کہتے ہوئے ختم کرتا ہوں کہ طرزی صاحب نے 'قدآوراں' اپنی خوش خط تحریر کے ساتھ مجھے مرحمت فرمائی ہے، جو میرے لئے ایک بے بہا تحفہ ہے۔ آخر میں ایک بات اور بھی کہہ دوں کہ فارسی کا ذوق گویا اس ملک سے ختم ہو رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ طرزی صاحب نے اسے نئی زندگی بخشنے کی صائب کوشش کی ہے۔

☆ **کتاب کا نام: فکر رسا، شاعر: محمد نصیح رسا در بھنگوی، مصنف: پروفیسر عبدالمنان طرزی، اشاعت: ۲۰۱۰ء قیمت: ۱۰۰ روپے محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ ۴، مبصر: ڈاکٹر حسن امام درو، دربھنگہ**

زیر تبصرہ کتاب پروفیسر عبدالمنان طرزی کی تحقیق و تدوین پر مبنی ہے۔ یہ اس شخص کی کہانی ہے جس کے گھر چھوڑنے اور گھر واپس آنے کی مدت پچاس پچپن سال کی ہے۔ محقق نے تلاش بسیار کے بعد رسا در بھنگوی کے سوانحی خاکے مرتب کئے ہیں۔ اندازہ ہے کہ کچھ مواد محقق کو اس کتابچہ سے حاصل ہوئے ہیں جو انتخاب کلام رسا کے نام سے ممبئی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جسے اس مجموعہ میں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

محقق نے پچیس صفحات میں رسا اور ان کی شاعری پر محققانہ اور ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ رسا در بھنگوی نے ابتدا میں عبدالشکور آہ سے اصلاح لی، رنگون میں قیام کے دوران علامہ عیش امروہوی سے استفادہ کیا۔ لیکن باضابطہ مشورہ سخن کا سلسلہ احقر وارثی موہانی سے ہی رہا۔

ابراہیم اشک کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا ذہن خلاقانہ ہے اور طبیعت میں اختراعی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ عام مروجہ اصناف شاعری کے ساتھ نسبتاً مشکل ترین اصناف میں طبع آزمائی اشک کی پہچان ہے۔ دوہا، گیت، ماہیا، غزل، لعلن، جھارن وغیرہ میں انہوں نے اپنا جوہر دکھایا ہے۔ ''اللہ ہی اللہ'' اسماء الحسنیٰ کے تعلق سے لکھے گئے دوہے اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔ ترتیب میں دوہے اور رباعیات سے قبل مقبول واحد کے عرض مرتب ابراہیم اشک کی اپنی بات، رفیق شاہین کا ''اللہ ہی اللہ'' ایک رفیع الشان کارنامہ اور مفتی عبداللطیف قاسمی کی تحریر شامل ہے۔ مقبول واجد نے اپنی اس ترتیب کو سفر آخرت کا سامان جانا ہے۔ رفیق شاہین نے اپنے مضمون میں ابراہیم اشک کی رباعی گو کے اختصاص سے

گفتگو کرتے ہوئے اسماء الحسنی کی شعر بندی کو رفیع الشان کارنامہ قبول کیا ہے۔

بلا شبہ رب پاک پروردگار کے اسماءِ حسنیٰ کا ذکر کرنا، تحریر کرنا باعث ثواب ہے۔ اس ذات پاک کے تعلق سے ان کے ناموں کو شعر کے قالب ڈھالنا سعادت کی بات ہے۔ یہ کام اور بھی قابل قدر ہو جاتا ہے جب رباعی جیسے مشکل اصناف کو اس کے لئے منتخب کیا جائے۔ یہ مرحلہ بھی ابراہیم اشک نے آسان کرلیا ہے اور رباعی کے ساتھ دوہے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ خالق کائنات کے ایک نام المغنی دیکھئے اور دل کو پرنور کیجئے۔

کم نام کو شہرت جو عطا کرتا ہے — بیمار کو راحت جو دیا کرتا ہے
اے اشک بڑا نام ہے مغنی اس کا — کمزور کی طاقت جو سوا کرتا ہے

اللہ ہی اللہ کو دوہے کے رنگ بیان میں دیکھئے۔

ایسا وہ پرنور ہے، سب کو دیتا نور — دنیا کی ہر چیز میں قائم وہی ظہور

شعری اکادمی بھوپال کے زیر اہتمام مقبول واجد نے اس مجموعے کو ایک ساتھ اردو ہندی دونوں زبانوں میں شائع کیا ہے۔ کتاب دائیں جانب سے بہ زبان اردو ہے جب کہ بائیں جانب سے رباعیات اور دوہے کو دیوناگری لپی (ہندی) میں شامل اشاعت رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ شاعر ابراہیم اشک اور مرتب جناب مقبول واجد کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ یقین ہے اس طرح کی کتابوں کو سنجیدہ علمی حلقہ پسند کریگا اور اللہ تعالیٰ اپنے ناموں کے طفیل دلوں میں مزید وسعتیں فرمائے گا۔

☆ **کتاب کا نام: اردو افسانہ اور چند افسانہ نگار، مصنف:** پروفیسر افتخار اجمل شاہین، صفحات: ۲۰۰، قیمت: تین سو روپے، مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

پروفیسر افتخار اجمل شاہین شاعر ہیں اور ناقد ہیں۔ تین شعری مجموعے اور تنقیدی مضامین کی دو کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ اب ۲۰۱۰ء میں اردو افسانہ کے حوالے سے پیش نظر کتاب بصیرت افروزی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اردو افسانے پر ایک نظر اردو افسانے کا مستقبل، پاکستان میں اردو افسانہ نگاری: ایک جائزہ، ہمارے افسانہ نگار اور عصری و علاقائی تقاضے کہانی لکھنی ہے یا لکھی جاتی ہے، ابوالفضل صدیقی: سوال میرے جواب ان کے؟ قرۃ العین حیدر: ایک لیجینڈ؟ پریم چند، شکیل الرحمٰن کی نظر میں شاہد کامرانی کے افسانوی مجموعہ بے انت سفر پر ایک نظر شیر شاہ سید کے فیسٹولائی افسانے، آکاش ساگر: ایک جائزہ، نجمہ عثمان کی افسانہ نگاری، رشتوں کے بھنور پر ایک نظر، محسن بھوپالی کی منظوم افسانہ نگاری، اردو ڈرامے پر ایک سرسری نظر، لمحوں کی دستک (شبنم یزدانی)، ڈوبتی ہوئی پہچان (حسانہ انیس)، سناٹا بولتا ہے (شہناز پروین)، رضاء الجبار کے افسانے "دلیل" کا تجزیہ اور ابراہیم اشک کے افسانے "جیون دان" کا تجزیہ، جیسے بیسوں مضامین ست نما ہیں۔ اردو افسانے پر یوں تو بہت سی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں لیکن افتخار اجمل شاہین کی اس کتاب میں افسانے کے فن کی تفہیم ہے، تجریدی اور علامتی افسانے کی نشاندہی ہے، جمود پر خدشات کے نئے تقاضے کی روشنی ہے، مقبولیت اور عدم مقبولیت پر دانشمندانہ سوچ ہے، المیہ سقوط مشرقی پاکستان کے افسانوں کا ذکر ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق مغربی پاکستان کے افسانوں کے تلخ حقائق ہیں۔ باہمی رابطے کے انقطاع کے باوجود پاکستان اور ہندوستان میں اردو افسانے کا منظر نامہ ہے، معاشرت، مسائل اور تہذیب کے عکاس افسانوں کا پس منظر ہے، زبان، بولی اور مقامی لب ولہجہ سے بھرپور افسانوں کا پیش منظر ہے؟ قومیت، سیاسی نظریے اور حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور افسانوں پر گفتگو ہے۔ ہجرت کے مسائل اپنوں کی بے حسی، بے غیرتی،

جبر، ظلم، ناانصافی، ناعاقبت اندیشی، خودغرضی، استحصال، کسان، مزدور، وڈیرے، جاگیردار، اور سرمایہ دار کے درمیان ہونے والی کشمکش جیسے موضوعات کی نشاندہی ہے۔ جنسی اور نفسیاتی حقیقت نگاری سے بھرپور افسانوں کا مختصراً جائزہ ہے اور اسلامی اقدار پر مبنی تبدیلیاں لانے والے افسانوں پر توجہ ہے۔ ساتھ ہی خواتین افسانہ نگاروں کے نئے افق کی تلاش ہے۔ افتخار اجمل شاہین نے عصری اور علاقائی افسانہ نگاروں کی ذی شعوری اور اختراعی ذہن کو بھی اسٹرکٹ کیا ہے۔ ان کے یہ تمام مضامین سائنٹفک اصول تنقید پر پورے اترتے ہیں اور سوچ کے دائرے کو وسیع ترمعنی میں پیش کرتے ہیں۔ تہہ داری اور فکر انگیزی افتخار اجمل شاہین کی تنقید کی نمایاں خوبی ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو افسانے پر یہ کتاب مختلف زاویے سے روشنی بکھیرتی ہے۔ سوچ اور فکر کو مہمیز کرتی ہے۔ نیا آئینہ دکھاتی ہے اور موثر نقش مرتسم کرتی ہے۔

☆ کتاب کا نام: خیریات، مصنف: رؤف خیر، صفحات: ۲۳۲، قیمت: دوسو روپے، رابطہ: 9-11-137/1، موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۸، مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

رؤف خیر قادرالکلام اور تنوع پسند شاعر ہیں۔ اس مجموعہ میں حمد، نعت، غزل، فارسی غزلوں کے تراجم، قطعہ تاریخ، نظم، شخصیاتی نظمیں، مرثیہ، منظوم تراجم، ترائیلے، ہنکونی، ماہیے، ہائیکو، تنکا، یک مصرعی نظمیں اور سانیٹ جیسی اصناف کی کہکشاں بکھری ہوئی ہے۔ ان میں تجربات و مشاہدات اور پہچان و شناخت کا تشخص ہے۔ نئے موضوعات کے ساتھ نئے میلانات کی تلاش ہے۔ منفرد و مخصوص انداز بیان ہے، وسعت و ہمہ گیری ہے۔ فنی، فکری اور لسانی انفرادیت کا امتیاز ہے اور ذہنی افق پر عصری شعور کی جلوہ افروزی ہے:

اسی حوالے سے بنتا ہے اپنا کام اللہ	ہمارے حق میں وسیلہ ہے تیرا نام اللہ	حمد
نبوت اور امامت تا قیامت آپ کا حق ہے	معانی اقتدا کے بھی بتانے آپ آئے ہیں	نعت
درونِ ذات کڑواہٹ ہے اور بیرون میٹھا ہے	ہے منطق ترش، استدلال افلاطون میٹھا ہے	غزل

یہ مصنوعی بندوق لے کے سڑک پر نہ جا میرے بیٹے / مرے دیش کے یہ بہادر جواں / ان کھلونوں سے واقف نہیں ہیں / کہیں تجھ پہ دہشت پسندی کا لیبل نہ لگ جائے / اور ان کے سینوں پہ اک اور تمغہ نہ بڑھ جائے (نظم "دہشت پسند")

میں اپنی ذات سے قطرہ سہی سمندر میں / مجھے کوئی نظر انداز کر نہیں سکتا / مراد مارغ ہے پس منظر اور منظر میں / میں اپنی ذات سے قطرہ سہی سمندر میں / رکھلا رہا ہوں شب و روز پھول پتھر میں / رکہ بحر شور میں شہداب مر نہیں سکتا / میں اپنی ذات سے قطرہ سہی سمندر میں / مجھے کوئی نظر انداز کر نہیں سکتا (ترائیلہ۔ شخصیت)

ماحول ہی ایسا ہے / لاکھ نہ مانو تم / بھگوان تو پیسہ ہے (ماہیا)

دانش پیچھے رکھ / رنجش اس سے بھی نیچے / خواہش پیچھے رکھ (ہائیکو)

"خیریات" میں شامل بہت سی اصناف کے گوشے منور نظر آتے ہیں۔ رؤف خیر کے تجربات جمالیاتی اور جنسیاتی سطح پر خوشگوار ارتعاش پیدا کرتے ہیں وہ سماجی اور سیاسی شعور رکھتے ہیں اور رنگا رنگی پیدا کرنا جانتے ہیں۔ ان کی اطلاقی جہتوں میں جو امکانات ہیں وہ یقیناً اضافہ ہیں۔ ساتھ ہی فکریات میں نئے چیلنج سامنے لاتے ہیں۔

☆ کتاب کا نام: پریم ناتھ پردیسی: عہد شخص اور فنکار، مصنف: ڈاکٹر برج پریمی، قیمت: تین سو روپے، رابطہ: تپسیا-1/3 نصیب نگر، ہمپوش کالونی، جانی پور، جموں۔ 180007، مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

یہ کتاب ڈاکٹر پریمی رومانی نے ترتیب دی ہے۔ برج پریمی ان کے والد تھے جنہوں نے ۱۹۷۸۔۱۹۷۷ء میں پریم

ناتھ پردیسی پر یہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں ان کی محنت ہر صفحہ سے عیاں ہے۔ ان کے انتقال کے انیس سال بعد پریمی رومانی نے کتابی شکل میں شائع کی ہے۔ چودہ تصویروں سے مزین اس کتاب میں پریم ناتھ پردیسی کی حیات، شخصیت کے اہم گوشے، فکری اور ادبی پس منظر، پردیسی کے افسانے، پردیسی کی شاعری، پردیسی: ایک نظر میں، پردیسی کا ادب، مشاہیر کے خطوط پردیسی کے نام، پردیسی کے معاصرین کے خطوط برج پریمی کے نام، پردیسی کے افسانے رنثر پارے اور پردیسی کا منتخب کلام جیسے عنوانات کے تحت مواد شامل ہے۔ پریم ناتھ پردیسی بنیادی طور پر افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ ویسے انہوں نے رپورتاژ اور ڈرامے بھی لکھے تھے اور بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ ان سب کی نشاندہی برج پریمی نے اس کتاب میں کی ہے۔ پردیسی کی تحریروں کے معترف بابائے اردو عبدالحق، سید احتشام حسین، خواجہ غلام السیدین، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ بھی تھے۔ پردیسی ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ یعنی صرف ۴۶ سال زندہ رہے۔ محکمہ کسٹم وا یکسائز میں ملازمت کرنے کے علاوہ ریڈیو کشمیر میں پروگرام اسسٹنٹ کے عہدے پر بھی کام کیا۔ ان کا تخلیقی سفر ۱۹۲۳ء سے شروع ہوا۔ ۱۹۳۲ء تک شعر کہتے رہے۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف مائل ہوئے۔ پہلے وہ پریم ناتھ رونق کاشمیری کے نام سے لکھتے تھے۔ لیکن پھر پریم ناتھ پردیسی ہوگئے۔ انہوں نے جاگیردارانہ اور چک دارانہ نظام کے خونیں پنجے پیوست دیکھے تھے۔ استحصال، نوکرشاہی، رشوت خوری، ناخواندگی اور اقتصادی نابرابری کا دور دورہ دیکھا تھا جس کے خلاف پردیسی نے بھی لکھا اور کھوکھلی جمال پرستی اور زندگی کی رمق سے ہماری تخیل پرستی سے خود کو الگ رکھ کر نئے شعور کا وہ احساس دلاتے رہے۔ اور نئے پیکر تراش کر موضوعات کی ہمہ گیری کے ساتھ فن کے اعلیٰ نمونے خلق کرتے رہے۔ انسان دوستی، عوامی مسائل، قدروں کی معنویت، سرمایہ دارانہ نظام کی ریشہ دوانیاں، اقتصادی نابرابری اور مذہب کے نام پر استحصال جیسے موضوعات پر انہوں نے لکھا۔ کئی انجمنوں سے وابستہ رہنے والے اور کئی اخبار میں کالم لکھنے والے اور زندگی بھر متحرک رہنے والے پریم ناتھ پردیسی پر یہ کتاب بیحد اہم ہے۔ برج پریمی نے پردیسی کے پس پردہ کئی عہد کا فلسفۂ حیات پیش کیا ہے۔ کشمیر کے زعفران کی طرح خوشبو بکھیرنے والی اس کتاب میں تحقیق ہے، تنقید ہے اور شخصیت شناسی ہے۔

☆ کتاب کا نام: شام ہوتے ہی، شاعر: راشد انور راشد، قیمت: ایک سو پچاس روپے، رابطہ: نواب پبلی کیشن، تھرڈ فلور، ڈریم ہومس اپارٹمنٹ، سرسید نگر، علی گڑھ۔ ۲۰۰۲ء، مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

راشد انور راشد نثر و نظم پر یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ "شام ہوتے ہی" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ وہ تقلید اور روایت کے قائل نہیں ہیں۔ اردو غزل میں جو نت نئے اسلوبی، ہئیتی اور فنی تجربے تدریجی وسعت و اہمیت حاصل کرتے رہے ہیں ان سے وہ غافل نہیں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جدت و جودت کے نقوش نمایاں ہیں۔ ان کی غزلیں مدھم، دل نشیں اور روح پرور انداز سے بولتی نظر آتی ہیں:

آنچ آئی ہے بھروسے پہ تو حیرت کیسی
اپنے ہمراز سے وہ بات چھپائی کیوں تھی

میں بوڑھا ہوچلا ہوں پھر بھی ماں تاکید کرتی ہے
مرے بیٹے نہ جانا گھر سے باہر شام ہوتے ہی

میرے اندر سے اٹھی بپھری ہوئی موج فنا
جس کو اپنے پہ بھروسہ ہے مقابل ہوجائے

وہ بوند بوند قیامت، وہ نور نور بدن
کسی نے دیکھ ہی کب ہے اسے سنورتے ہوئے

راشد انور راشد عرفان حسن ذات کے شاعر ہیں کیونکہ ان کی غزلوں میں جہاں تک اسلوب جذبہ اور طہارت کا سوال

ہے ان میں مسائل اور اظہار مسائل کی صورتوں میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں جذبے اور طہارت کی ہمکاری سے الفاظ علامت بن جاتے ہیں اور معانی کی گونج اس طرح سنی جاتی ہے جیسے سیپ میں سمندر کی گونج سنائی دیتی ہے:

گھیرے میں مجھ کو رکھتا ہے یادوں کا ایک ہجوم — حملے سے پہلے سوچ لے، تنہا نہیں ہوں میں

نظر میں دھول فضا میں غبار چاروں طرف — ضرور پھیلے گا اب انتشار چاروں طرف

جھنڈ میں لوٹنے لگتے ہیں سنہرے پنچھی — سوکھی شاخوں پہ جب پھول کھلاتی ہے ہوا

غرقابی اور شئے ہے ابھرنا ہے اور چیز — دریا چڑھا ہوا ہے بھنور چن رہا ہوں میں

معانی اور صورتوں کی تعبیرات کی بھیڑ میں راشد انور راشد کی آنکھ کھلی رہتی ہے ان کی غزلوں میں خارجیت اور داخلیت اس طرح ایک دوسرے میں تحلیل ہوتی ہے کہ ان کا مافی الضمیر تاثر کی رو کی صورت میں سامنے والی کی پوری تسکین فراہم کرتا ہے:

تجھ کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھاؤں تو لگے — پھول کے ساتھ ہر اک شاخ میں کانٹا بھی تو ہے

بدن کی آگ میں ہر شام جلنا چاہتا ہوں میں — قریب آ زندگی تجھ کو بدلنا چاہتا ہوں میں

داخلی ربط پوری طرح راشد کی غزلوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ ان کا ہر شعر پورے سمندر کی گونج رکھتا ہے۔

☆ **کتاب کا نام: اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا میزان**، مصنف: ڈاکٹر بانو سرتاج، قیمت: دو سو پچاس روپے، رابطہ: سرتاج ہاؤس، بالمقابل آکاشوانی، سول لائنز، چندرپور، ۴۴۲۴۰۱ (مہاراشٹرا)، مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ڈاکٹر بانو سرتاج کی اس کتاب میں ۲۷ افسانے شامل ہیں۔ ہمہ جہت اور ہمہ صفات بانو سرتاج حقیقت نگار ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز اور نیرنگیوں کو مختلف رنگ سے پیش کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ ان کے موضوعات سماجی مسائل اور تہذیب و ثقافت کے تضادات کے گرد گھومتے ہیں۔ ان مسائل میں گھر آنگن بھی ہے اور کالج سے دفتر تک کی انجمنیں بھی ہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ افسانہ ''پھینکی ہوئی عورت'' میں ماں بیٹے اور بہو کا المیہ ہے:

''ان کے دل میں ٹیس اٹھی۔ چار سال قبل ان کے شوہر کے انتقال کے بعد بہو انہیں اپنے ساتھ لانے پر آمادہ نہیں تھی۔ بیٹے نے اس کے پاؤں پکڑ لئے، میں اکیلی اولاد ہوں ان کی۔ کہاں جائیں گی اماں؟ لوگ کیا کہیں گے؟ لے چلتے ہیں۔ پڑی رہیں گی ایک طرف''۔

افسانہ ''کیل پر ٹنگا بچپن'' نفسیات کو پیش کرتا ہے۔ سارہ اور داور کی زندگی کے اتار چڑھاؤ بڑے عجیب ہیں:

''سوال جیت ہار کا نہیں ہے، میں نے زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آپ کی دنیا لائبریری اور آپ کے خزانے تک محدود ہے۔ میں نے رشتوں کی وسیع دنیا میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی ہے۔ بزرگوں سے ہم عمروں سے بچوں سے کیسے تعلقات رکھے جاتے ہیں یہ میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ جنہیں ہم پسند کرتے ہیں ان کے لئے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور جنہیں ہم پسند نہیں کرتے ان سے کیسے نبھایا جاتا ہے۔ یہ آرٹ بھی مجھے آتا ہے۔ دراصل یہ سب جاننا ہی زندگی کو صحیح طریقے سے جینا ہے۔ لائبریریوں میں، الماریوں، میز کرسیوں، کتابوں اور بند کمرے میں پرانے کھلونوں سے باتیں کرنے والا شخص ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔''

افسانہ ''چلو، اب مر جائیں'' میں حالات سے تنگ آ کر مجبوری کی حالت میں نرملا اور بلونت زندگی کی حقیقت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ''بنگلے کی ڈیوٹی میں'' دوہری زندگی جینے والے شخص کی کہانی ہے۔ صلیب پر ٹنگی عورت: میں یہ سچائی ہے کہ سماج

مردوں کا ہے۔ عورت معمولی سی لغزش کرے تو جواب طلب کرلیا جاتا ہے۔ شہلا کے ابوشکی شوہر ہیں۔ زمیندار، خر دماغ، اور جاہل۔ شہلا کی ماں وسوسے میں ساتھ نبھاتی ہے۔ شاید نہیں، میں گذری یادوں کی کسک ہے۔'' وہ آہستہ سے بدبدائی۔ تصویریں تو تم نے کھینچ لیں شاکر! لیکن چہروں پر کیا وہ مسکراہٹیں چپکا پاؤگے جو پھول کی خوشبو کی طرح اڑ گئی ہیں... شاید نہیں۔''

افسانہ، غلطی، میں کشور یہ اعتراف کرتا ہے کہ بچوں کے لئے ماں باپ اپنا چین آرام سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں مگر بچے ان کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ اسی طرح ''دو حصوں میں بٹا آدمی'' گڈ نیوز، دو کوڑی کی عورت'' نیا دور'' ''شارٹ کٹ'' ''بستی بستی کا جال'' ''نیا موڑ'' ''دھندے والی عورت'' ''ہلکے گہرے رنگ'' ''بدلی ہوئی لڑکی'' ''اپنی مٹی کی تلاش میں'' ''تیاگ'' ''ننگی ٹانگوں والی عورت'' ''لاوارث'' ''سہارے زندگی کے'' سوال کا جواب،'' گل چاندنی کا منڈوا'' ''وارث'' اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا میزان اور'' عورت'' جیسے افسانے کے موضوعات الگ الگ ہیں۔ بانو سرتاج بیانیہ اسلوب میں سیدھے سادے اور عام فہم زبان میں افسانے لکھتی ہیں۔

☆ **کتاب کا نام: ذکی احمد: شخصیت اور شاعری**، مصنف: ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق، قیمت: سو روپے، رابطہ: انجمن ترقی اردو ویشالی، ساجدہ منزل، باغ ملی، حاجی پور (بہار)، مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ذکی احمد ۳ر مارچ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے اور درس و تدریس سے ساری زندگی وابستہ رہے۔ ٹرپل ایم اے اور ڈیپ ان ایڈ ہیں۔ شاعری کا ذوق ۱۹۵۹ء میں جاگا۔ مہجور شمسی سے مشورۂ سخن کیا۔ غزلیں، نظمیں اور گیت لکھتے رہے۔ کتاب ''جھولا'' میں بچوں کے لئے نظمیں ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں یہ کتاب چھپی۔ ۲۰۰۲ء میں ''اپنا مرثیہ'' کے نام سے منظوم کتاب آئی۔ شعری مجموعہ ''سیل رواں'' ۲۰۰۶ء میں طبع ہوا۔ اور نرسری رائمس ''میٹھے گیت'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کی علمیت، شخصیت کی سادگی اور ادبی رجحانات و میلانات کی تفہیم کے لئے ویمنس کالج، حاجی پور کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق نے کئی سال کی محنت کے بعد یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ اس میں بالترتیب ممتاز احمد خاں، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، انوار الحسن وسطوی، سید مصباح الدین احمد، عبدالرافع، مشتاق شمسی، ارشد ترابی، مشتاق احمد مشتاق، شکیل احمد خاں اور عارف حسن واسطوی کے مضامین شامل ہیں جن سے ذکی احمد کی شخصیت، غزل گوئی، مرثیہ نگاری، نظم نگاری اور بچوں کی شاعری پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ منظوم خراج ہائے تحسین کے تحت ناصر زیدی، واحد نظیر اور عبدالغفور شمس کی نظمیں ہیں۔ حرف اول کے تحت پروفیسر ثوبان فاروقی نے چند سطور لکھے ہیں اور نذر الاسلام نظمی نے کچھ اس کتاب کے بارے میں دو صفحہ میں ذکی احمد کی شخصیت اور کارنامے کو اجاگر کیا ہے اور ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق کی محنت کی داد دی ہے۔ تین صفحے کے پیش لفظ میں مشتاق احمد مشتاق نے مضمون نگاروں کا شکریہ ادا کیا ہے اور بتایا ہے کہ ۱۹۹۱ء میں ذکی احمد صاحب سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ ان کی شخصیت کی جاذبیت اور کشش کے حصار میں آتے گئے۔ دیگر مضامین سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ذکی احمد ادبی و تعلیمی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ جہاں قادر الکلام شاعر ہیں وہیں مخلص، ملنسار، بااخلاق، نرم خو، نرم گو اور پاک طینت انسان ہیں۔ سادگی بے ساختگی، پرکاری اور شدت جذبات سے بھرپور شاعری کرنے والے ذکی احمد پر اس کتاب کے لئے ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆ کتاب کا نام: صدائے سروش، مصنف: صداء لآمری، قیمت: دو سو روپے، رابطہ: 7/17, Subramenia Garden Street, Triplicane , Chennai, 600005 مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

سید اسلم صداء لآمری تجارت پیشہ ہیں لیکن خاندان علمی اور صوفیانہ رہا ہے۔ سید محمد آمر کلیمی شاہ نوری چشتی قادری سے بیعت بھی ہیں۔ ابتدا میں ان کا رجحان نعت گوئی کی طرف رہا لیکن جلد ہی غزلیں اور قطعات بھی کہنے لگے۔ "صدائے سروش" میں یہ تمام اصناف موجود ہیں۔ اسلم صدا نے معنی متشکل کرنے اور الفاظ کی کلیت کی زندہ تمثال بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی غزلوں میں صورت حال تخلیق کاری کے عمل پر منتج نظر آتی ہے:

خدا کے فضل و کرم سے بنائے خود کا مکاں　　خوشی خوشی سے کرائے کے گھر سے ہم نکلے

تو میرا دوست ہے رگ رگ سے میری واقف ہے　　تو چکدار سہی میں ہوں بکنے والا

اتنی چنچل تھی شام کی ہنسی　　آج پنگھٹ پہ ناریاں نہ گئیں

اسلم صدا کی غزلوں میں معاشرتی اور انفرادی سطح پر ذات کا مسئلہ اہم رہا ہے وہ معاشرتی سطح پر گھٹن اور دباؤ کا احساس ضرور رکھتے ہیں لیکن بنیادی رویے کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں:

سعودی جاکے سبھی مالا مال ہونے لگے　　جو کھوٹے سکے یہاں تھے ریال ہونے لگے

ایم اے پی ایچ ڈی کی حاصل گھر پہ کرلی ڈگریاں　　امتحاں جاکر کہیں کب ہم نے اردو کا دیا

صدا اپنی نعت میں مانوس کیفیتوں کو پیدا کر کے معانی کی راہ ہموار کرتے ہیں اور عقیدت کے پھول بکھیرتے ہیں۔ قوت انجذاب کی انفرادیت ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے:

جہاں بھی دیکھوں کوئی آپ کے سوا نہ لگے　　عجب ہے پھر مجھے ہرکوئی آپ سا نہ لگے

جنت کی آرزو نہ تمنا ہے حور کی　　ہاں آرزو مدینے کی ہم نے ضرور کی

غزل اور نعت کا مزاج صدا نے وسیع تر تناظر میں متعین کرنے کی کاوش کی ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے قطعات میں جمالیاتی اور ارضیاتی زاویوں کو اجاگر کیا ہے:

الفت کا ثمر ساتھ ادھر بھی ہے ادھر بھی　　خوش راہ گذر ساتھ ادھر بھی ہے ادھر بھی
خوشبو کا سفر ساتھ ادھر بھی ہے ادھر ہے　　اک حسن دگر ساتھ ادھر بھی ہے ادھر بھی

اس مجموعہ میں بالترتیب پروفیسر سید صفی اللہ، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، انجینئر قادر ظہیر، راہی فدائی اور علیم صبا نویدی کے مضامین شامل ہیں، دیباچہ میں اسلم صدا نے اپنے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

☆ کتاب کا نام: اردو میں حمد و مناجات، مصنف: ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط، قیمت: ۵۲ اروپے، اشاعت: ۲۰۱۰ء، ناشر: انشا پبلی کیشنز، ذکریا اسٹریٹ کولکاتا۔ ۷۳، مبصر ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

حمد و مناجات موضوعاتی صنف شاعری ہے جو تقدیسی شاعری کے زمرہ میں آتی ہے۔ اس کا وجود ہر اس زبان و ادب میں ہے جن کے یہاں خدا کا تصور ہے۔ مولد اردو میں مسلمانوں کی آمد سے قبل کی تمام کاویہ رچناؤں میں بھجن، وندنا اور پرارتھنا کا وجود صدیوں سے ملتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی ہر زبان میں حمد و مناجات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ظاہر ہے اردو ہندلسانی

تہذیب کی دین ہے۔ لہٰذا تہذیبی اقدار سے انحراف کی لہر جب تک نہیں چلی تھی اس وقت تک اردو میں بھی اس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا لیکن تقدیسی شاعری کی حیثیت رکھنے کے سبب یہ صنفیں دیگر اصناف شاعری کی طرح باقاعدہ مشق سخن کا میدان بن سکیں نہ ہی تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ کا۔ زیر نظر کتاب تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ کے باب میں پہلی کاوش ہے جس میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے باقاعدہ حمدیہ شاعری کی تاریخ وارتقاء کا سراغ لگا کر اردو شاعری میں اس کے نقشہائے رنگارنگ کو اجالا ہے۔ اردو شاعری کی ابتداء سے بیسویں صدی تک کے شعری رویے پر عمیق نظر ڈالی ہے، دلچسپ تجربے پیش کئے اور معنی خیز نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس ضمن میں حمد ومناجات کی روح، شعراء کا رویہ اور اسلوب کو مصنف نے اس طرح آئینہ کیا ہے کہ عبارت سے نظر اور ہاتھ سے کتاب ختم ہونے تک چھٹتی ہی نہیں کہ علم کے نئے نئے دریچے وا ہوتے ہیں۔ معلومات کا سیل ہے جو ذہن کو بہائے لئے جاتا ہے۔

یہ پانچ مقالات: اردو میں حمدیہ شاعری: تاریخ وارتقاء،'' اردو کی حمدیہ شاعری میں فلسفیانہ رجحان، اردو کی متصوفانہ حمدیہ شاعری، قرآن کا اثر اردو کی حمدیہ شاعری پر، اور اردو کی مناجاتی شاعری، پر مشتمل کتاب مذہب، اور شاعری کے رشتہ کو اجاگر کرتی ہے۔ جملہ مقالات میں مابعد الطبیعات، فلسفہ، تصوف اور اخلاقیات کے رنگ جابجا اس طرح بہار دکھاتے ہیں کہ یہ موضوع مذہب ذہن کے جمالیاتی زاویوں کا بھی آئینہ دار بن گیا ہے۔ اردو حمد ومناجات کے موضوعاتی تنوع اور فکری پہلوؤں کا ہی محاکمہ نہیں بلکہ فنی ولسانی تجزیے عہد بہ عہد شعری اظہار واسلوب میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی پر لطف انداز میں کرتی یہ کتاب، بالآخر تشنہ چھوڑ جاتی ہے اور کئی گوشے کے مزید مطالعے پر اکساتی ہے۔

نئے راستہ پر ٹھوکر لوگ اکثر کھاتے ہیں، ڈاکٹر نشیط نے بھی بعض جگہ اختلاف کی گنجائش چھوڑی ہے۔ اس اعتبار سے بھی ڈاکٹر نشیط کے ذریعہ کھولا گیا یہ نیا باب اہل نقد ونظر کو ملتفت کرتا ہے۔ لہٰذا موضوع کی ندرت، مواد کا عمق وتنوع اور طباعت کی دیدہ زیبی اس کتاب کو دلکش بناتی ہے۔ ایسی عمدہ کاوش پر مصنف کو تہہ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ یہ پہلی کاوش خوب رنگ لائے تا کہ اس موضوع کو وسعت وتنوع بخشنے کا مصنف کو حوصلہ مل سکے۔

☆ کتاب کا نام: وقت کی چاک پر، مصنف: عارف خورشید، قیمت: ۲۷۵ روپے، اشاعت: ۲۰۱۰ء، ناشر: نوائے دکن پبلی کیشنز اورنگ آباد، دکن، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

کتاب کا ٹائٹل کور پلٹا تو نظر ٹھہری عارف خورشید کی اس عبارت پر کہ: ''میری کاوش کو کسی بند نقاد یا منصوبہ بند ناقد کے نظریہ سے دیکھنے کے بجائے اپنی نظر سے دیکھئے اور فیصلہ کیجئے۔ یاد رکھئے جرأت مندانہ سچ ہی زندہ رہتا ہے تحسین وتنقیص کسی شمار وقطار میں نہیں آتی۔'' یہ دعوت چیلنج بن گئی اور پھر جب نظر اس کے مشمولات کی تہہ در تہہ میں اتری تو عارف خورشید کے جرأت مندانہ اظہار سے زیادہ فنکارانہ اظہار کو وقت کی چاک پر کھرا پایا۔ اس کتاب میں چار افسانے پہلے نظر نواز ہوتے ہیں۔ پھر ایک تبصرہ جو مراٹھی اخبار کے صحافی سلیم احمد نے افسانوی مجموعہ ''اندھے سفر کا مسافر'' پر ہے۔ چار خاکے اور ۵۲ افسانچے نظر میں کھبتے ہیں۔

افسانچے پھول کی پنکھڑی پر پڑی اوس کی بوند کی طرح دھنک رنگ بکھیرتے نظر آتے۔ چند افسانوں میں جرات مندانہ سچ سے سرسراتے اور سر اٹھاتے تلذذ کو ادبی لطافت وجمالیاتی حظ میں تبدیل کرنے سے افسانہ نگار عاجز ہے۔ ہاں چند خاکوں میں جو رنگ بھرا ہے وہ فطری ہے۔ ان میں ذہن نامعلوم سے معلوم کا سفر عبرت کے موتی چنتا ہوا طے کرتا ہے اور ہمعصر ادباء شعراء کی خلوت کی سیر بھی کر لیتا ہے۔ عارف کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ جوان کے رشحات قلم کو پڑھنے کی کسک پیدا کرتا ہے مگر اس کی قیمت حوصلہ توڑتی ہے۔

☆کتاب کا نام: محبوبۂ امن، مصنف: مرزا ناصر حسین ناصر فیض آبادی، رابطہ: 451/45/1 نزد ڈیزائیوں کے راجہ، محلّہ جھاکر باغ، مفتی گنج لکھنو، اشاعت: ۲۰۰۶ء، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

زیرِ نظر کتاب آسّی صفحات میں مصنف کی زندگی کے کچھ عجیب و غریب واقعات و حادثات کو سمیٹتی خود نوشت ہے۔ مصنف کوئی منجھے ہوئے قلم کار و ادیب نہیں ہیں بلکہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنے لمحات و اوقات بہتوں کی طرح کسی اور کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے خود کو مستفید و مصروف رکھنے کی تڑپ نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ لہٰذا ذہن کے نہاں خانوں میں بجوئے بیتی زندگی کے حسرت و مسرت، نامرادی و کامرانی کا اجزائے پریشاں اور شیشۂ دل کی ٹوٹی کرچیوں کو نکال نکال کر موئے قلم سے صفحۂ قرطاس پر پرو رہے ہیں۔ اس کا مقصد مذہبی، ملکی و سیاسی اختلافات و منافرت کی شدت کو کم کرنے کی دعوت دیتا ہے جن سے یہ عنفوان شباب سے سبکدوشی ملازمت تک جوجھتے رہتے ہیں۔ یہ کتابچہ افسانہ ہے نہ ناولٹ بلکہ ایک مخلص اور سادہ لوح، انسان کے المیہ اور درد کی منتشر و رنگا رنگ داستان ہے جو بے ربطی کے باوجود دلچسپ ہے اور لمحۂ فکر یہ مہیا کرتا ہے۔ اس کنزیومرزم کے دور میں مفت خط پہنچانے اور لمحۂ فکریہ مہیا کرنے کی مصنف کی کاوش لائق تحسین ہے۔ اس لئے ان کے اس کتابی سلسلہ کو ہاتھوں ہاتھ لے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔

☆کتاب کا نام: سید سعادت علی خاں۔ شخصیت اور شاعری، مصنف: پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ، صفحات: ۲۳۴، قیمت: ۲۵۰ روپے، ناشر ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، مبصر: ڈاکٹر ایم صلاح الدین، دربھنگہ

سید سعادت علی خاں، حضرت داغ دہلوی کے 'نورتن داغ' میں شمار ہونے والے صاحب دیوان شاعر تھے۔ جن کا مسودہ ''دیوان سعادت'' اپریل ۱۹۰۷ء میں مطبع نول کشور لکھنو سے ''مرقع غالب'' کی طرز پر تقریباً ایک لاکھ روپے کے صرفے سے چھپا تھا کہ یہ پیغمبر پور اسٹیٹ ضلع مظفر پور کے آخری نواب تھے مگر ستارۂ بخت جب گردش میں آیا، سرزمین شہر دربھنگہ نے انہیں پناہ دی۔ یہ بوالعجبی، جناب طرزیؔ کے دامن تحقیق میں انہیں کھینچ لے گئی۔ نتیجہ میں زیر نظر تصنیف منصۂ شہود پر آئی۔

اس میں نہ صرف نواب سعادت کی زندگی، شخصیت اور شاعرانہ کمال کا اجالا گیا ہے بلکہ یہ پروفیسر طرزیؔ کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت کا ایسا عمدہ نمونہ ہے جسے دستاویزی حیثیت بھی حاصل ہے کیونکہ اس میں دربھنگہ اور پیغمبر پور کا ماضی، تاریخی و تہذیبی تناظر میں درخشاں ہے۔ چونکہ مصنف خود بھی اعلیٰ درجہ کا ذوق شعری بلکہ قوتِ تخلیقی و تنقیدی رکھتے ہیں، اس لئے کلام سعادت کو بڑی ژرف بینی سے آنکا اور پرکھا ہے۔ تقابلی جائزہ لیا ہے اور فن و فکر پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے سعادت کے شاعرانہ کمال کو اجاگر کیا ہے۔ یہ انداز نظر ریسرچ اسکالروں کے لئے قطب نما ہے۔

نواب سعادت علی خاں اپنے شاعرانہ کمال کے اعتبار سے اردو شاعری کی تاریخ میں تو جگہ پا ہی چکے تھے لیکن جناب طرزیؔ کا کمال یہ ہے کہ نواب صاحب کو ''طاق نسیاں'' سے نکال کر اس ریفرنس بک میں جاگزیں کر دیا ہے۔ کوئی شاعر کسی شاعر کو اس سے برتر خراج عقیدت اور کیا پیش کر سکتا ہے۔ اہل ذوق کو صورتاً اور قیمتاً بھی یہ لبھاتی ہے۔

☆کتاب کا نام: مقالات طرزی، مرتب: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، صفحات: ۱۲۰، قیمت: ۱۰۰ روپے، اشاعت: ۲۰۰۹ء، ناشر: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔۶، مبصر: ڈاکٹر ایم صلاح الدین، دربھنگہ

پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ تو تخلیق شعر کے میدان میں گنگا جمنا بہا ہی رہے ہیں، مگر بقول مرتب: تخلیقی برتری کا ہم خیال فنکار جب تنقید لکھتا ہے تو تخلیق کی عظمت اور حرمت کا ستارہ ماہ مبیں بن کر چمکتا ہے۔ طرزی صاحب نے ہمیشہ تخلیق کو

اولیت دی ہے اور اپنی تحریر میں اس کا خاص خیال رکھا ہے۔'' (عرض مرتب)

جناب طرزی کے اسی وصف کو اجالنے کے لئے ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے یہ کتاب مرتب کرڈالی ہے۔ پیشانی کتب پر تابندہ عنوان سے گمان ہوتا ہے کہ یہ حسب رواج یہ مبسوط تنقیدی مقالات پر مبنی کتاب ہوگی مگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ گا ہے بگا ہے رسائل رجرائد کو بھیجے گئے آٹھ تنقیدی تاثر پارے، ایک انٹرویو بعنوان 'مصاحبہ' اور ایک سوانحی مضمون پر یہ مشتمل ہے۔ جناب طرزی کی تنقیدی بصیرت تو جامہائے شعری میں دو آتشہ ہورہی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی مگر نثر پارے کا ظہور ان کے یہاں معدوم ہوتا تو زبان اردو پر عالمانہ تصرف واقتدار کا ثبات نہیں ٹھہرتا، یہ کتاب اسی کا مظہر ہے۔

اس کے مشمولات میں مضامین ''غالب اور جدیدیت'' مظہر امام کا لہجہ، انور شیخ کے دو تمثیلیے کا تنقیدی جائزہ، اسلوب اور نقطۂ نظر ہر دو اعتبار سے منفرد ہیں اور مناظر عاشق ہرگانوی کے ساتھ ''مصاحبہ'' میں پیش کئے گئے انداز نقد کا کامل اثبات کرتے ہیں۔ بقیہ مضامین پر بھی مرتب کا خیال بحسن وخوبی منطبق ہوتا نظر آتا ہے۔ البتہ سوانحی نثر پارہ ''میرے ابو جان'' میرے نزدیک خاصے کی چیز ہے کہ اس میں اول تو سوانح نگاری اور انشاپردازی کے ثقہ رنگ جلوہ گر ہیں دوسرے حق فرزندی کی ادائیگی کے بین السطور فرزند کو ارجمند بنانے کی کاوش نمایاں ہے جو آج کی نسل کے لئے نمونۂ عبرت ہے۔ مرتب کی وارفتگی قابل قدر ہے اور اوصاف طرزی کو اجالنے کی یہ کاوش قابل تبریک۔

☆ **کتاب کا نام: مختصر معلومات**، مصنف: ڈاکٹر عبرت بہرائچی، قیمت: ۱۵۰ روپے، اشاعت: ۲۰۰۹ء، رابطہ: ناظر پور، بہرائچ، ۲۷۱۸۰۱، مبصر: ڈاکٹر ایم صلاح الدین، دربھنگہ

ڈاکٹر عبرت بہرائچی زود گو شاعر اور زود نویس نثار ہیں۔ جس طرح یہ الگ الگ صنف کے لئے اپنے شعری مجموعوں کو مختص کیا کرتے ہیں اسی طرح یہ وقت کے تقاضے کے مطابق تقریباً ہر سطح کے لوگوں کے لئے ادبیات سے لے کر اسلامیات تک اردو دانوں کے علم اور معلومات میں وسعت وتنوع عطا کرنے کے لئے چھوٹی بڑی ۳۲ کتابیں لکھ ڈالی ہیں جو ان کی منفرد سوچ کا نتیجہ ہیں۔

زیر تذکرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جس میں انہوں نے بھارت کے آئینے سے، دنیا سے متعلق ایجادات و تجربات اور مشاہدات، کھیل کے میدان سے دنیا کے اہم ترین واقعات کے عنوانات کے تحت مکالماتی انداز میں ڈھیر ساری جانکاری و معلومات عامہ جمع کر دی ہیں۔ یہ بچوں کے Quiz کے لئے تو معاون ہے ہی، سیانوں کو بھی چونکانے والی معلومات فراہم کرتی ہے مثلاً سب سے لمبی زبان والا کون سا جانور گونگا ہے؟ بندوق کس مسلمان کی ایجاد ہے؟ نر مچھر کاٹتا ہے یا مادہ؟ وغیرہ اب تو بچے ہوم ورک میں گارجین کو ہی پریشان کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کے ساتھ ایسے لوگوں کی الجھنیں بھی ڈاکٹر عبرت بہرائچی کے پیش نظر رہی اور انہوں نے معلومات کا خزانہ انتہائی عرق ریزی سے سستے میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ہے سو ان کے جذبے کی قدر ضرور کی جانی چاہئے۔

☆ **کتاب کا نام: کلام راہی اور صنائع وبدائع**، مصنف: محمد ادریس رضوی، قیمت: ۱۵۰ روپے، اشاعت: ۲۰۰۹ء، ناشر: سنی جامع مسجد، پتری پل، کلیان ۴۲۱۳۰۶، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

غلام مرتضی راہی نے متعدد مجموعہ ہائے کلام کے ذریعہ اردو شاعری میں ایک خاص مقام بنالیا ہے۔ ان کی انفرادیت اجاگر کرنے کے لئے محمد ادریس رضوی نے ایک منفرد انداز کی کتاب لکھ ڈالی ہے۔ شاعری تو دراصل علم العروض اور علم البدیع وبیان ہی کی میزان پر تلتی ہے مگر ان پر دسترس رکھنے والے فی زمانہ ہیں ہی کتنے لوگ؟ ایسے میں ادریس رضوی کی یہ کتاب

چونکانے والی ہے۔رضوی صاحب نے کلام راہی کو علم بدیع کی کسوٹی پر رکھ کر اس طرح انفرادیت کو اجاگر کیا ہے کہ شاعر کی ہنر مندی سے زیادہ شاعر کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ انکا غالب کی طرح انہیں بھی عبدالرحمٰن بجنوری مل گیا ہے۔

علم بدیع وبیان پر کما حقہ دسترس رکھنے والے اور صنائع وبدائع کا التزام کرنے والے شعراء ہی فی زمانہ نادر الوجود ہیں تو اس علم کا ذوق رکھنے والے کا کیا پوچھنا! لیکن اس کتاب کے مطالعہ کے بعد کمالات راہی اور رضوی صاحب کے تبحر علمی اور شاعرانہ ذوق سلیم کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اس میں رضوی نے بالتفصیل صنائع وبدائع کی تعریف متعدد حوالے سے کی ہے اور ان تعریفات کی روشنی میں اشعار میں چھپے صنائع وبدائع کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ اشعار کی تفہیم کی ہے۔ متعدد جگہ تقطیع کی ہے اور اکثر جگہ پر صنعتوں کے برتاؤ میں اساتذہ فن سے تقابل بھی کیا ہے۔اسے پڑھ کر راہی کی شاعری پر بالاستیعاب نظر ڈالنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اس نوعیت کی غالباً پہلی باضابطہ کتاب نظر آتی ہے جو نہ صرف راہی شناسی کے دروازے کھولتی ہے بلکہ طلبہ کے لئے بھی علم بدیع وبیان کے سمجھنے کے وافر مواد فراہم کرتی ہے۔ کیونکہ طلبہ کو عموماً دستیاب علم البلاغت کی کتابوں میں اتنی صراحت کے ساتھ اردو اشعار کے امثال نہیں ملتے۔ لہٰذا جناب رضوی کی یہ مستحسن کاوش بہر صورت لائق پذیرائی ہے۔

☆ **کتاب کا نام: اسلم جمشید پوری بحیثیت افسانہ نگار: ایک جائزہ**، مصنف: تسنیم فاطمہ امروہوی، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: سید زبیر عباس نقوی، ہمالیہ ہینڈلوم ہاؤس، محلہ مجاہوگا، امروہہ، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

تسنیم فاطمہ ''تمثیل نو'' کے ذریعہ تحریر آشنا ہیں۔ ان کے تنقیدی شعور کی کارفرمائیاں سیمیناروں سے رسائل تک پھیلی ہوئی ہیں تو فنکارانہ اظہار کے نمونے بھی رسائل سے لیکر الکٹرانک میڈیا پر نمایاں رہے ہیں۔ جب کسی فنکار کا قلم کسی کے فنکارانہ کاوشوں کے اعتراف کے لئے جنبش میں آتا ہے تو اس کے لئے فنی کسوٹی سے صرف نظر کرتے ہوئے گذرنا محال ہوتا ہے۔ تسنیم فاطمہ خود بھی افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے ان کا قلم یہاں روش مدح پر سرپٹ نہیں دوڑا ہے۔ یہ زیر نظر کتاب کی پہلی خصوصیت ہے۔

اکثر اس نوعیت کی تصنیفات میں لوگ حیات وخدمات کو اجاگر کیا کرتے ہیں لیکن یہ کتاب اس روش سے قدرے الگ ہے کہ بقول مصنفہ: ''میں کسی ادیب کی تخلیق کو نیا موڑ دینے کے لئے اس پر کام کرنے کی ضرورت کو اہمیت دیتی ہوں۔'' لہٰذا اسلم جمشید پوری کی افسانہ نگاری کے جائزے میں یہ اپنی ناقدانہ بصیرت کو اپنے موقف کے تحت بروئے کار لانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

اس کتاب میں پہلے اسلم جمشید پوری سے متعارف کراتے ہوئے یہ بتایا کہ موصوف افسانہ نگار، ناقد، صحافی، معلم اور عمدہ منتظم بھی ہیں۔ بعد ازاں ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''افق کی مسکراہٹ'' مطبوعہ ۱۹۹۷ء اور دوسرا مجموعہ ''لینڈرا'' مطبوعہ ۲۰۰۹ء کا تجزیہ کرکے اسلم کے افسانہ نگاری کی انفرادیت اجاگر کی ہے اور اس کی روشنی میں منتخب چھ افسانے اور چار افسانچے پیش کرکے قاری کو تجزیے کی پرکھ کا بھی موقع دیا ہے۔

اسلم جمشید پوری تین دہائیوں سے افسانہ نگاری کررہے ہیں اور اس میدان میں اپنی شناخت قائم کرچکے ہیں۔ اس لئے ان کا ایک انٹرویو بھی پیش کرکے فن افسانہ نگاری، افسانہ نگاری کی موجودہ روش اور اسلوب پر ان کے موقف کو ان ہی کی زبانی قارئین کے سامنے کردیا ہے جو اسلم اور ان کے فن کو سمجھنے میں خاصا معاون ہے۔ اس طور یہ کتاب نہ صرف اسلم شناسی کی راہ کا ایک سنگ میل ہے بلکہ اس نوعیت کی منظر عام پر آرہی کتابوں کی بھیڑ میں جاذب نظر اور قابل مطالعہ بھی ہے۔ دعا ہے کہ ہو مصنفہ کا زور قلم اور زیادہ۔

☆ **کتاب کا نام: ادب اسطور اور آفاق**، مصنف: شیخ عقیل احمد، ص: ۳۳۶، قیمت: ۱۵۰ روپے، ناشر: D-262 شیر انس سیٹی، اندر پورم، غازی آباد۔ 201014، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

''ادب اسطور اور آفاق'' باعتبار موضوع دامن دل کھینچتا ہے کہ ادب عالیہ کی آفاقیت اساطیری عناصر ہی کی مرہون منت رہی ہے۔ اسطوری لفظیات یعنی تلمیحات واستعارات، علامات، تمثیلات گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتے ہیں۔ ان کے استعمال سے شعر میں یا فنون لطیفہ میں معنوی ابعاد پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر زبان میں اساطیری فکر پر استوار ادب نے ہمیشہ کلاسیکی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ گرچہ ایسا ادب ذہن کو توانائی نہیں عطا کرتا لیکن انسانی اقدارِ حیات کو اس سے تقویت ملتی ہے۔ خیالات کی تطہیر ہوتی ہے اور قلب وروح کو تسکین ملتی ہے۔ اس لئے ایسے ادب کی اساس بڑی مضبوط اور اس کی قدریں نہایت مستحکم و وسیع ہوتی ہیں۔ بنابریں اس پر کی گئی گفتگو مرکز توجہ بن جاتی ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی کئی تصنیفات آچکی ہیں لیکن زیر نظر تصنیف میں شیخ عقیل احمد نے ایک نئے انداز سے گفتگو کی ہے۔

البتہ پوری کتاب اسی موضوع کو محیط نہیں ہے بلکہ یہ عقیل احمد کے سترہ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے سات مضامین ''اقبال اور کالیداس کی شاعری میں فطرت کی منظر کشی، سماجی ہم آہنگی اور صوفیانہ افکار، نظمیہ شاعری میں سورج کا اسطوری کردار، سائنسی اور صوفیانہ فکریات کا شاعر: صبا اکبرآبادی، شہاب جعفری: سرِ آدمیت کا رمز شناس، شہاب جعفری کی شاعری میں سورج کا علامتی اور اسطوری اظہار، شموئل احمد کے افسانوں میں علم نجوم کی معنویت میں اساطیری افکار موضوع گفتگو بنے ہیں مگر یہ گفتگو سائنسی نقاط نظر اور ادب عالیہ کے مشاہیر مفکرین کے حوالے سے ہوئی ہے جو خاصی دلچسپ ہے اور ذہن وفکر کو مہمیز کرتی ہے۔ بقیہ دس مضامین: ''ٹیگور کا فلسفہ زندگی، جدید نظم میں ہیت کے تجربے، تہذیب جنون اور مغیث الدین فریدی، آئینہ عکس سخن میں (فریدی کے حوالے سے)، مغیث الدین فریدی کی تضمین نگاری، خوش نوصبا خوش ادا فریدی، پریم چند کی نئی تفہیم اور شکیل الرحمٰن کا تنقیدی رویہ، عاشور کاظمی اور مرثیے کا تجدیدی سفر، نصرت ظہیر: مزاحیہ کالم نگار اور کیا ادب کے بغیر ہم زندہ رہ سکتے ہیں'' میں بھی انداز نقد ونظر تنقیدی کتابوں کے ریلے میں نظر نواز ہونے والی کتابوں سے بدلا بدلا سا ہے۔ اسلوب تفہیمی اور نقد میں توازن ہے۔ مصنف تصویر سے جواں سال لگتے ہیں مگر فکر میں بالیدگی نمایاں ہے۔ البتہ تمام شمولات کے مطالعے سے قاری جو توقع مصنف سے قائم کر لیتا ہے اس پر مضمون: پریم چند کی نئی فہیم اور شکیل الرحمٰن کا تنقیدی رویہ پورا نہیں اترتا ہے۔ کیونکہ اس میں انہوں نے شکیل الرحمٰن کے تنقیدی رویہ پر ناقدانہ نظر ڈال کر صرف ان کے نظریے کی تصریح کی ہے۔

تاہم شائقین ادب جو مسلسل یک رنگی تنقیدی تحریروں سے اوب چکے ہیں ان کے لئے یہ باعث تسکین اور طلبا کے لئے قابل استفادہ ہے۔ قیمتاً بھی سستی ہے۔ ایسی عمدہ تصنیف قابل پذیرائی اور مصنف لائق تحسین ہے۔

☆ کتاب کا نام: **الفاظ کی دنیا (لسانی کھیل)**، مصنفہ: ڈاکٹر حلیمہ فردوس، قیمت: ۹۰ روپے، اشاعت: ۲۰۰۷ء، ناشر: حمید الماس میموریل ٹرسٹ بنگلور، مبصر: ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین، دربھنگہ

میدان تدریس میں کنڈرگارٹن اور کانونٹ کلچر کے جواز سے قبل بھی بچوں میں لسانی، ادبی تربیت وذوق ابھارنے اور معلومات عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے مکتبوں میں کئی قسم کے کھیل کھلائے جاتے تھے۔ مثلاً حرفوں کو جوڑنے، درست املا کے ساتھ یکے بعد دیگرے بولے گئے لفظ کے آخری حرف سے شروع ہونے والا لفظ وقت مقرر پر بولنے اور بیت بازی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ خارجی اوقات میں تعلیمی تاش کھیلنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ جس سے ثانوی سطح تک جاتے جاتے بچوں کی تحریر میں پختگی، املا کی درستگی، الفاظ شناسی اور شعری مذاق ستھرا ہو جایا کرتا تھا۔ اب کوئز اور الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ معلومات عامہ میں اضافے پر زور ہے۔ جس کے نتیجہ میں آج کسی بھی زبان میں بچوں کی املا ہی درست نہیں، ذہانت اور الفاظ شناسی موضوع شناسی اور شعری

مذاق کا معاملہ تو کوسوں دور پیچھے رہ گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب پرانی روایت کو جدید رنگ میں دلچسپ بنا کر پیش کرنے کی عمدہ کاوش ہے۔

اب بچوں کو کتابی بوجھ اور کلاس ورک، ہوم ورک کی پابندی اسقدر ہے کہ خارجی اوقات میں مطالعے سے عموماً بچے بیزار ہوتے ہیں۔ اس بیزاری کو دور کرنے کے لئے الکٹرانک میڈیا کئی طرح کھیل تماشے سے تعلیمی و تربیتی پروگرامس کرتی ہے مگر بقول مصنفہ ڈاکٹر حلیمہ فردوس اردو زبان میں الکٹرانک میڈیا کوریج سے عموماً باہر ہے۔ اس لئے مصنفہ نے یہ کتاب اس طرح ترتیب دی ہے کہ کتابی شکل میں بچوں کی دلچسپی بڑھائے اور الکٹرانک
میڈیا چاہے تو اسے بخوبی استعمال کرسکتے ہیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر حلیمہ نے ۷۸ عنوانات کے تحت املا کی درستگی، الفاظ شناسی، موضوع شناسی، محاورہ شناسی، شعر فہمی، معلومات عامہ اور روایت شناسی پر مبنی متنوع موضوعات اور منہاج و انداز سے بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مختلف طرح کے کھیل ڈسک وضع کئے ہیں اور بتدریج بچوں کی ذہنی سطح کی رعایت کرتے ہوئے موضوع اور کھیل کی ترتیب بنائی ہے تاکہ کلاس اور ہوم ورکس سے بچے اوقات سے بہترین مصرف لینے پر بچے مائل ہوسکیں۔ مگر اس ضمن میں یہ ایک کتاب کافی نہیں ہے بلکہ اس طرح کی کتابی سلسلوں کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ ایک کتاب کے ذریعہ اردو والوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ ہمدردان اردو کو اس پر توجہ دینی چاہئے اور اس کتابی سلسلہ کی قیمت کم ہونی چاہئے تاکہ بچوں کے ذوق وشوق کو ٹھیس نہ لگے۔ بہرحال اس کتاب کا یقیناً افادی پہلو مسلم ہے اس کی پذیرائی ہونی ہی چاہئے۔

☆ **نام کتاب: نیپال میں اردو زبان و ادب (تحقیق)** مصنف: ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، اشاعت: ۲۰۰۸ء، قیمت: ۱۱۰ روپے، رابطہ: کتاب منزل، جنگی مسجد، بتیا، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

نیپال میں اردو زبان وادب ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی ایک تحقیقی کاوش ہے اور اس میں شک نہیں کہ نیپال کی سرحد میں جانے کے لئے کسی پاسپورٹ یا پرمٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندوستانیوں کا آنا جانا کاروبار کرنا وہاں کے لوگوں سے رابطہ رکھنا ایک عام سی بات ہے۔ نیپالی زبان ہی کی طرح اردو ترائی علاقہ وادی اور پہاڑوں میں اپنی نغمگی کے ساتھ گنگنائی جاتی ہے۔ اردو سمجھنے والے اور بولنے والوں کی کثیر تعداد بھی وہاں موجود ہے۔ گرچہ زمانہ قدیم تک اس کو ایک ہندو ملک کی حیثیت سے جانا جاتا رہا۔ لیکن وہاں مدارس اور مذہبی ادارے کھولنے میں سرکاری سطح پر زیادہ دشواری نہیں ہے۔ خود عرصہ دراز سے نیپال کی حکومت نے ایک مذہبی شعبہ کے لئے مسلم عالم برائے مشورہ رکھا۔ جس کے نتیجہ میں ہجرت کر کے نیپال میں سکونت پذیر ہونے والے ہندوستانی اردو داں چاہے وہ واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل ہوں یا تجارتی قافلے کے لوگ یا ہندوستانی راجاؤں کے معتوب اہل کار یا تغلقی زمانہ کے آئے ہوئے سیاح و دیگر عہدہ داران اس بات کے گواہ ہیں کہ نیپال میں حکمراں طبقہ کے ساتھ وہ تمام لوگ بھی گئے جو مغلوں کی زبان جانتے تھے اور فارسی عربی کے الفاظ ان کے ذریعہ نیپالی زبان میں شامل ہوگئے۔ اس لئے اردو کا نیپال میں داخلہ غیر شعوری طور پر ہوتا رہا ساتھ ہی یہاں کے اخبار ورسائل میں چھپنے والے نیپالی افراد بھی اردو کی خدمت کرتے رہے نیز فلمی گیتوں کو بھی نیپالیوں نے اپنے سینوں میں بسایا، لبوں پہ سجایا، محفلوں اور جلسوں میں گنگنایا۔ اس لئے نیپال کے ترائی علاقے اور ہندوستان سے ملحق سرحدوں پر اردو زبان کا چلن عام ہے۔ کاٹھمنڈو اور دیگر علاقوں میں لوگ اردو بولنا پسند کرتے ہیں۔ نسیم احمد نسیم نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں نیپال میں سکوں پر بھی اردو کندہ تھا۔ دستاویزات اور دیگر سرکاری زبان وغیرہ میں اردو رسم الخط میں دستخط کرنے کا چلن عام تھا۔

نیپال میں اردو زبان و ادب نسیم احمد نسیم کی ایک کامیاب تحقیقی پیش کش ہے اور ۲۰۰ ملکوں میں جہاں اردو کا چلن عام ہوا یا مراکز کھولے گئے وہاں نیپال میں بھی اردو بیگانہ نہ رہی اس طرح اچھی خاصی مقبولیت نیپال میں ملی۔ یہ سچ ہے کہ نیپال کے علاقہ میں اردو کی جڑیں موجود ہیں لیکن اس سے بے اعتنائی برتی گئی۔ نسیم احمد نسیم نے اس کتاب کو منظر عام پر لا کر نیپال کی سرحدوں کو پار کر کے اردو نے کیا مقام بنایا اس پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک تاریخی اہمیت کی کتاب ہے اور ادب کے لئے سنگ میل ہے۔

☆نام کتاب: ڈوبتی شام، مصنف: سید احمد شمیم، اشاعت: ۲۰۰۹ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، رابطہ: بیت الشرف، پروفیسرز کالونی نزد جے کے ایس کالج، آزاد نگر جمشید پور۔ ۸۳۲۱۱۰ (جھارکھنڈ) مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

سید احمد شمیم کا شعری مجموعہ "ڈوبتی شام" رنگوں کے اعتبار سے ڈوبتے ہوئے سورج کے وقت جو رنگ آسمان پر بکھرا رہتا ہے کم و بیش اسی رنگ کا سرورق اس مجموعہ کا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ڈسٹ کاور پر سید احمد شمیم کی شاعری پر یوں رقم طراز ہیں:

"..... ان کا رجحان انفرادیت پسندی کی طرف رہا ہے۔ دنیا کو انہوں نے اجنبی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اس اجتماعی آنکھ سے نہیں جو ترقی پسند بوطیقا نے اپنے ہر مقلد کی فطری آنکھ پر چڑھا رکھی تھی۔"

پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے: "سید احمد شمیم کی نظمیں ہوں یا غزلیں، دونوں ہی ایسے تحیر زا مناظر پیش کرتے ہیں... اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شمیم عشق و عاشقی کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ اگر یہ خیال درست بھی ہے تو انہیں حیرت زدہ عاشق کہئے۔ جس کی عشقیہ شاعری جسم و جان سے پرے ہٹ کر کائنات کی پیچیدگی اور اس کے عوامل کے حیرت زا پہلوؤں سے والہانہ وابستگی کا کیف پیدا کر رہی ہے۔"

سید احمد شمیم نے مجموعہ کے آخری صفحہ پر ایک مختصر سی نظم "جستجو" لکھی ہے جو ان کی ذات کی خود تلاش کا پتہ دیتی ہے اور کتاب کے ڈسٹ کاور جہاں ان کی تصویر ہے اس کے نیچے یہ شعر خود ان کی شاعری کی پہچان کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے:

کرے گا کون یہ ساون قبول میرے سوا　　پگھلتی رہتی ہیں ہر لمحہ دل کی دیواریں

اسلم بدر نے اس مجموعہ پر پیش لفظ بعنوان "اپنی آنچ میں پگھلتا شاعر" میں کچھ اس کتاب کی ترتیب کے بارے میں لکھا ہے: "..... سید احمد شمیم کی بے نیازی مسلم ہے، بقول شمس الرحمٰن فاروقی نہ صرف آپ بے نیاز ہیں بلکہ شہرت سے گریز پائی بھی ان کا ایک وصف ہے....."

شاعر اپنے ذوق کی تسکین کے لیے شاعری کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسے وہ شائع ہی کرے۔ اگر وقت اور حالات نے اسے موقع دے دیا یا کسی طور پر اس کا مجموعہ سامنے آ گیا تو اس کے اندر چھپے ہوئے جوہر نکھر جاتے ہیں اور لوگ ان کی شاعرانہ عظمت سے واقف ہو جاتے ہیں کیونکہ مشاعرہ کا شاعر وقتی چھاپ چھوڑتا ہے لیکن جو شاعر اہل مجموعہ ہوتا ہے اس کی شاعری پر لوگوں کی نظر ہوتی ہے اور اسے گہرائی سے لوگ پڑھتے ہیں۔ سید احمد شمیم کی شاعری کو میں نے اسی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سچائیوں کو سمجھنے کا عمل ایک عمر کے بعد آتا ہے لیکن اس کے بعد بھی انسان خواب دیکھنا بند نہیں کرتا۔ یہ انسانی فطرت ہے اور اس خواب سے انسان وقتی طور پر سکون بھی پا لیتا ہے۔ سید احمد شمیم نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے۔

آرزوؤں کے شجر دھوپ میں جل جائیں گے　　اپنے خوابوں کے دریچے سے نہ باہر جھانکو

تنہائیوں کو آج گلے سے لگایئے　　لوگوں نے ساتھ چھوڑ دیا وقت کی طرح

ان کے بیشتر اشعار رومانی پیکر میں ڈھلے ہوئے ہیں لیکن وقت اور حالات کی سچائیوں کے ساتھ ان کا رشتہ نہیں ٹوٹتا:

آگہی کر گئی بہت گمراہ — کام آئی تو عاشقی آئی
ہجوم عاشقاں میں مجھ پہ ٹھہری — تیری تلوار، سر پہچانتی ہے
تمہیں میں بھولتا رہتا ہوں لیکن کیوں نہیں بھولا — نگاہ و دل کا رشتہ جان من توڑا نہیں جاتا
غیر تو غیر ہیں، تم نے بھی ستم کم نہ کئے — اب گلہ کیسے کریں ہم کسی بیگانہ کا

سید احمد شمیم کی نظمیں گفتگو بے صدا، آنگن کا درد، قصہ پہلی بھول کا، میں وہ نہیں، اللہ بھی چپ، چہرہ، سوال، جستجو وغیرہ کافی موثر ہیں۔

سید احمد شمیم ایک باکمال شاعر ہیں۔ مثبت سوچ رکھتے ہیں۔ گداز دل کے ساتھ وقت اور حالات کی تبدیلی کو بھی محسوس کر کے شعری جمالیات کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شاعری بہت ہی سادگی مگر گہرے اثر کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ کسی بھی مکتبہ فکر کی وکالت اپنی شاعری میں نہیں کرتے۔ نظموں میں کمال کی مربوطیت ہے۔ کتاب بیحد خوبصورت شائع ہوئی ہے۔

☆ **کتاب کا نام: تاریخ پارے**، مولف: مشتاق اعظمی، اشاعت: اول ۲۰۰۳ء، دوم ۲۰۰۴ء، قیمت: ۱۰۰ روپے، ناشر: اثبات ونفی پبلیکیشنز، شبلی ہاؤس، 89/5 رپن اسٹریٹ، کولکاتہ۔ ۷۰۰۰۱۶، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

مشتاق اعظمی نے "تاریخ پارے" بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ منظر عام پر لایا ہے۔ مظفر حنفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "... پچھلے دنوں موصوف کے افسانوں کا مجموعہ آدھا آدمی ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو رہا ہے۔ ہنوز مغربی بنگال کی ادبی فضا میں اس کی بازگشت برقرار ہے کہ ان کی ایک اور کتاب "تاریخ پارے" منظر عام پر آرہی ہے۔"

مشتاق اعظمی نے ایک بڑا کام کیا ہے کیونکہ بچوں کے ادب پر اس صدی میں بہت کم کام ہوا ہے۔ بچوں کی نظمیں، بچوں کی کہانیوں کی بھاری کمی ہے۔ زبان کی بقا کے لئے بچوں کے ادب کا موجود رہنا ضروری ہے۔ بچوں کے ادب سے یکسر نظر انداز کرنا اچھی بات نہیں ایک زندہ زبان کی حیثیت سے اردو میں اس سے گریز کرنے کی کوشش بہت افسوس ناک ہے۔

چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں تاریخی واقعات کو کہانوی رنگ میں پرونے کا کام اسے دلچسپ بنانے کا کام اور چھوٹے ذہن میں ایک نقش بنانے کا کام کوئی آسان نہیں ہے۔ یہ ایک ماہر نفسیات ہی کا کام ہے۔ مشتاق اعظمی نے اس حیثیت سے تاریخی حقائق کو کہانی کا پیرہن پہنا کر جس انداز سے پیش کیا ہے وہ بچوں کے لئے معلومات کا ذخیرہ بھی فراہم کرتا ہے ان کی دلچسپی میں اضافہ بھی کرتا ہے اور ان کو نئی جہتوں سے واقف بھی کراتا ہے۔ ان کے تخیل کو پر لگانے کا کام بھی انہوں نے کیا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ہے لیکن اپنے اندر جہان معنی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر عابد ضمیر نے لکھا ہے: "تاریخ پارے بھی پڑھنے والے پر سنجیدگی ظاہر کرتے ہیں کہیں زیر لب تبسم پر آمادہ کرتے ہیں اور کہیں قہقہہ خیزی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ قوی امید ہے کہ مشتاق اعظمی کی یہ کتاب تاریخ پارے بہ لحاظ کھلونا آٹھ سے ۸۰ سال کے بچوں کے ہر حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ یہ ایک گرانقدر کام ہے اور اسے ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

☆ **کتاب کا نام: ہندوستان کے تحفظاتی مقامات اور حیاتیاتی تنوع**، مصنف: پروفیسر حافظ شائق احمد یحیٰ، آشیانہ ۹/۳۱، ڈگی روڈ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲، اشاعت: ۲۰۰۹ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

پروفیسر حافظ شائق احمد یحیٰ کا دربھنگہ کے نظر احمد آباد سے تعلق ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر سالم علی کی زیر نگرانی ڈاکٹریٹ

کی ہے۔ سالم علی خود دنیا کے ماہر ایکولوجسٹ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پرندوں کے نقل وحرکت، موسم کی تبدیلی کے اثرات اور ان کی ضرورتوں اور تحفظات کے لئے سالم علی دنیا بھر میں ماہر پرند کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سالم علی سے جو فیض شائق احمد یحییٰ نے حاصل کیا اسے اردو دنیا سے روشناس کرانے کی کوشش بصورت ایک اہم کتاب ''ہندوستان کے تحفظاتی مقامات اور حیاتیاتی تنوع'' منظر عام پر لایا ہے۔ یہ بہت ہی معلوماتی ہے اور مشہور شکاری Jim Corbet نے اپنے تجربات ہندوستان کے جنگلوں اور سنکچوریوں کے متعلق پیش کر کے اہم معلومات دستاویزی شکل میں عہد برطانیہ میں ہی شائع کر دیا تھا۔ اس سے بھی ہندوستان کے بڑے چھوٹے جنگلوں اور سنکچوریوں کو Spot کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بیشتر لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہمارے یہاں کتنے جنگلات ہیں۔ جانوروں کی کتنی قسمیں ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں کون سے حیوانات اب ناپید ہونے والے ہیں۔ کتنے پرندے ہر سال غیر ممالک سے آکر ہندوستانی علاقہ میں پناہ گزیں ہوتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں قدرتی طور پر وقت کے تقاضے اور حالات کے مطابق عمل پذیر ہوتی رہتی ہیں لیکن ہم اس سے واقف کم ہوتے ہیں۔

نیشنل جغرافیکل اور ڈسکوری چینل ان ساری باتوں کا ذکر جستہ جستہ تصویروں اور رننگ کمنٹری کے ذریعہ کرتی رہتی ہیں۔ ہم حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور بہت ہی نایاب اطلاعات ہمیں حاصل ہوتی ہیں۔

علم کی وسعت سے انوائرمنٹ اور اکولوجی جیسے شعبہ جات میں کام ہوئے اور ہندوستان میں بھی بڑے پیمانے پر سروے اور تحقیق کا کام ہوتا رہا لیکن ایسی بات صرف عہد جدید کا کارنامہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں مختلف نسلی طور پر اس پیشے سے جڑے ہوئے لوگ میر شکار وغیرہ نے اس طرح کے معلومات حاصل کر کے بہت کچھ سیکھا اور جانا۔ یہ الگ کی بات ہے کہ یہ علم مختص سینہ بہ سینہ یا نسل در نسل منتقل ہوتی رہی لیکن ان کی معلومات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بیگوسرائے کا شخص جو نسلی اعتبار سے میر شکار ہے اور سالم علی کی دریافت ہے جو تقریباً ناخواندہ ہے لیکن وہ پرندوں کی آواز ان کی بول چال کی زبان ان کے دکھ درد کی باتیں کون پرندہ کس مقام کا ہے اکی پہچان پر اسے مہارت حاصل ہے اور دنیا بھر کے لوگ اس شخص کو مختلف مقامات پر لے جاتے ہیں اور اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔

پروفیسر شائق احمد یحییٰ کی یہ کتاب اردو کے لئے ایک گرانقدر سرمایہ ہے کیوں کہ پرندوں پر اور جنگلات پر تفصیلی معلومات عام طور پر لوگوں کو دستیاب نہیں۔ انہوں نے اس طرح کے ایک اہم کارنامے کو انجام دے کر قدرتی وسائل، حیوانات اور نباتات کے علاقوں میں جو کام ہو رہے ہیں اس سے واقف کرایا ہے۔ انہوں نے عام آدمی کے لئے بھی جو سیر وسیاحت کی غرض سے ان جنگلوں اور سنکچوریوں میں جانا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی مفید مشورہ دیئے ہیں۔ یہ ایک نادر و گرانقدر کتاب ہے۔ ایسی کتاب اردو میں موجود نہیں۔ سفرناموں کے ذریعہ کچھ معلومات تحریری طور پر موجود تھے۔

☆ کتاب کا نام: **عرش گیاوی: حیات وخدمات**، مصنف: ابو اجمل محمد طارق جمیلی، اشاعت: ۲۰۰۹ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، رابطہ: حبیب کمپلکس، لائن بازار، پورنیہ، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

گیا گرچہ پہاڑوں اور سوکھی ہوئی پھلگو ندی کے درمیان بسا شہر ہے۔ لیکن مہاتما بدھ کو عرفان یہیں حاصل ہوا۔ اور ہندو مذاہب کے لوگ اپنے بزرگوں کی موت کے بعد ان کی روح کی شانتی کے لئے یہاں پنڈ دان کرنے آتے ہیں۔ یہ شہر صوفیوں کا بھی رہا ہے اور ادبی وشعری حلقے بھی قدیم زمانے سے اردو زبان وادب کی خدمت میں لگا رہا ہے۔ یہاں کے مشہور طنز ومزاح نگار

انجم مانپوری، مشہور شاعر کشتہ گیاوی، عرش گیاوی، جوگیشور پرساد خلش، شمس مینائی، سریر کابری، بسمل سہسرامی، ثمر نگاروی، شفق عماد پوری، قیصر عثمانی، وکیل اختر، فرحت قادری وغیرہ مشہور رہے ہیں۔

گردش زمانہ نے عرش گیاوی کو فراموش کر دیا تھا۔ ان کی سیلانی طبع بھی ان کا تعلق گیا سے منقطع کرتی رہی۔ ملازمت کے دوران بھی وہ دیگر علاقوں میں کام کرتے رہے لیکن ان کی شاعرانہ طبیعت ہمیشہ ان پر حاوی رہی۔ ان کے زمانہ میں ہی ان کے دو مجموعہ کلام منظر عام پر آ چکے تھے اور ادبی حلقے میں پذیرائی حاصل کر چکے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ طارق جمیلی صاحب نے اس نادر شاعر کو مقبولیت عطا کر دی۔ انہوں نے تحقیق سے سرزمین بہار کا ایک عمدہ شاعر جو گردش زمانہ کی نذر ہو گیا تھا ادبی حلقوں میں پھر سے موضوع بحث بنا دیا۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلو کو انہوں نے اجاگر کیا اور اس سے بھی باخبر کیا کہ عرش گیاوی بہار کے میر تھے اور انہیں "میر بہار" کا خطاب بھی ادبی حلقوں نے دیا تھا۔ ان کے کلام میں سوز و گداز اور یاسیت کے پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حالانکہ عرش گیاوی کو زندگی میں کسی طرح کی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور غالب کو بھی نہیں لیکن پھر بھی غالب نے لکھا

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ ۔ صبح کرنا شام کا لانا جوئے شیر کا

عرش گیاوی نے واردات قلب کو اس قدر حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ غم جاناں اور غم روزگار کے درمیان حد فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ طارق جمیلی نے عرش گیاوی کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار میں اردو زبان و ادب زمانہ قدیم سے ہی پوری آب و تاب کے ساتھ پھل پھول رہا تھا۔ طارق جمیلی نے یہ بھی بتایا ہے کہ عرش گیاوی کے یہاں دبستان دہلی اور لکھنو دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طارق صاحب کا یہ کام ایک گرانقدر کارنامہ ہے وہ بہت ہی محنت اور کاوش کے ساتھ تحقیق کو ایمانداری کے پیمانے پر رکھ کر عوام تک لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ کارنامہ جہاں عرش گیاوی کی عظمت کا تعین کرتا ہے وہیں طارق جمیلی کی فہم و فراست کا پتہ دیتا ہے۔ اردو ادب کے سرمایہ میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔

☆ **کتاب کا نام: عضویاتی غزلیں**، مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: ۱۰۰ روپے، رابطہ: کوہسار، بھیکن پور۔ ۳ بھاگلپور۔ ۸۱۲۰۰۱ مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

زیر نظر مجموعہ "عضویاتی غزلیں" ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے تصویروں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری میں ایسی غزل کی روایت تو دیکھنے میں ملتی ہے۔ امیر خسرو نے بھی ایسے اشعار کہے ہیں جن میں سرتاپا کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی مشہور غزل نمی دانم چہ منزل بود...... میں ایک شعر ہے:

پری پیکر نگار سرو قدے لالہ رخسارے ۔ سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

اور غالب کا پاؤں پر یہ شعر:

شاید کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کوئی ۔ دکھنے لگے ہیں اس بت نازک بدن کے پاؤں

اردو کے دیگر معروف شعراء نے بھی سراپا نگاری اشعار کے ذریعہ سے کی ہے۔ دیگر زبانوں عربی اور فارسی میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے سراپا کے خطوط نمایاں ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے مشہور دانشور پوروا اور واتسیاین نے بھی ظاہری اور باطنی عضو کا بیان نہایت ہی دلکش انداز میں اور علمی اعتبار سے کیا ہے جس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ آج کے عہد میں جبکہ جنسی شاعری کا چلن بھی دیکھنے کو ملتا ہے، پہلے بھی اس طرح کی باتیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ فرائڈ نے انسانی عمل کو جس جنسی زاویے سے دیکھا ہے وہ بھی اسی دائرہ میں آتا ہے۔ مصوری اور بت گری، کونارک کے منظروں کی نقاشی و پیکر تراشی عضویات کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں اور کم و بیش یہی صورت اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں بھی

دیکھنے کوملتی ہے۔ اس لئے انسانی تہذیب کے مختلف دور میں عضویاتی نشیب وفراز کے بیان میں فن کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اردو میں مکمل غزلوں کی ایسی مثال نہیں ملتی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے تجزیاتی ذہن سے کام لیتے ہوئے مکمل مکمل غزلیں عضویاتی غزلیں کے نام سے اردو کو دی ہیں۔ اردو میں مکمل غزلوں کا تجربہ اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ''عضویاتی غزلیں'' ایک اختراعی پہل ہے جس میں سنگین حقائق اور تلخ سچائیوں کو عصری آگہی اور برجستگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جن کی نئی جہتیں نئے سیاق وسباق رکھتی ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

رات ہو جائے اگر پھیلیں تمہارے گیسو　　دن کے جیسا لگا جو تم نے سنوارے گیسو

کردیں پل میں گلشن میں تبدیل اسے　　میرے آنگن میں جب آئیں تیرے پاؤں

جو صندل ہی کی شاخ تازہ جیسی پنڈلیاں ہیں　　سکونِ جاں قرار دل ہی تیری پنڈلیاں ہیں

تیرا ہو کہ میرا دل　　کوئی نہیں اب سچا دل

اجنتا یا ایلورا کے جو دیکھا نقشِ سنگیں کو　　گماں مجھ کو ہوا ایسا ترے پستان لگتے ہیں

شب کے پچھلے پہر یاد شاعر کو آیا کس کا بدن　　جرأتِ شوق کا امتحاں جیسے تھا اس کا سارا بدن

گیسو سے لے کر پنڈلی اور پاؤں تک الگ الگ ۲۳ عضو پر پوری پوری غزلیں ہر حال میں انفرادیت کی حامل ہیں جنہیں اجنتائی رنگ تصویروں کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ ہر عضو پر اتنی ہی تصویریں کتاب کو دلچسپ، جاذب اور گدگدانے والی بناتی ہیں اور سرشاری وفکر کی آگہی عطا کرتی ہیں۔ تخلیقی بصیرت اور فنی شعور سے مالا مال یہ غزلیں بدن کی جمالیات پر مرکوز ہیں۔ سرورق کی دلکشی بھی انفرادیت کی حامل ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے علامتوں کی جدت، پیکر تراشی کی نزاکت، مصوری کے نازک، انوکھے اور نرالے انداز، لفظوں کے بانکپن اور نت نئی لفظیات سے اپنے امتیازی اوصاف کو سورج آسا کیا ہے۔ یہ کتاب رکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب میں ہر غزل کے پہلے عضو کی مناسبت سے پورے پورے صفحہ میں تصویریں بھی ہیں جو نگاہوں میں لپک پیدا کرتی ہیں۔

☆ **کتاب کا نام: نہال دل پر سحاب جیسے**، شاعرہ/مصورہ: پروین شیر، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، رابطہ: مکتبہ شعر و حکمت ۹/۶۵۹_۳_۶ کپاڈیا لین، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

There is always a silver lining in the darkness اندھیرے میں ہمیشہ امید کی ایک سنہری کرن ضرور دکھائی دیتی ہے۔ گردوپیش میں جتنے مایوسیوں کے ڈیرے ہوں وہ ریت کے گھروندوں سے زیادہ نہیں۔ پروین شیر نے اسی طرح سے زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مرغی جس طرح بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے اور موت سے نجات حاصل کرنے کا فریب پال لیتی ہے۔ پروین شیر کبھی بھی اس طرح کی یاسیت کا شکار نہیں ہوتیں۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی کے تمام خواب کوئی ضروری نہیں ہے کہ پورے ہو جائیں اور غم کا ایک لامتناہی سلسلہ بھی جاری رہے لیکن اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک امید کا سہارا ہی زندگی کی جدوجہد کے لئے کافی ہوتا ہے اور ایسے بھی یہ مانا جاتا ہے کہ Failures are the success of the pillars انسان اپنے گردوپیش کے تجربوں سے نئی حکمت عملی ڈھونڈ ہی لیتا ہے اور ضرورتیں ایجاد کی ماں ہوتی ہیں (Necessity is the mother of invention) ضرورتیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ جدوجہد کرے۔ پروین شیر نے بھی اس آفاقی سچائی کو خوبصورتی سے اپنی پینٹنگ اور شاعری کے

ذریعہ اپنے شعری مجموعہ ''نہال دل پر سحاب جیسے'' میں پیش کیا ہے۔ ہر شعری تخلیق کے ساتھ انگریزی ترجمہ اور پینٹنگ کا رشتہ جوڑنے کی ایک کامیاب کوشش پروین شیر کے مجموعہ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ جذباتی اور ناقابل تردید حقیقت جو ماں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، وہ اپنے آپ میں اس احساس کو جگا دیتا ہے کہ ماں تمام خود غرضیوں سے اٹھ کر اپنا دامن پھیلا دیتی ہے اس سکون کے لئے جو اس کی تخلیق کو سکون عطا کرے۔ قدرت کی منظر نگاری میں، دھیمی آنچ میں جلنے کا تصور جب شاعر کے اندر جاگتا ہے تو پوری دنیا خوبصورت نظر آنے لگتی ہے اور ایک انسپاریشن دیتی ہے کچھ کر گزرنے کے لئے۔ ابہام و تفہیم کے مرحلہ میں کچھ بھی حائل نہیں ہو سکتا۔ اگر دل سے بات کہی جائے: دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ پر نہیں قوت پرواز مگر رکھتی ہے۔ پروین شیر کی تخلیقی پرواز میں دھندلکوں جیسا سبک رو اثر ان کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کی ''اے ماں''، ''اب جیون کس طرح''، ''بوڑھی بچی''، ''ماں''، ''او میرے بچے''، ''قحط''، ''تمہاری باہوں میں آ رہی ہوں''، ''جنگل میں بے اماں''، ''تنہا ہاتھ''، ''سائبان''، ''قطرہ اور سمندر''، ''سفید کپڑوں میں ایک مسیحا'' وغیرہ نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کا فنکارانہ رنگ و آہنگ دل کو چھو لیتا ہے۔ یہ مجموعہ ہر اعتبار سے دلچسپی اور توجہ کا مستحق ہے۔

☆ **کتاب کا نام: مکاں سے لامکاں تک، شاعر: شمس جلیلی، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: (لائبریری) ۲۵۰ روپے، (رعایتی) ۱۵۰ روپے، ناشر: لائن بازار، پورنیہ، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ**

شمس جلیلی پورنیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو بہار کا ایک حصہ ہے، جس کے اوپر میں کشن گنج بغل میں کٹیہار اور ارریہ اور ذرا حد فاصل سے آگے بنگلہ دیش اور نیپال۔ یہ علاقہ مشترکہ تہذیب کا گہوارہ ہے یہاں بنگال کا بھی اثر ہے اور بہار کا بھی۔ یہاں کی مقامی بولی بنگلہ سے میل کھاتی ہوئی ہے اور اس کے باوجود اقلیتی اکثریتی علاقہ ہونے کے سبب مدارس اور اردو بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد بھی حاوی ہے۔ شمس جیلی نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا لیکن غم روزگار اور سودائے جنوں سے وہ بچ نہ سکے اور اپنے اندر اٹھنے والے ہیجان کو اور شعوری اور فکری طور پر ہونے والے احساسات کو وہ دبا نہ سکے اس لئے ترسیل و ابلاغ کے بہترین ذریعہ شاعری کو اپنایا۔۔ شاعری کسی جنون کا نام نہیں۔ لیکن دل پہ جو بات گزرتی ہے، جو چھو جاتی ہے اس سے شاعر بے خبر نہیں رہ سکتا۔ شمس جلیلی برصغیر میں ہونے والے صورت حال سے بے خبر نہیں۔ یہاں تک کہ بین الاقوامی سطح پر بھی جو معرکے اور انسانیت سوز حالات رہے اس کا بھی منظر نامہ ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ پورنیہ کی سرزمین سے ان کے بے پناہ لگاؤ کا کافی اندازہ ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ شخصیات بھی ان کی شاعری کا احاطہ کرتی ہے اور اتنا ہی نہیں واردات قلب اور حالات زمانہ کا ملا جلا عکس ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شعری چراغ جلانے کا اور جلائے رکھنے کا کام شمس جلیلی نے بخوبی کیا ہے۔ آنے والی نسلیں بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گی۔ ان کا تازہ مجموعہ کلام مکاں سے لامکاں تک عرفان و ادراک کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔ اور حساس دل کی ترجمانی بھی انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں مختلف ادوار کے مختلف عنوانات سے مرتب کئے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کیسے کیسے حالات اور تاریخ نے کیسی کیسی کروٹ لی اور عام انسان کن کن مسائل میں گھرا ہے۔ اس کے کرب کی ترجمانی اور تمثیلی پیرایۂ اظہار ان کی شاعری کا وصف ہے۔ ان کی شاعری کے لئے کچھ زیادہ کہنے سے بہتر ہے کہ ان کی شاعری کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کر دوں اور قاری سے بڑا نقاد کوئی نہیں ہوتا اور مبصر تو اس کے سامنے محض ایک تعارفی شخص کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا آپ ان اشعار سے ان کی شاعری کا خود ہی اندازہ لگالیں:

ہے خدا کا ہی بسیرا آج کل دل میں مرے — اس مکاں کو ایک دن تو لامکاں ہونا ہی تھا

ہو سکے تو آپ دے دیں دل میں تھوڑی سی جگہ — میں یہ سمجھوں بے بسی میں اک ٹھکانہ مل گیا

دورِ حاضر میں کسی کا کچھ پتہ چلتا نہیں — کون کس کا آشنا ہے کون ہے ناآشنا

نہ ہوں نازاں جناب شمس کہ پھیلی روشنی ہر سو — کھلے جو گیسوئے جاناں اچانک شام ہو جائے

بہت دشوار ہے رمز آشنائے میکدہ ہونا — خم و پیمانہ کیا کہتے تھے کیا پیر مغاں سمجھا

کریں گے کام کچھ اہل جنوں ہی — اسیر عقل فرزانے رہیں گے

انہوں نے سیاسی شخصیات میں مہاتما گاندھی، کنور سنگھ، رفیق عالم، محمد حسین آزاد، محمد تسلیم الدین وغیرہ تعلیمی شخصیات میں سرسید احمد خاں، ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر سید حسن، (انسان اسکول کے بانی) مولانا اسرار الحق قاسمی، وغیرہ ادبی شخصیات میں غالب، کلیم عاجز، اکمل یزدانی، طارق جمیلی، طلحہ رضوی برق، وفا ملک پوری، عبدالمنان طرزی، منیر فاروقی، نزہت طارق وغیرہ کے علاوہ پورنیہ کی اہم شخصیتوں ڈاکٹر فیض الرحمٰن، پروفیسر نورالہدیٰ، ڈاکٹر نورالابصار، ڈاکٹر نزہت پاکیزہ بانو، ڈاکٹر قمر الاحسن وغیرہ کے ساتھ ساتھ پورنیہ اور اس سے ملحق علاقوں کی تاریخ، تہذیب اور طرز معاشرت پر اپنے تاثرات منظوم پیش کئے ہیں جس سے ان کی شاعرانہ خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب دیدہ زیب ہے جس کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہو رہی ہے۔

☆ **کتاب کا نام: احساس کی ہجرت (شعری مجموعہ)**، شاعر: ظفر امام، اشاعت: ۲۰۰۸ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، بتیا (مغربی چمپارن)

ظفر امام نئی نسل کے چند اہم اور معتبر شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ''احساس کی ہجرت'' ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ان کی غزلوں کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سے دوسرے شعرا کی طرح لکیر پر لکیر کھینچنے سے گریز کیا ہے۔ ان کے یہاں لہجے اور لفظیات کی سطح پر خاصی ندرت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں عصریت کے ساتھ شعریت کا بھی اہتمام ملتا ہے۔ یہ وصف آج کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ ظفر کے یہاں اسلوب اور لفظیات کی انفرادیت کو پروفیسر وہاب اشرفی نے اجتہاد سے تعبیر کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔ ان میں احساس کی تازگی اور غزل کے روشن ہونے پر زور ہے۔ ان میں شاعر کے شعری میلان کے ساتھ غزل کے فنی لوازمات کے تئیں احترام کا جذبہ بھی واضح ہے۔ وہ نئی غزل کو نئے احساس کے بغیر تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ بشرطیکہ یہ نئے احساس شعر بھی بن جائیں:

خدا کی رحمتیں قسطوں میں کیوں نہیں مانگوں — میں آدمی ہوں خطا بار بار کرتا ہوں

ابھی تو پاؤں میں چھالے ہیں کس طرح جاؤں — سفر نہیں تھا تو رستے بلانے آتے تھے

توانہیں ہے مگر جنگ میں چلوں گا ضرور — کہ دشمنوں کا مرے حوصلہ تو کم ہوگا

فاتحہ اپنے گناہوں کا بھی پڑھتا ہے ظفر — زندہ احساس کے ہو جانے سے بے زار بھی ہے

ظفر کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نہ بہت تہہ داری ہے اور نہ اکہرا پن۔ انہوں نے درمیان کی راہ اپناتے ہوئے ترسیلی سطح پر بھی اپنے اشعار کو بہت صاف اور شفاف رکھا ہے اور فکری سطح پر بھی انہیں آج کی شعری یکسانیت سے محفوظ رکھا ہے۔ میری دانست میں یہ بڑی خوبی ہے اور یہ خوبی احساس کی ہجرت میں جا بجا نظر آتی ہے۔ امید

ہے کہ ظفر کا یہ مجموعہ غزل ادب کے خاص حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

☆ **کتاب کا نام: انداز بیاں اور** (تنقید)، مصنف: ابراہیم اشک، اشاعت: اکتوبر ۲۰۰۲ء، ناشر: ندیم پبلیکیشنز، اندھیری ویسٹ، ممبئی، قیمت: ۱۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ابراہیم اشک اردو ادب میں ایک معروف نام ہے۔ ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ وہ شاعری کے ساتھ عمدہ نثر لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''انداز بیاں اور'' ایک خاص مقصد کے تحت معرکہ وجود میں آئی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب اور میر کے اشعار کی جو شرح لکھی ہے اس میں ان کی علمیت اور دانشوروں کے جوہر نمایاں ہیں لیکن کہیں کہیں یہی علمیت اور دانشوری اس قدر شعر کے اصل مفہوم اور مضامین پر حاوی ہوئی ہے کہ سب کچھ گڈ گوبر ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ زبردستی اپنی بات منوانے کی ضد میں لمبی چوڑی، بحث کر رہے ہیں جب کہ اس بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ (ص: ٦)''

ابراہیم اشک نے مرزا غالب کے پچاس اشعار کی تشریح کرتے ہوئے عمومی طور پر دوسرے شارحین اور خصوصی طور پر فاروقی صاحب کے افکار سے اقرار و انحراف کی راہ نکالی ہے۔ ''انداز بیاں اور'' کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح طور پر شمس الرحمٰن فاروقی سے ابراہیم اشک کے فکری اختلاف کا اندازہ ہوتا ہے۔ کسی بھی شعر کی شرح میں مذکور اول کا ذکر سے خالی نہ ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ صاحب کتاب نے اپنا موقف کیا رکھا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر کے افکار سے بحث آسان نہیں۔ ذاتی اذہان اور دوسرے عوامل ملا کر اشعار سے برآمد معنی و مطالب کا احاطہ دانشوروں کی شرح میں موجود ہے۔ شرح میں اختلاف کی جو صورت بنتی ہے وہ اقرار کی تصویر سے بہر حال چھوٹی ہے۔ یہ کتاب ابراہیم اشک کے مطالعہ پسندی، ادبی پیش رفت سے آگاہی اور نباض غالب ہونے کی پہچان ہے۔ اس کتاب میں شامل غزلیات غالب کی زمین میں اور غزلیں ان کی قدرت کلامی کو عیاں کرتی ہیں۔

جب بھی غالبیات کا ذکر ہوگا، ابراہیم اشک کی محنت اور انفرادی سوچ کا اعتراف ہوگا اور انداز بیاں اور... کے کئی پہلوؤں کو اہل علم سراہیں گے۔ اس کتاب کے سرورق اندرونی پر شائع علمی تساہلی کے طور پر دیکھی جائے گی اور بیک کور پر جناب قمر صدیقی کی نپی تلی رائے سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ **کتاب کا نام: محافظ ملت علامہ اقبال** (تنقید)، تنقید نگار: ابراہیم اشک، اشاعت اول: جنوری ۲۰۱۰ء، ناشر: تکمیل پبلی کیشنز، ممبئی، قیمت: ۲۵ روپے، صفحات: ۸۸، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ابراہیم اشک شعر و نثر میں یکساں مقبول ہیں۔ الہام (شعری مجموعہ)، آگہی (شعری مجموعہ)، کربلا (مرثیہ) تنقیدی شعور (تنقید)، انداز بیاں اور... (تنقید) وغیرہ نگارشات ان کی ادبی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ محافظ ملت علامہ اقبال ان سات مضامین کا مجموعہ جو انہوں نے انور شیخ کے ایک مضمون ''غارت گر ملت علامہ اقبال'' سے اختلافی صورت میں بطور جواب لکھا تھا۔ الکوثر کے ایڈیٹر مظفر حسن عالی نے انور شیخ کا مذکورہ مضمون اشک کے پاس بھیج کر خیالات کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے تھے ، جو نہ ہو سکی۔ ابراہیم اشک نے اپنی بات کے تحت اس کا ذکر کیا ہے کہ آٹھ سال بعد اس مضامین کو تکمیل کر کے شائع کیا ہے۔

اس کتاب میں شامل بھی مضامین نہ صرف قابل مطالعہ ہیں بلکہ اقبال پر لگائے گئے الزامات جو دلائل کے ساتھ مسترد کرنے میں کامیاب ہیں۔ محافظ ملت علامہ اقبال سب سے زیادہ اپیل کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی پیش کش

میں مضمون نگار نے معروضی طریقہ کار اپنایا ہے۔ علامہ اقبال کا ذکر وفکر، علامہ اقبال غیر متعصب تھے۔ تصور پاکستان کی تاریخی حقیقت، علامہ اقبال کا اثر مہاتما گاندھی پر، علامہ اقبال کی وطن پرستی، علامہ اقبال کا برتری کو خراج عقیدت، ایسے عنوان ہیں جن کے تحت ابراہیم اشک نے انور شیخ کی غلط بیانیوں نیز کم علمیوں کو طشت از بام کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اقبال کے شیدائیوں کا یہی شیوہ تھا کہ وہ ان نکات کو سامنے لائیں جو اقبال کو محب وطن، ہمدرد قوم اور بالغ النظر بتانے میں سازگار ہوں۔ یوں بھی علامہ اقبال پر الزام تراشی کرنے والے اپنے کو اکثر تنہا ہی محسوس کرتے ہیں جب کہ اقبال کو چاہنے والے ان سے استفادہ کرنے والے کی جماعت ہوتی ہے۔ محافظ ملت علامہ اقبال ایک احسن کاوش ہے جس کو سراہا جانا چاہئے۔

☆ **کتاب کا نام: احمد وصی: شاعری اور شخصیت**، مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، سن اشاعت: ۲۰۱۰ء، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، قیمت: ۱۵۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

احمد وصی ایک حساس اور دردمند ادیب ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ نظم اور غزل کے علاوہ رباعیات، قطعات، ہائیکو، ماہیے، ترائیلے اور گیت پر طبع آزمائی کی۔ آکاشوانی اور دوردرشن سے ان کے کلام نشر ہوتے رہے۔ ان کی شاعری (نظم، غزل) البموں کی زینت بنی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "بہتا پانی" سن ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا اور بے پناہ مقبول ہوا۔ اس کے بعد "بادلوں کے شہر" (دیوناگری رسم الخط میں غزلیں)، جگنو میرے ساتھ ساتھ (۲۰۰۴ء) اور تتلیاں (۲۰۰۷ء) مجموعے ان کی شاعری کا نمائندہ بنا۔ انہوں نے "کربلا" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ احمد وصی کی شخصیت اور شاعری پر محیط مضامین کو اردو کے نامور ادیب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا ہے اور اس کا نام ہے احمد وصی: شاعری اور شخصیت۔

اس کتاب میں چھبیس مضامین شامل ہیں۔ عالمی اردو آبادی کے نامور قلمکاروں کے ان مضامین سے احمد وصی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بہ زبان اردو چوبیس مضامین میں وقار ناصری، افتخار اجمل شاہین، ڈاکٹر رضوان احمد، ڈاکٹر فراز حامدی، پروفیسر خالد حسین خاں، پروفیسر سائل احمد، عبدالاحد ساز، ڈاکٹر محمد بشیر الدین اور زبیر وارثی کے خیالات وافکار سے احمد وصی کی شعری کائنات کا رنگ واضح ہو کر سامنے آیا ہے۔ گفتنی کے عنوان سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے موصوف کی شخصیت کو پیش کرتے ہوئے ان کے حالات کوائف نیز ادبی ومعاشرتی پہلو کو بیان کیا ہے۔ احمد وصی کی ادبی زندگی کے ابتدائی دنوں کا ذکر اور پھر ان کی مصروفیتوں، ادبی سرگرمیوں، تصنیفات، ریڈیو سے وابستگی اور فلم وٹیلی ویژن سے تعلق کو بڑے ہی اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مرحوم سردار جعفری کے "احمد وصی کو مبارکباد" نے احمد وصی کی شاعری کو احساس کی نئی سطحیں چھونے کی کوشش سے تعبیر کیا ہے۔ اردو مضامین کے ساتھ ہندی میں لکھے گئے ڈاکٹر رام پنڈت، بیتا برانک کے لیکھ اور انوراگ آنند کا انٹرویو کی شمولیت سے بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ ہندی حلقے میں بیتا برانک سے احمد وصی کا فلمی سفر، کے عنوان سے کلیدی گفتگو کی ہے۔ پوری کتاب کے مطالعہ سے احمد علی کی شاعری اور زندگی کے رنگ واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ سعی قابل قدر ہے کہ انہوں نے باکمال شاعر اور منفرد نثر نگار کو پورے طور پر جاننے کا موقع دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں احمد وصی کے تعلق سے ادبی وفلمی سرگرمیوں کی ۳۲ تصویریں شامل کی گئی ہیں۔ عمدہ چھپائی اور موصوف کی تصویر سے مزین سادہ مگر پرکار سرورق کے ساتھ یہ کتاب یقیناً پسند کی جائے گی۔

☆ کتاب کا نام: مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی، مصنف: ڈاکٹر نذیر فتح پوری، اشاعت: ۲۰۱۰ء، رابطہ: سائرہ منزل، 230/B/102 وماں درشن، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونہ، قیمت: ۱۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ڈاکٹر نذیر فتح پوری ۱۹۸۱ء سے ''اسباق'' نکال رہے ہیں۔ اسباق اب عالمی جریدوں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اسباق سے قبل ان کی شاعری اہل اردو کو متاثر کر رہی ہے۔ وہ ایک سلجھے ذہن کے پختہ کار شاعر ہیں ساتھ ہی ساتھ اپنی معتدل نقد (تنقید و تجزیہ) کے سبب انہیں اعتبار حاصل ہے۔ نذیر فتح پوری ہماری مستحکم صالح روایتوں کے امین ہیں جس کا نام اردو تہذیب ہے۔ انہوں نے اسباق میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ان سے کئی ادبی امور پر تبادلہ خیال کرتے رہے ہیں۔ پروفیسر ہرگانوی کثیر تصانیف اہل قلم ہیں ایک سو میں کتابوں کے مصنف و مرتب ہونے کا انہیں شرف حاصل ہے۔ وہ ادب میں نت نئے اضافے کے قائل ہیں۔ اس لئے تجربدی پہلو پر ان کی خاص نگاہ رہتی ہے۔

سن ۲۰۰۹ء میں ان کی کتاب ''ژرف گوئی'' منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں بالکل نئی تھی۔ پروفیسر موصوف نے ۲۰۰۸ء کے اختتام پر اہل قلم سے سال کیسا گذرا اور آخری دن کس طرح گذارنا چاہتے ہیں سوال کیا۔ ادباء و شعراء کا جواب آیا۔ چند ایک کا دو تین سطری، کچھ کا مراسلہ کی حد تک طویل اور منظوم بھی۔ ان تمام جوابات کو کتابی شکل دے کر ''ژرف گوئی'' نام سے کتاب منظر عام پر آئی۔ اس کی خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ رسائل و جرائد نے اس پر تبصرے بھی شائع کئے۔

ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا کمال ہے کہ انہوں نے ''ژرف گوئی'' کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس کتاب میں شامل اہل قلم کے جذبات کو نئے انداز سے قاری کے سامنے رکھا۔ ژرف گوئی کا تجزیاتی مطالعہ مشمولہ ادباء و شعراء کے صرف خیالات کی یکجائی نہیں ہے بلکہ مفید معلومات اور تحریر کی خصوصیت کو آئینہ کیا گیا ہے۔ تجزیہ صفحہ ۳۵ سے کتاب کے آخری صفحہ ۶۷ تک پھیلا ہوا ہے اس کتاب کے مشمولات پر نگاہ کرتے ہوئے آپ پائیں گے کہ مناظر عاشق ہرگانوی کے متعلق ایک نظم بعنوان ''مجھے پیارا ہے وہ جس کو کتابوں سے محبت ہے'' اسباق کا اداریہ، ڈاکٹر ہرگانوی کے نام مناظر عاشق ہرگانوی کی آزاد غزل پر تضمین اور مناظر نامہ پر نذیر فتح پوری کا منظوم تبصرہ دونوں صاحب کمال کے علم و فن سے آراستہ ہے۔

''اسباق'' خطوط اور ہرگانوی'' میں ان مراسلوں کو جمع کیا گیا ہے جن سے بحث کے دروازے کھلتے ہیں اور اسباق سے حد درجہ لگاؤ کا علم ہوتا ہے۔ مناظر بنام نذیر۔ چند خطوط'' میں بھی ان فن پارے کو یکجا کر دیا گیا ہے جن میں مناظر عاشق ہرگانوی کا رنگ نکھرا نکھرا سا ہے۔ بعض خطوط بہت مختصر مگر کارآمد ہیں۔ اس کتاب کو مذکورہ آٹھ عنوانات میں تقسیم کر کے کتاب کے عنوان کو بامعنی بنایا گیا ہے۔ آٹھ میں سے ساتھ عنوانات مناظر عاشق ہرگانوی کی علمی و ادبی استعداد کو ظاہر کرتا ہے اور آخر میں نفس کتاب ''ژرف گوئی'' کا تجزیہ ان کی تجربہ پسندی اور جدید فکر کو استحکام بخشنے اور اعتراف و اقرار میں معاون ہے۔

کتاب کے خوبصورت سرورق پر پروفیسر ہرگانوی اور بیک کور پر نذیر فتح پوری کی تصویریں جاذب نظر ہیں۔ اس کتاب کی پذیرائی ہونی چاہئے تاکہ ہم نیا سوچنے والوں کی قدر کر سکیں۔

☆ کتاب کا نام: عندلیبان غزل (حصہ اول)، مصنف: ظفر مجیبی، شاہ کمپاؤنڈ، شاستری نگر، موتی ہاری، بہار، ناشر: علمی مجلس بہار، پٹنہ، اشاعت: ۱۰۔۹۔۲۰۰۹ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ظفر مجیبی کی ادبی خدمات ان کی شاعری اور تحقیق پر محیط ہے۔ ''رموز دل'' ''اقدار'' اور ''دھوپ کے سائے تلے'' کی شاعری نے ان کو منفرد و ممتاز شعراء کی صف میں مستحکم مقام عطا کیا ہے۔ شاعری کے ساتھ انہوں نے سنجیدگی سے شعر و ادب کے مشاہیر کو

محفوظ کرنے کا کام بھی انجام دیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے قبل ''مشرقی چمپارن کے ادیب'' اور ''گلہائے چمپا'' ان کی تحقیقی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں موضوع کے اعتبار سے نہایت کارآمد اور ان سے ظفر مجیبی کی ادبی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''عندلیبان غزل'' بہار اور جھارکھنڈ کے منتخب غزل گو شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس تحقیقی کتاب میں کل ۱۴۷ شعراء کے مختصر سوانح اور نمونۂ کلام شامل ہیں۔ شعراء کی ترتیب میں محقق نے سن پیدائش کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ اس طرح عندلیبان غزل میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۸۱ء تک پیدا ہوئے شعراء کی شمولیت ہوگئی ہے۔ ایک ساتھ بزرگ اور نوجوان نسل کی نمائندگی سے بہار و جھارکھنڈ کے شعری رفتار کو جاننے میں آسانی ہوگی۔ یہ کتاب اہل علم کے لئے خزینہ ہے، جس کے ذریعہ اس خطہ کے شعراء سے باخبر ہوسکیں گے۔ اس میں شامل کوائف اور نمونۂ کلام، نمائندہ شعراء کے بارے میں مستند حوالے شمار کئے جائیں گے اور اردو ادب کے طالب علم اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

بہار اور جھارکھنڈ میں شعراء کی بڑی تعداد اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئی ہے۔ جیسا کہ ظفر مجیبی نے ذکر کیا ہے کہ اس کی دوسرے حصے میں باقی بچے شعراء اشاعت پذیر ہوں گے۔ تب جا کر عندلیبان غزل کی مکمل تصویر سامنے آسکے گی۔ محقق نے تعارف میں خوش گوار، حیرت کا اظہار کیا کہ شعراء سے رابطہ اور عندلیبان غزل کی اشاعت میں انہیں تعاون حاصل ہوا۔ عام طور پر تحقیقی کام کرتے ہوئے اس طرح کی کوششیں ادباء و شعراء کی سرد مہری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس کتاب کے بیک کور پر ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کے معتدل خیالات اس تحقیق کی افادیت بھرے پہلو کی نشاندہی سے مزین ہے۔

یہ کتاب ان اہل علم کے مطالعہ میں آنی چاہئے جن کو اس خطے کے زبان و ادب سے دلچسپی ہے۔ طلباء کو خاص طور پر اس سے مستفیض ہونا چاہئے۔ یقین ہے کہ اس کتاب کی خوب خوب پذیرائی ہوگی۔

☆ **کتاب کا نام ابراہیم اشک: افسانے اور تجزیے،** مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، اشاعت: ۲۰۰۹ء، قیمت: ۱۳۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، در بھنگہ

ابراہیم اشک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ شاعر، ناقد، صحافی اور افسانہ نگار کے طور پر ان کی حیثیت مسلم ہے۔ انہوں نے فلموں کے لئے نغمے اور مکالمے لکھے ہیں، افسانہ نگاری میں انہوں نے جن موضوعات کو برتا ہے اس میں معاشرے کی ناہمواریوں کا عمدہ نمونہ ملتا ہے۔ ''ابراہیم اشک: افسانے اور تجزیے'' اپنی نوعیت کی ایک منفرد کوشش ہے۔ اس کتاب کے مرتب جناب مناظر عاشق ہرگانوی ہیں۔ ان کا تجربدی ذہن ہر لحہ ادب میں کچھ نیا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ یہ کتاب بھی ان کی تازہ فکر کا آئینہ ہے۔ اس کتاب میں ابراہیم اشک کے ۱۳؍ افسانے اور ان افسانوں پر مشاہیر ادب کے تجزیے شامل ہیں۔ ابراہیم اشک کے افسانے دھندہ، جیون دان، زندہ تصویر، بیکری، ماں، سرحد، تہذیب، شاہ بیگم، سانپ، ملاپ، بخشش، خدا کی قسم، رام جی کا دکھ اچھے ہیں اور ان کے تجزیے سے افسانہ وغیر افسانہ اور بنت کاری کی گرہیں کھلتی ہیں۔ مشمولہ تیرہ افسانوں میں سے تین ایسے افسانے ہیں جن کا تجزیہ دو قلم کاروں سے کرایا گیا ہے۔ ماں، شاہ بیگم اور سانپ وہ افسانے ہیں جن پر اظہار خیال کرنے والے دو اہم قلم کار ہیں۔

گفتنی کے عنوان سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اس کتاب کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے اور افسانے کے فکر و فن کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ان وجوہات کا ذکر بھی کیا جن سے افسانہ دو چار ہوا تھا۔ لیکن صورت حال یکسر بدل گئی ہے اور اردو افسانہ قاری کو نہ صرف اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے بلکہ ناقدین ادب نے بھی اس جانب خوب توجہ کی ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ خوش گمانی ہوتی ہے کہ ابراہیم اشک کے افسانوں کو آئینہ کے ساتھ پیش کرنے والا صاحب علم و فن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی فکشن تنقید میں اس قائم روایت کو آگے بڑھائیں گے۔

اس کتاب کے سرورق پر ابراہیم اشک اور بیک کور پر مرتب اور اشک کی تصویریں دیدہ زیب ہیں۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب سے ابراہیم اشک ایک کامیاب افسانہ نگار کے روپ قائم ہو چکے ہیں۔ امید ہے یہ کتاب فکشن پڑھنے اور کام کرنے والوں کے درمیان پسند کی جائے گی۔

☆ **کتاب کا نام: مضامین رنگ رنگ**، مصنف و ناشر: پروفیسر راحت حسین بزمی، اشاعت: ۲۰۰۹ء، رابطہ: رام پاڑہ، کٹیہار، بہار، قیمت: ۲۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

پروفیسر راحت حسین بزمی نے ایک طویل عرصہ درس و تدریس میں بتایا ہے۔ پورنیہ کالج پورنیہ میں اردو لکچرار (عارضی) سے اپنا کیریر شروع کر کے وہ یونیورسٹی پروفیسر شعبہ اردو، ایم جے کے کالج بتیا، مغربی چمپارن سے سبکدوش ہوئے۔ ''مضامین رنگ رنگ'' ان کے پینتیس مضامین کا مجموعہ ہے جن میں انشائیے کا رنگ شامل ہے۔

سید شاہ نیر حسین نے پیش لفظ میں انشائیہ کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ: ''اس صنف کے اتنے پہلو ہیں اور اس کی پہنچ اتنی وسیع ہے کہ اس کی حد بندی ممکن نہیں''۔ انشائیہ کے غرض و غایت اور فن کا محاکمہ کرتے ہوئے انہوں نے مضامین رنگ رنگ کو انشائیہ کا مجموعہ کہا ہے جو نہ صرف ادبی اور خیال انگیز آسودگی بخشتے ہیں بلکہ یہ بھی عیاں کرتے ہیں کہ انشائیے کسی حد بندی کے متحمل نہیں۔ اس روشنی میں مذکورہ کتاب کا مطالعہ خوش گوار حیرت میں ڈالتا ہے۔ آئینہ کے عنوان سے مضمون نگار نے مضامین کو جلسے میں پڑھے جانے کی بات کی ہے اور چند لوگوں کی فرمائش پوری کرنے کے لئے لکھے گئے کا اقرار کیا ہے۔

کتاب کے مشمولات کو ۵ حصے میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اکابر سیاست کے تحت آٹھ، اکابر ادب کے تحت ۵، ادب لطیف میں ۳ اور ادبی، سماجی اور تاثراتی انشائیے کے باب میں بالترتیب ۸، ۶ اور ۵ مضامین متفرق موضوعات ہے۔ اکابرین سیاست میں جواہر لال نہرو، راجندر پرساد اور مہاتما گاندھی کو جس طور پر پیش کیا گیا ہے ان کی عظمت کا اعتراف ہے اور ان کے تعلق سے درس نصیحت بھی۔ اکابر ادب میں غالب، گوپال سنگھ، اقبال اور سرسید کو انوکھے انداز میں یاد کیا گیا ہے جبکہ بالمیکی رام کتھا کے ذکر سے ہندو میتھالوجی کے درک کا علم ہوتا ہے۔ ادب لطیف اور انشائیہ کا رنگ نکھرا ہوا ہے۔

پروفیسر راحت حسین بزمی کی یہ کتاب سنجیدہ ادبی حلقے میں بحث کے دروازے کھولے گی۔ انشائیے کے فن اور اس کے لوازمات کو نئے رنگ سے آراستہ کرنے کی بزمی صاحب کی یہ کوشش قارئین ادب کے لئے اضافے کا باعث ہے۔ یہ کتاب صاف ستھرے کاغذ پر چھپی ہے۔ پیپر بیک جلد کے باوجود اس کی قیمت دو سو روپے تھوڑی زیادہ ہے۔

☆ **کتاب کا نام: اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعراء کا حصہ**، مصنف: ڈاکٹر اسرار احمد، رابطہ: نیا بازار، تھانہ روڈ، سیوان، بہار، اشاعت: ۲۰۰۹ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کا حصہ ڈاکٹر اسرار احمد کا تحقیقی مقالہ ہے۔ تحقیقی مقالے کی نوعیت کے مطابق اسے پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ باب اول میں بہار کے ہندو شعراء کو متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں بانٹ کر متعارف کرایا گیا ہے۔ شعراء سے متعلق مختصر معلومات اور دستیاب اشعار کے حوالے سے اس بات کو مستند بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ باب کافی طویل ہے۔ یہ دو سو سولہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ باب دوم میں اہم ہندو شعراء کی شاعری کا تنقیدی جائزہ ہے۔ اہم ہندو شعراء میں لالہ اجاگر چند الفت، شام عنایت پوری، بہاری لال فطرت، اٹل بہاری اسیر، بہاری سنگھ

بیدی، رام پرساد گھوسلا ناشاد، کامتا پرساد ہوش اور پانڈے رامیشوری پرساد کی شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب کے بھی حوالہ جات شمالی بہار کے معروف محقق شاداں فاروقی کی کتاب ''تذکرہ بزم شمال'' سے لئے گئے ہیں۔ یہ باب صرف ۱۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ باب سوم کے کل نو صفحات پر اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ باب تشنہ ہے۔ جس کا اعتراف محقق نے بھی آخری سطور میں کیا ہے۔ آخری باب میں ان کتب، رسائل اور اخبارات کی فہرست ہے، جن سے تحقیقی کام میں سروکار رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد شعراء کی فہرست لگائی گئی ہے جو تعداد میں ۱۸۹ ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے اس تحقیقی مقالے کو سراہتے ہوئے اسے ایک قابل لحاظ تحقیقی مقالہ قرار دیا ہے، جو آج کی ضرورت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے اس کتاب پر اپنی رائے یوں دی ہے:

''...ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جو نکات پیش کیے ہیں ان میں منطقی استدلال ہے کوئی بات غیر مستند نہیں، اسلوب بیان پختہ ہے۔''

''اردو شاعری میں بہار کے ہندو شعرا کا حصہ'' ایک اہم موضوع ہے۔ جس کی تحقیق و تنقید کو عملی جامہ پہنانے کی جو داغ بیل اس کتاب نے ڈالی ہے اس کے خوش آئند نتائج برآمد ہوں گے۔ البتہ اگر یہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی ہے تو واضح طور پر نگراں کا نام اور یونیورسٹی سے ڈگری حاصل ہونے کا سال درج ہونا چاہئے۔ محقق کے تعارف کی کمی بھی اس کتاب میں کھٹکتی ہے۔ ان سب کے باوجود ڈاکٹر اسرار احمد کی یہ کوشش اہل علم پسند کریں گے۔ مجھے ایسا یقین ہے۔ کتاب کا گٹ اپ اچھا ہے اور جلد بندی عمدہ ہے۔

☆ **کتاب کا نام: ادھوری بات (غزلیں)** شاعر: فہیم جوگاپوری، ناشر: رحمانیہ فاؤنڈیشن، آزاد نگر، شیخ محلہ، سیوان، بہار، قیمت: ۵۰ روپے، اشاعت: ۲۰۰۹ء، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، در بھنگہ

''ادھوری بات....'' فہیم جوگاپوری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ''نوید سحر'' ان کا پہلا شعری مجموعہ تھا۔ نوید سحر کی شاعری نے فہیم جوگاپوری کی طرف شائقین ادب کو متوجہ کیا۔ ادھوری بات ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ زیر مطالعہ مجموعہ میں کل ۱۰۶ غزلیں شامل ہیں۔ غزلوں کی پیشکش سے قبل مشاہیر ادب کے پانچ تحریر پارے ان کی شاعری کے باطن سے گفتگو کے مصداق جمع کئے گئے ہیں جناب مظہر امام، مخمور سعیدی اور شاہین کے خیالات بغیر کسی عنوان کے ہیں۔ جناب مظہر امام نے اس مجموعہ کو ہر اعتبار سے شاعر کا اگلا قدم کہا ہے جو نئے آفاق کی جانب گامزن ہے۔ مخمور سعیدی اختصار کے ساتھ فہیم جوگاپوری کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ان کے اسلوب شاعری کو فارسی اور غیر فارسی آمیز اسلوب کی ہم آمیزش سے تعبیر کیا ہے۔ شاہین نے موصوف کو سچا شاعر گردانا ہے۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی کے مشمولہ مضمون کا عنوان، اشعار تازہ میں سانس لیتی روایت ہے۔ شاعری کی سانسوں میں صندل کے عنوان سے حقانی القاسمی نے فہیم جوگاپوری کی شاعری کو روایت کی مہک اور جدت میں روایت کی سانس سے مزین بتایا ہے۔ مذکورہ تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''ادھوری بات'' عام شعری مجموعوں سے منفرد ہے۔

ایک سوچھ غزلیں نہ صرف اچھی شاعری سے ہم کنار کرتی ہے بلکہ فہیم جوگاپوری کے امتیازات کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ مجموعے کا کوئی صفحہ کھولئے آپ کو شاعری نا امید نہیں کرے گی:

کوشش نہ کام آئے گی یہ کس نے کہہ دیا
بیٹھے بٹھائے مان لیں تقدیر اور ہم

اجالے ڈھونڈنے والے اجالے ڈھونڈ لیتے ہیں
اندھیرا ہے مگر کچھ روشنی اب بھی ہے دنیا میں

رات کا اب کوئی جادو نہیں چلنے والا
اک ستارا ہے ! یہ دن میں بدلنے والا

زمین کرب و بلا جس پہ ناز کرتی ہے　　انا کے رخ پہ وہی بانکپن ضروری ہے

مکتب عشق میں پھر نام لکھا کر دیکھیں　　جو سبق یاد نہیں ہے وہ سنا کر دیکھیں

پرانی قبر سے لپٹا ہے پاگلوں کی طرح　　یہ کون شخص ہے مٹی ہوئی لکیر کے ساتھ

واقف کہاں زمانہ ہماری اڑان سے　　وہ اور تھے جو ہار گئے آسمان سے

''ادھوری بات'' میں دل کی دنیا کے واردات واحساسات بھی ہیں۔ رومانی تصورات کا نیا رنگ ان کے یہاں موجود ہے۔ اس مجموعے کو ترتیب دیا ہے، اظہار احمد ندیم نے۔ اس کا سرورق خوبصورت ہے۔ یقین ہے ادبی حلقے میں اس مجموعہ غزلیات کی پذیرائی ہوگی اور فہیم جوگاپوری کی شاعری دلوں کو گرماتی رہے گی۔

☆ کتاب کا نام: درناسفتہ (شعری مجموعہ)، مصنف: عبرت بہرائچی، طباعت: ۲۰۱۰ء، رابطہ: ناظرہ پور، بہرائچ، یوپی، قیمت: سو روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ڈاکٹر عبرت بہرائچی کا پورا نام ڈاکٹر عبدالعزیز خاں ہے وہ ڈاکٹر عبرت بہرائچی کے نام سے کم وبیش پچاس سالوں سے ادبی دنیا میں روشناس ہیں۔ انہوں نے ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا'' کو اپنا نظریہ بناتے ہوئے ادب کی خدمت کی ہے۔ ان کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔ زیر تبصرہ شعری مجموعہ ''درناسفتہ'' ان کی غزلوں، رباعیات اور ہائیکو پر مشتمل ہے۔

کتاب کے شروع میں تین مختصر مضامین ڈاکٹر عبرت بہرائچی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے شامل کیے گئے ہیں۔ سید خالد محمود نے شاعر کے یہاں ادبی ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے ''درناسفتہ'' کو درِ کمیاب کا نام عطا کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم سرحدی نے ایک ناقابل تردید سچائی کے عنوان سے عبرت بہرائچی کے بے لوث خدمات کو سراہتے ہوئے ان کے کلام میں موجود ہمیشہ زندہ رہنے والی صلاحت کا ذکر کیا ہے۔ سید مصطفیٰ حسین نقوی سیف کا بلاعنوان تحریر شاعر کو اچھا انسان اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینے والا قرار دیا ہے۔

''درناسفتہ'' کی شاعری کا کمال جذبات و احساسات کا سادہ مگر پرکیف بیان ہے۔ مشمولہ ستر غزلوں کو پڑھ جائیے آپ نراش نہیں ہوں گے بلکہ تقریباً سبھی غزلوں میں اچھے اشعار آپ کو عبرت کی شاعرانہ بلندی کے اعتراف کو مجبور کرے گا۔ چھوٹی چھوٹی مگر کارآمد باتوں کو جس انداز سے انہوں نے برتا ہے شاعری کی اثر پذیری کا قائل ہونا پڑتا ہے:

ماں پر بیٹا ہاتھ اٹھائے　　اب ہے قیامت آنے والی

رقص کرتا ہے ساتھ بیٹی کے　　آدمی کتنا بے حیا نکلا

جھوٹ کو منہ نہیں لگاتا ہوں　　میرا اتنا قصور ہے بھائی

انقلابات زمانہ ہیں ہمیں سے منسوب　　دنیا والے ہمیں بیدار نہ ہونے دیں گے

جو کسی کو فریب دیتا ہے　　وہ بھی اکثر فریب کھاتا ہے

مرا چراغ ہواؤں کے رخ پہ جلتا ہے　　مرا نصیب مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

میری فطرت ہے میری عادت ہے　　حق میں دشمن کے بھی دعا کرنا

اس مجموعہ کی رباعیاں اور ہائیکو بھی اثر دار ہیں۔ سردی آئی اور میرا بندر میں غنائیت ہے۔ یہ مجموعہ اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ سرورق ٹھیک ہے لیکن جلد بندی کمزور ہے۔ اس کے باوجود عبرت بہرائچی کی

اچھی شاعری خوب پسند کی جائے گی ایسی امید قوی ہے۔

☆ **کتاب کا نام: ابراہیم اشک: تجربہ کار رباعی گو**، مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، اشاعت: ۲۰۰۸ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ابراہیم اشک عصر جدید کے ممتاز شعراء میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور شہرت پائی ہے۔ رباعی ان کا پسندیدہ صنف شاعری ہے۔ اسے مشکل صنف تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ابراہیم اشک نے نہ صرف اس کو اپنایا بلکہ نئے نئے تجربات سے ہم کنار کیا۔ فی الوقت اردو کے رباعی گو شعراء میں ان کا مقام بلند و برتر ہے۔ زیر تبصرہ کتاب "ابراہیم اشک: تجربہ کار رباعی گو" ان مضامین کا مجموعہ ہے جس ان کی رباعی گوئی پر تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب میں اشک کی رباعی گوئی کے حوالے سے ۲۹ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ایک منظوم تحریر ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی شامل کتاب ہے جس کا عنوان ابراہیم اشک کی تجرباتی رباعیات ہے۔

گفتنی کی سرخی سے مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اشک کی رباعیوں پر گفتگو کرتے ہوئے رباعی کے فنی فکری ابعاد کو ملحوظ رکھا ہے۔ ناقدان فن کے علمی مباحث اور رباعیوں کے مطالعے سے یہ رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور فنی دسترس رکھنے والے شاعر ہیں:

تخلیق نے دن رات پریشاں رکھا　　فکروں نے ہر اک موڑ پہ حیراں رکھا
گزرے ہیں زمانے کے تجربات سے ہم　　جینے کے لئے علم کا میدان رکھا

اشک نے علم کے میدان میں کامیابی کے پرچم لہرائے ہیں۔ بحیثیت رباعی گو ان کے کارنامے اتنے وسیع ہیں کہ جناب قمر برتر نے انہیں خیام سے بہتر رباعی گو کہا۔ فراغ روہوی نے ان کی رباعیوں کی خصوصیات سے گفتگو کرتے ہوئے کارگہ شیشہ گری کا رباعی گو قرار دیا۔ ڈاکٹر اسلم حنیف نے اپنے مضمون میں ان کے تجربے کو صنف رباعی میں قابل قدر بتاتے ہوئے منتخب رباعیوں کو پیش کیا ہے۔ فاروق جائسی نے ابراہیم اشک کی رباعیوں میں عالمی موضوعات کی نشاندہی کی ہے۔ مشمولہ تمام مضامین جناب ابراہیم اشک کی رباعیات کے باطن کو جاننے میں کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا طرہ امتیاز ہے کہ وہ مشاہیر ادب کے کارنامے پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کی خدمات کو اہل علم کے سامنے لانے کا فریضہ علمی بھی ادا کرتے ہیں۔ سرورق کی تزئین کاری سلیقے سے کی گئی ہے۔ رباعی اور ابراہیم اشک کو جاننے اور اعتراف کے طور پر یہ کتاب یقیناً پسند کی جائے گی۔

☆ **کتاب کا نام: ایک ذرا اور...... (شعری مجموعہ)**، شاعر: مسلم شہزاد، اشاعت: ۲۰۰۹ء، ناشر: بزم کہکشاں، نرکٹیا گنج، مغربی چمپارن، **قیمت**: ۱۰۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

مسلم شہزاد کی غزلوں کے اشعار دامن دل میں محفوظ کرنے کے قابل ہیں ان کی شاعری کا جو رنگ نکھر کر سامنے آیا ہے اس میں تابندگی بھی ہے اور زندگی کی سچائی بھی۔ ایک اور ذرا...... کے ذریعے انہوں نے اپنی نناوے غزلوں کو ایوان قارئین کے روبرو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ غزلوں سے قبل ایک حمد شامل اشاعت ہے۔ اس کا یہ شعر ان کے دل کا ترجمان ہے:

وسیلے سے ترے شہزاد شاید　　دکھا دے سطوت افکار یارب

مسلم شہزاد نے الفاظ کا استعمال اس ہنرمندی سے کیا ہے کہ خیال میں بہاؤ ہے۔ ان کی شاعری میں انفرادی سوچ، اور فکر کے نئے زاویے کا اشارہ ملتا ہے۔ پیش نظر شعری مجموعے کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ تجربات و مشاہدات کے

شعری اظہار میں روایت سے استفادہ کیا ہے۔ تازگی اور حسن نے ان کے کلام کو قوت بخشی ہے۔ دوران مطالعہ متعدد اشعار ان کی فکری جولانی اور حسین اندازِ بیان کے سبب محظوظ ہونے اور بار بار پڑھنے کو راغب کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

پہلے بکھر جائے گی آنکھوں میں مری گردِ سفر — گمرہی پھر راستے سے نقش پا لے جائے گی

کچھ دیر جھکی پلکوں کے سائے میں پھر — وہ رنگ حیا عارض و رخسار میں آیا

ہوا کا جال بھلا ٹوٹ کر بکھرتا کیا — مری صدا کا پرندہ اڑان بھرتا کیا

تمام عالم امکاں دکھائی دیتا ہے — مگر کہیں کہیں انساں دکھائی دیتا ہے

سونپ دیا ہے دستِ ہنر میں سونے کا نایاب قلم — چاندی کے کاغذ پر دنیا جانے کیا لکھوائے گی

شاخِ گل کو اس رواداری پہ حیرت ہو تو ہو — رنگ و بو سے رابطہ ہموار کرتا ہے مجھے

جناب مسلم شہزاد کے یہاں تعلّی کے اشعار ان کی عاجزی و انکساری کا جواز بن کر ابھرا ہے۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ کے مالی تعاون سے شائع اس شعری مجموعے کا گٹ اپ متاثر کن ہے۔ جناب مسلم شہزاد کا مختصر تعارف ضرور شامل اشاعت ہونا چاہیے تھا جس کی کمی کھٹکتی ہے۔ یہ شاعر کی خود اعتمادی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو براہ راست قاری کے حوالے کیا ہے اور کسی بھی مشاہیر ادب کو انہوں نے اپنی شاعری اور قاری کے درمیان حائل نہیں ہونے دیا۔ امید ہے باذوق قاری اور شعر پسند اذہان سے یہ مجموعہ داد و تحسین حاصل کرے گا۔

☆ کتاب کا نام: دوہا رنگ، شاعر: ودیا ساگر آنند، ترتیب کار: ڈاکٹر فراز حامدی، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: دو سو پچاس روپے، ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے عالمی اردو آبادی میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ شاعر و ادیب کے ساتھ ساتھ وہ محقق و مورخ، صحافی اور سماجی خدمات گار بھی ہیں۔ وہ ان فرزندان ہندوستان میں سے ایک ہیں جنہوں نے ملک کے باہر ہماری صلاحیتوں اور عظمتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ودیا ساگر آنند کی شاعری ان کے حساس دل کا ترجمان ہے۔ انہوں نے غزلوں، نظموں، گیتوں، دوہوں کے ذریعہ اپنی انسان دوستی افکار کو روشن کیا ہے۔ ان کے پانچ شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ''دوھا رنگ'' ان کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اردو دوہے، دوہا غزلیں، دوہا گیت، دوہا قطعے شامل ہیں۔ اردو دوہے میں تنوع ہے۔ مردف دوہے، معریٰ دوہے، شخصیاتی دوہے، اور کرخال دوہے میں ان کا فن پختگی کا مظہر ہے۔

اردو دوہے کے اختراع کار کے طور پر ڈاکٹر فراز حامدی کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے دوہے میں خوشگوار تجربے کئے ہیں اور وہ سب مقبول بھی ہوئے۔ ودیا ساگر آنند نے اپنے دوہوں میں ڈاکٹر موصوف کی اس کاوش کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے۔ زیر مطالعہ مجموعہ کے شروع میں پانچ مضامین شامل کئے گئے ہیں جن میں ودیا ساگر آنند کے دوہوں سے گفتگو کی گئی ہے۔ ساحر شیوی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ جس کا عنوان ''ڈاکٹر ودیا ساگر کی دوہا نگاری'' ہے۔ انہوں نے دوہے، دوہا غزل اور گیتوں کے حوالے سے موصوف کو کامیاب اور سلیقے اور مشاقی سے بڑھنے والا دوہا نگار قرار دیا ہے۔ اعلیٰ اقدار کے پرستار اور دوہا نگار ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی سرخی سے رفیق شاہین نے ان کی شخصیت اور شاعری بالخصوص دوہے کے حوالے سے سود مند آراء کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی کا مضمون بعنوان ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند اپنے دوہوں کے درپن میں'' دوہا رنگ کی امتیازی وصفوں کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر آنند کے اردو دوہے، دوھا غزل اور دوحا گیت میں ڈاکٹر جمیلہ

عرشی نے ڈاکٹر موصوف کی راجستھان سے وابستگی، علمی وادبی اعزازات اور مختلف اداروں سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے ''دوہارنگ'' کو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک اضافہ شمار کیا ہے۔ مشمولہ مضامین کی آخری کڑی ڈاکٹر ناصرہ بصری کا ڈاکٹر ودیا ساگر آنند۔ دوہارنگ کے آئینے میں ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے شعری مجموعے اور ان کی شخصیت اور فن پر شائع کتاب کی فہرست کے ساتھ دوہارنگ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

ودیا ساگر آنند کے اردو دوہے کا رنگ امتیاز یہ ہے کہ ان میں جذبے کی صداقت اور بیان حسن جلوہ گر ہے۔ موضوعاتی سطح پر ایک دنیا آباد ہے۔ ان دوہوں میں دوہا غزلوں میں انتخاب الفاظ نے لہجے کی نرمی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ غزل کا لطف اور دوہے کا اثر دوگونا ہوگیا ہے۔ شخصی دوہے مراتب کے لحاظ سے خوب ہیں۔

شوخ رنگ کے گٹ اپ والے اس مجموعے کے ترتیب کار ڈاکٹر فراز حامدی ہیں۔ یقین ہے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی یہ شعری کاوش مقبول ہوگی۔

☆ **کتاب کا نام: سابقات نظم**، شاعر: ساحل احمد، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: تین سو روپے، ناشر: اردو رائٹرس، الہ آباد، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ساحل احمد اردو شعروادب کا ایک معتبر اور توانا نام ہے۔ ان کی شعری ونثری تحریریں ۱۹۵۰ء سے ملک وبیرون ملک معیاری رسائل وجرائد میں شائع ہورہی ہیں۔ ان کو شعر گوئی اور نثر نگاری دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی تصنیفات اہل علم کے درمیان قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اور ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ، اقبال اور غزل، نقد وتحقیق، غزل پس منظر پیش منظر، مطالعہ حالی، مطالعہ مومن اصناف نظم، ادب وعصر، جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، جنگ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ وغیرہ کتابیں ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا روشن نمائندہ ہے۔ ان کے شعری مجموعے سنجیدہ حلقے میں مقبولیت کا سند پاتے رہے ہیں۔ جناب ساحل احمد کا پہلا شعری مجموعہ ''شش جہت'' ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آیا اور ۲۰۰۳ء میں ''نوخیز بستی کی شام'' (شعری مجموعہ) شائع ہوا۔ کل ملا کر ان کے شائع شعری مجموعے کی تعداد تیرہ ہے۔

''سابقات نظم'' ساحل احمد کے مطبوعہ شعری مجموعے کی کتابی صورت ہے۔ اس کے متعلق موصوف نے لکھا ہے کہ ''انہیں یکجا اس لئے کردیا کہ جستہ جستہ مجھ سے ملاقات نہ کرکے یکجا (ایک ہی وقت میں) ملاقات کی سبیل وضع ہو جائے۔ اس طرح اس کتاب کو مطبوعہ مجموعوں کی کلیات بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں شش جہت (۱۹۷۳ء)، ریزۂ گل (۱۹۸۸ء)، برگ نامہ (۱۹۸۹ء)، موسم (۱۹۹۱ء)، جو کچھ لکھتا ہوں سچ لکھتا ہوں ۱۹۹۶ء)، لایعلمون (۱۹۹۶ء)، روشنی لہولہو (۱۹۹۷ء)، دھوپ کچھ کم تھی (۱۹۹۷ء)، کیا ہم سچ بولتے ہیں (۱۹۹۸ء)، شجر خامہ (۱۹۹۹ء)، اقلم (۲۰۰۰ء)، سبزہ نورستہ (۲۰۰۰ء)، نوخیز بستی کی شام (۲۰۰۳ء) مجموعے شامل ہیں۔ تمام مجموعہ کے بارے میں مختصر معلومات درج کرکے مصنف نے تحقیق پسند اذہان کی معاونت کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نثری تحریر پارے سے موصوف کے تنقیدی میلانات اور نظریہ شاعری کی معلومات ہوتی ہے۔

پیش لفظ میں ساحل احمد سے ادبی سفر کا اختصار سے ذکر کرتے ہوئے ''سابقات نظم'' کے بعد غیر مطبوعہ کلام ''باقیات نظم'' کے نام سے شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں پیش لفظ کے عنوان سے موصوف نے مبصروں کی گرفت کی ہے جنہوں نے مختلف کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے ادبی خدمات کو خاطر خواہ پیش کرنے میں تساہلی اور بغض سے کام لیا ہے۔ ساحل احمد صاحب کا احتجاج ذرا سخت ہوگیا ہے۔ کتاب کے آخری چند صفحات میں موصوف کی تصنیفات اور ادبی خدمات پر محیط ہیں۔

مجھے یقین ہے ''سابقات نظم'' ساحل احمد کی شاعری کو اور بہتر طور پر ایک ساتھ سمجھنے میں معاون ہوگی۔ کتاب کے

سرورق پر شمولہ شعری مجموعوں کی عکس بندی دلکش ہے۔ کتاب کی چھپائی اور پیش کش دیدہ زیب ہے۔

☆ **کتاب کا نام: راستے کی بات (شعری مجموعہ)**، شاعر و ناشر: ارمان نجمی، رابطہ: بیلی کوٹھی، محلہ باقر گنج، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴، اشاعت: ۲۰۰۸ء، قیمت: ۱۸۰ روپے۔ صفحات: ۱۷۶، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ڈاکٹر ارمان نجمی کا شمار ان پختہ کار شعراء میں ہوتا ہے جن کی امتیازی وصف کو قاری و ناقد کا اعتبار حاصل ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''مردہ خوشبوؤں کی تلاش'' نے حدیث حیات و کائنات کا ایسا رنگ پیش کیا جو موجودہ منظر نامے سے جدا اور ممتاز سا دکھائی پڑا سو علمی و ادبی حلقے میں ان کی شعری صورت گری قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور فی الوقت وہ اپنی شاعری کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔

'راستے کی بات' غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۱۸ غزلیں شامل ہیں۔ 'راستے کی بات اور میں...' کے عنوان سے شاعر نے تفصیل سے اپنی باتیں رکھی ہیں۔ ڈاکٹر ارمان نجمی کی یہ نثری تحریر نہایت اہم اور عالمی منظر نامے کے سیاق و سباق سے مزین ہے۔ اس میں تاریخی خبر، ملکی و غیر ملکی مسائل، ان سے نبرد آزما انسان اور معاشرے کا حساس ترین فرد فن کار و شاعر کے جذبات و کیفیات نیز شاعری میں مذکورہ نکات کی پیش کش کا جواز اس طرح کھل کر سامنے آیا ہے کہ نثر نگار ڈاکٹر نجمی کی مطالعہ پسندی اور ذہنی افتاد سے فیضیاب ہونا چاہتا ہے۔ انہوں نے سلیس و رواں انداز میں اپنی شاعری اور مختلف مسائل انسانی (اجتماعی و ذاتی) پر اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''...اس کے ذریعہ میں نے اپنے محسوسات و ادراک کو لفظوں کا پیرہن عطا نہیں کیا ہے، بلکہ ان اشعار میں میرے باطن، میرے وجدان اور میری روح کی ناشنیدہ آوازیں بھی گونج رہی ہیں۔ دراصل یہ صرف میرے ذاتی اضطراب اور بے سکونی کے آئینہ دار نہیں ہیں بلکہ ان میں میرے زمانہ اور پرانے عہد کا اضطراب مضمر ہے۔''

مذکورہ سطور پیش کرنے کے بعد یہ کہنے میں آسانی ہو رہی ہے کہ عہد کا اضطراب بیان کرنا کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ ''راستے کی بات'' کا مطالعہ آپ کو کہیں بھی مایوس نہیں کریگا بلکہ تازہ کاری بھری مسرت سے آپ ہر لمحہ سرشار ہوں گے۔ یہ شاعری ایک ایسی شاعری ہے جو خود کو پڑھوانے کی صلاحیت رکھتی ہے اس لئے مجموعوں کی بھیڑ میں آپ 'راستے کی بات' سن کر نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ فکری ابعاد کے کئی گوشے آپ پر منعکس ہوں گے۔ اس مجموعے سے اپنی پسند کے چند اشعار آپ سے شیئر کرتا ہوں:

کیا ستم ٹوٹا کہ خوابوں کا جہاں گم ہو گیا
عالم امکاں میں گویا لامکاں گم ہو گیا

میری اوقات بس اتنی ہے کہ جب جی چاہے
خوش نما لفظوں کی خلقت سے مناتے ہیں مجھے

سچ بول کر وبال کا آزار کون لے
ہر شخص اپنی مصلحتوں کا غلام ہے

دیکھا تو اک جہاں نے تماشا شکستہ کا
لیکن لکھا کسی نے نہ بھی نوحہ شکست کا؟

اک نئی دنیا بسا کر کٹ گئے ماضی سے وہ
لوٹ کر اب اپنے سونے بام و در دیکھے گا کون

شاعر کے اس مجموعے کی تمام تر غزلوں کو دیار غیر کہی گئی بتایا ہے۔ اس صداقت کے باوجود شعر کے انداز کو زمان و مکاں کے قید سے آزاد مانتے ہوئے عمدہ شاعری کی مثال کہوں گا۔ سرورق پر آرٹ دیدہ زیب ہے اور بیک کور پر بزرگ اور ممتاز شاعر مظہر امام کی نپی تلی رائے ڈاکٹر ارمان نجمی کی شاعری کی اہمیت کو درشاتا ہے۔ مجھے یقین ہے 'راستے کی بات' شعری مجموعہ پسند کیا جائے گا اور اہل نقد اس کو سراہیں گے۔

☆کتاب کا نام: اسباق (اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء)، خاص شمارہ ماں کے نام.....مدیر: نذیر فتح پوری، قیمت: ۲۰۰ روپے، رابطہ: سائرہ منزل، 102-B/230 وہان درشن، سنجے پارک، الوہ گاؤں روڈ، پونے، 410032 مبصر: مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

''اسباق'' ایک منفرد و معتبر ادبی جریدہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے سنجیدہ قلم کاروں کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی ہیں۔ اس رسالے کے مدیر باوقار جناب نذیر فتح پوری اپنی عمدہ نثر اور شاعری کے ساتھ اسباق کو علمی و ادبی دستاویز بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔

پیش نظر خاص شمارہ کرۂ ارض کی سب سے مقدس ہستی ماں کے نام..... مختص ہے۔ ایک لفظ ماں ایسی وہ طاقت و تاثیر ہے جس کو جتنا بھی بیان کیا جائے کم ہے کیونکہ ماں..... ماں ہے۔ اس خاص نمبر میں اعزازی مدیرہ کا جہاں اداریہ اور نذیر فتح پوری پر مختصر تحریر اور ان کی کاوش کو ماں کی دعاؤں کا خلاصہ، قرار دینا صداقت پر مبنی ہے۔ گفت باہمی کے عنوان سے اداریہ نذیر فتح پوری کے جذبے کا لفظی روپ ہے۔ ضیاء خاں اور پروفیسر خالد حسین خاں نے ماں کے حوالے سے اپنے خیالات کے اظہار میں تقدس کا خاص خیال رکھا ہے۔ حیدر قریشی کی کتاب سے ماخوذ تحریر ماں کے حوالے سے اردو میں لکھی گئی کتابوں کا ذکر ہے جو اہم ہے۔ اس کے بعد متفرق عنوانات کے تحت بائیس مقالات مشاہیر ادب کے فکر و خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

افسانے کے باب میں چودہ افسانے مختلف سرخی سے ماں کی عظمت کا درس دیتے ہیں۔ پانچ نمائندہ افسانہ نویسوں کے افسانچے اس شمارہ کی زینت ہیں۔ ہندی، روسی، اور مراٹھی افسانے کے تراجم سے دوسری زبانوں میں ممتا کی پیش کا اندازہ ہوتا ہے۔ صفحہ ۲۲۲ سے ۳۰۲ تک شاعری کے رنگ ہیں ماں کا روپ الگ الگ انداز سے دل موہ رہا ہے۔ اس خاص شمارہ کے آخری ادبی حصے میں مشہور اہل قلم کے پندرہ مضامین کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ کل ملا کر یہ خاص شمارہ ماں کے حوالے سے ایک دستاویز سے کم نہیں ہے۔

نذیر فتح پوری نے جس محبت اور جذبہ سے اس شمارے کو ترتیب دیا ہے، بیشک یہ کہنے میں عار نہیں کہ انہوں نے ماں کی ممتا اور عظمت کو بطریق احسن اسباق کے صفحے پر اجاگر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ گو کہ اس سے قبل بھی 'ماں' کتابوں کے ذریعہ قارئین کے دلوں میں روشن ہوتے رہے ہیں مگر یہ خاص نمبر موضوعاتی تنوع دلکش پیش کش کی بنا پر اگلا قدم ہے۔ اسباق کا یہ شمارہ ہر ایک اہل علم کے پاس ہونی چاہئے۔ مجھے یقین ہے اس کی خوب خوب پذیرائی ہوگی اور اسی بہانے ماں دلوں میں قائم و دائم ہوگی۔ انتساب کے یہ اشعار کتنے بامعنی ہیں دیکھئے:

دعاؤں کے صحیفے پڑھ رہا ہوں　　عبادت کے طریقے پڑھ رہا ہوں
مجھے یاد آ رہی ہے اپنی ماں کی　　میں ممتا کے وظیفے پڑھ رہا ہوں

☆کتاب کا نام: تعیین و تدریس (مضامین)، مصنفہ: ڈاکٹر شیریں حسنین، اشاعت: ۲۰۱۰ء، ناشر: حسنین اشاعت گھر، روڈ نمبر ۱۵، جواہر نگر، آزاد نگر، جمشید پور، قیمت: ۲۵۰ روپے، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ڈاکٹر شیریں حسنین شعبۂ اردو، پوسٹ گریجویٹ ورکرس کالج، جمشید پور میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ زبان و ادب سے دلچسپی انہیں ورثے میں ملی ہے۔ مطالعہ پسندی اور ادبی گھریلو ماحول سے ان کو خوب سے خوب تر کرنے کی طاقت ملی ہے۔ تعیین و تدریس ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جسے انہوں نے تنقید لکھنے سے گریز کیا ہے جبکہ مضامین کے مطالعے سے ان کی تنقیدی افکار کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ انہوں نے بنام جہاں دار جاں آفریں' کے عنوان سے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ: ''میں نے

جب خود تدریسی زندگی اختیار کی تو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ طلبا اور طالبات اب محنت کرنا نہیں چاہتے اور نوٹس لکھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بازار میں نہایت ہی لچر قسم کے گیس پیپر دستیاب ہیں جن سے ذہن روشن کیا ہوگا گمراہی اور بڑھ جائے گی۔"

اس حقیقت بیانی کے تناظر میں تعیین و تدریس کے مضامین کارآمد ہیں۔ مشمولہ ۲۷ مضامین درسیات کے وہ عنوان ہیں جن کا جاننا ادب کے طالب علموں کے لئے ناگزیر ہے۔ امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ملا وجہی، ولی دکنی، سراج دکنی، میر، غالب، مومن، ایسے اسمائے گرامی ہیں جن کے فکر و فن کا غائر مطالعہ ادب کی بنیادی معلومات تصور کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اصناف ادب، فن اور تاریخ کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مصنفہ نے داستان، تنقید، غزل، نظم، مثنوی، ڈرامہ، مرثیہ اور افسانے کے ارتقا پر مضامین قلم بند کرتے ہوئے مشاہیر قلم کار کی آراء کو پیش نظر رکھا ہے۔ ارسطو کی بوطیقا، خالق باری، معراج العاشقین، قطب مشتری کے مطالعے کا نچوڑ محترمہ شیریں حسنین کی علمی و ادبی استعداد اور غور و فکر کا پتہ دیتا ہے۔

مصنفہ کی حقیقت بیانی اور منکسر المزاجی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ورنہ تنقید لکھنے کا دعویٰ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ "میں کوئی نقاد نہیں ہوں" "تعیین و تدریس" جیسی مفید کتاب قارئین ادب کے حضور پیش کرنا نیک فال ہے۔ یہ الگ گفتگو ہے کہ مضامین میں کن کن تنقیدی نکات کو نگاہ میں رکھا گیا ہے۔ ان مضامین کو صرف اور صرف طالب علموں کا کہنا ناانصافی ہوگی۔ ادب پڑھنے والے ان موضوعات کو نہ تو کبھی درسی سمجھتے ہیں نہ ہی اس سے دامن جھاڑتے ہیں۔

کتاب کا سرورق جدید آرٹ میں رنگوں کے کمال سے مملو ہے۔ فلیپ پر احمد بدر اور رضوان واسطی کی تحریریں ہیں۔ جبکہ بیک کور پر سید احمد شمیم نے کتاب اور مصنفہ کا بہترین محاکمہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی خوب خوب پذیرائی ہوگی۔

☆ **کتاب کا نام: سفر روشنی کا** (شعری مجموعہ)، شاعر: علاء الدین حیدر وارثی، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، ناشر: جاوید حیدر وارثی، وارثی کالج، بی بی پاکر، دربھنگہ، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

علاء الدین حیدر وارثی کی شاعری ان کے دردمند اور معصوم دل کی آواز ہے۔ وہ سادگی کے ساتھ حدیث دل کہنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ "سفر روشنی کا" ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اس پیش کش سے قبل "عکس جمال" (۲۰۰۲ء)، قربت کی خوشبو (۲۰۰۷ء)، اور ریگ زار حیات (۲۰۰۸ء) شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، ان مجموعوں نے علاء الدین حیدر وارثی کی شاعری کو مقبول عام بنانے میں مدد کی ہے۔

پیش نظر مجموعۂ شاعری میں نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ سفر آشنا میں لکھتے ہوئے شاعر نے بہت کم عرصے میں اس مجموعہ کے بیشتر حصے کو موزوں ہونے کی بات کی ہے جو ان کی افتاد طبع اور خلاقانہ صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔ نظمیہ حصے میں دشت بیکراں، اور روح انس و جان کے عنوان سے ان کی تخلیق متاثر کرتی ہے۔ شخصیات کے حوالے سے مشمولہ نظمیں سادگی اور جذباتی وابستگی کو ظاہر کرتی ہیں غزلوں کے انتخاب میں شاعر نے قاری کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں روحانی کیف کی جلوہ گری بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ عارفانہ خیال، جمالیاتی حسن اور سبک الفاظ کے سہارے اپنا سفر شروع کرتے ہیں اور اس منزل کی جانب کامیاب گذر جاتے ہیں جو اچھی شاعری کی خاصیت ہوتی ہے۔ عصر کی پیچیدگی بھی ان کے یہاں موجود ہے کل ملا کر ان کا سرمایہ شاعری وافر اور اطمینان بخش دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اشعار سر دھننے کے لئے نہیں بلکہ دلوں کو راحت دینے کے لئے ہیں:

عہد طفلی میں ہی بچے ہوگئے ہیں ہوش مند　　کیا سبب ہے بن پڑھے بھی وہ گیانی ہوگئے

ہے ضیا بار روشنی دل کی ظلمت شب مٹا رہا ہے کوئی

تصویر کسی دل میں اترتی ہے کہ تو ہے شبنم کبھی پھولوں پہ برستی ہے کہ تو ہے

ڈس لیا جس نے یہاں اس کو ابھی آستیں میں وہ پلا ہے دیکھئے

بصارت سے بصیرت کا سفر آسان ہوجائے میسر ہو اگر آنکھوں کو نور بے حجابانہ

تمازتوں کو ملے کوئی چھاؤں اب حیدر جھلتے جسم کو سائے ہی کام آتے ہیں

سکوتِ شب میں جب دل کوئی جلاتا ہے نئی حیات کی وہ تیرگی مٹاتا ہے

یہ مجموعہ علاء الدین حیدر وارثی کی شاعری کا اگلا کامیاب قدم ماننے میں کوئی عار نہیں ہے۔ اس کے سرورق کا عکس خوبصورت اور عنوان بامعنی ہے۔ فلیپ پر وارث کرمانی اور فیروز کی نپی تلی رائے سے شاعر کی خوبیوں کا علم ہوتا ہے۔ بیک کور پر شاعر کی فل اسکیپ تصویر نفیس وجاذب نظر ہے۔ امید ہے سفر روشنی کا ادبی حلقے میں اعتبار پائے گا۔

☆ کتاب کا نام: پشتارہ (شعری مجموعہ)، شاعر: شاہین، اشاعت: ۲۰۱۰ء، قیمت: ۲۵۰ روپے، ناشر: شمالہ پبلیکیشن، کینیڈا، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

''پشتارہ'' شاہین کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے چار شعری مجموعے ''بے نشان'' ''رگ ساز'' ''دہلیز پر پھول'' اور ''کھلا دروازہ'' وغیرہ شائع ہوچکے ہیں۔ شاہین ان شعراء میں سے ایک ہیں جن کے یہاں نئی فکر اور بیان کا نیا لہجہ موجود ہے۔ شاہین کے لفظوں کا انتخاب ایسا معنی خیز ہوتا ہے کہ نہ صرف چونکانے والی کیفیت ہوتی ہے بلکہ دیر تک اس کے معنی ومطالب اور استعمال کی چابکدستی اپنے سحر میں لیے رہتی ہے۔ ان کے تجربات کی فراوانی ہے۔ انہوں نے ہندوستان، بنگلہ دیش، پاکستان اور کینیڈا کی زندگی کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ جیا بھی ہے۔ ایک فن کار کے لئے یہ سرمایہ سے کم نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاہین کے موضوعات ملک کی سرحدوں میں قید نہیں بلکہ آفاقی وعالمی صورت وشکل کی جلوہ گری ان کی شاعری میں خاص رنگ ہے۔

''پشتارہ'' میں صرف نظمیں ہیں جن کی تعداد ایک سو تینتیس (۱۳۳) ہے۔ ان میں کچھ طویل بھی ہیں چند مختصر ترین بھی۔ کفایت لفظی کا انداز شاہین پر خوب پھبتا ہے۔ ان کے تجربات کا شعری اظہار کئی رنگوں میں ہوا ہے۔۔ میں ایک جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہاں معصوم جذبات کا پختہ رنگ دوسرے سے منفرد ہے۔ جس سے قاری کا ہر طبقہ محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ سکتا ہے۔ جب کہ شاہین کی شناخت ان کے ڈکشن اور جدید ترین موضوعات سے ہے۔ نظم'' کچی املیاں'' دیکھئے: تم جو نو گے رتوان کے کھٹے میٹھے خواب سب بجھ جائیں گے/زندگی کا سلسلہ جب تک رواں ہے/آرزو جب تک جواں ہے/لڑکیاں رکھاتی رہیں گی یونہی کچی املیاں

اس طرح رشتۂ گل ومہتاب، ''اس نے کہا تھا''، ''خوابوں کو سمیٹے چلے ہیں''، ''محبت چال چلتی ہے''، ''سکہ پانی اور ستارہ''، ''واپسی'' وغیرہ نظمیں دل کو گدگداتی ہیں، آہ بھرواتی ہیں اور آسودگی ذہن ودل کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ''پشتارہ'' پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آواز کانوں میں اپنے پن کا بول سنا کر قربت کا جال بچھا رہی ہے۔ مجموعہ کے آخر میں ''خبر رساں کی کسی اک غلط بیانی پر'' کے عنوان سے شاہین نے اپنے حالات وکوائف قلمبند کیے ہیں۔ جس سے ان کی زندگی اور ادبی پیش رفت کا علم ہوتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا مضمون ''شاہین کی شاعرانہ پرواز'' کے عنوان سے پشتارہ میں شامل ہے۔ انہوں نے شاہین کی شاعری بالخصوص پشتارہ کی خوبیوں کو سراہا ہے۔ میں، شاہین اور ان کی شاعری کے سرنامے

سے صبا اکرام نے شاہین کی نظموں سے بحث کرتے ہوئے انہیں منفرد شاعر قرار دیا ہے۔ سرورق پر آرٹ دلکش ہے اور بیک کور پر مشاہیر کی آراء کو جگہ دی گئی ہے۔ فلیپ پر علی حیدر ملک کی مختصر تحریر اور دوسری جانب مسکراتے ہوئے سید ولی عالم شاہین کی تصویر اچھی پیش کش ہے۔ یقین ہے کینیڈا کی یہ مطبوعہ کتاب پسند کی جائے گی۔

☆رسالہ کا نام: مخزن ۹، مرتب: مقصود الٰہی شیخ ، ناشر: یاسمین عادل، رابطہ: پارک ہل ڈرائیو، بریڈ فورٹ، BD8,DF(UK)، اشاعت: فروری مارچ ۲۰۱۰ء، مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، دربھنگہ

ادبی مجلات کا شائع ہونا عام سی بات ہے مگر واضح نصب العین کے ساتھ پرورش علم و ادب کا فریضہ انجام دینے کی خاطر اسے جلا دینا اور جاری رکھنا مشکل کام ہے۔ اس مشکل مرحلے کو جناب مقصود الٰہی شیخ نے اپنے ادبی صحافتی تجربے سے آسان کرلیا ہے۔ ان کی حیثیت ایک ایسے بزرگ کی ہے جو گلے سے لگانے اور حوصلہ دینے کو اپنا ادبی فریضہ سمجھتے ہیں اور تربیت کے کارگراں کو خوش اخلاقی سے انجام دیتے ہیں۔ زبان و ادب کی خدمت کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے ''راوی'' کی اشاعت بند ہونے کے بعد انہوں نے ''مخزن'' جاری کیا تو اسے ہندو پاک اور مغربی ممالک کے ادباء و شعراء کے درمیان ایک پل کے طور پر پیش کیا جو خوشگوار رابطے اور تنقید و تعارف کے نئے سفر کو آگے بڑھانے میں معاون ہوا۔

''مخزن'' کا نواں شمارہ ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مشمولات میں تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ فہرست کو خوبصورت عنوان ''کہکشاں'' دیا گیا ہے اور اسے حروف تہجی کے اعتبار سے آراستہ کیا گیا ہے۔ آغاز کے عنوان کے تحت علامہ بشیر حسین ناظم کی حمد و نعت کے بعد محترمہ طلعت سلیم، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، محمد فیاض عادل فاروقی اور پرویز محسن احسان کی نعتیں بھی پر اثر ہیں۔ اثر فاروقی کا طویل مکتوب شمارہ ۸ کے مطالعہ پر مبنی ہے جب کہ آفرین کا دوسرا خط محمد احمد سبزواری کا ہے۔ انھوں نے اختصار سے کارآمد باتیں کی ہیں۔ ''اردو زبان و ادب و لسانیات'' کے روشن ستارے محترمہ آصف جیلانی کا مضمون ''اردو پہ ترے آکے عجب وقت پڑا ہے'' موجودہ ادبی صورت حال کو بیان کر رہا ہے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان نے اپنی مختصر سی کہانی (حالات زندگی) بیان کرتے ہوئے اور اور صوتیات کے تعلق سے نہایت کارآمد بحث کو قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ شباب ظفر اعظمی نے فکشن پر بحث کام کیا ہے۔ مخزن کے لئے ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی پیش کاری میں ان کا مضمون ''اردو ناول کی اسلوبیات'' معلوماتی اور استدلالی ہے۔ ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے اپنے مضمون میں شعرائے مغرب کی نظمیہ شاعری سے گفتگو کرتے ہوئے مخزن کو مرکز میں رکھا ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے دیار مغرب میں ہو رہی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں نعت گوئی کے فن پر علمی اظہار نے مضمون کو اور بھی افادی بنا دیا ہے۔ افسانیہ کے باب میں احمد صفی، صفیہ صدیقی، ڈاکٹر عمران مشتاق، جاوید اختر پاشا، قاضی مشتاق احمد، مجیر احمد آزاد، محسنہ جیلانی، مقصود الٰہی شیخ، منشا یاد، نجمہ عثمان اور نعیمہ ضیا الدین کی تخلیقات کہیں متحیر کرتی ہیں تو کہیں سکون دل کا جواز بنتی ہیں۔ یہ افسانے موضوع کے اعتبار سے پختگی اور بنت کاری اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے عمدہ ہیں۔ اس باب کی خاصیت افسانہ نگار کی تخلیقات پر اہل نقد کے مضامین ہیں۔ مرتب خود بزرگ افسانہ نگار ہیں اس لئے افسانوی رنگ نکھرا ہوا ہے۔ اختر شاہجہاں پوری، ڈاکٹر حسن شکیل مظہری اور سحر انصاری کی شاعری سے حظ حاصل کرنے کے لئے دعوت مطالعہ ہے۔ ساقی فاروقی کی غزلوں کے منتخب اشعار اور نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ امجد مرزا نے ''لندن کا نیا ادبی منظر نامہ'' لکھتے ہوئے وہاں کے معروف قلمکاروں کو بطریق احسن متعارف کرایا ہے۔ ''بھول پاس آنکھ'' میں مخزن کے سوال و جواب مضامین و مکتوب کی شکل میں گزشتہ شمارے کی گونج ہے۔ مخزنیات کے باب میں مخزن ۸ پر آٹھ تبصرے اور چند منتخب خطوط سے اس کی مقبولیت اور ادبی معیار بندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذہبیات کے صفحہ پر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی قاری شریف احمد، اسرار ایوبی کے مضامین دلوں کو روشن کرتے اور مذہبی امور کی جانکاریاں فراہم کرتے ہیں۔ مذہبی مسائل پر مولانا محمد یوسف لدھیانوی کے جوابات معلومات میں اضافے کا سبب ہیں۔ ''جانے والوں کی یاد'' اس سلیقے

سے آراستہ ہے کہ مرحومین کے بارے میں بھرپور تاثر ابھرتا ہے۔ یہ حصہ عام تحریتی تحریر نہیں بلکہ ادبی شیرینی اور حسن الفاظ کی مثال ہے۔ سرورق واقعی دعا عباس کی ماہرانہ آرٹ کا نمونہ ہے۔ بیک کور پر تصویریں مرتب کے حسن ذوق و جمال کا پتہ دیتی ہیں۔ مجموعی طور پر مخزن تو ایک مکمل جریدہ ہے۔ ادبی رسائل میں یہ منفرد اور کئی جہتوں سے ممتاز ہے۔ رب سے التجا ہے کہ وہ مقصود الہی شیخ کو اس عمر میں جوان بنائے رکھے اور مخزن ان کی کاوشوں سے ادبی تاریخی دستاویز بنا رہے۔

☆ **کتاب کا نام: جمال ہم نشیں (ہندوپاک کے مشاہیر شعرا کی غزلوں پر تضامین)**، شاعر: خالد رحیم، اشاعت: ۲۰۰۹ء، مطبع: عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، قیمت: ۱۵۰ روپے، مبصر: محمد جابر زماں، جے این یو، نئی دہلی

تضمین شاعری کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ کسی کے مصرعے پر مصرع شعر لگانے کو تضمین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ ایک شعر پر مصرع یا ایک شعر لگا کر مثلث بنانا۔ اس طرح ایک شعر پر تین مصرعے لگا کر مخمس بنانے کو بھی تضمین کہا جاتا ہے۔ فنی سطح پر یہ ایک مشکل امر ہے لیکن فنی قدرت کو تسلیم کروانے کا ذریعہ بھی ہے۔ تضمین میں شعر کی داخلی کیفیت اور اس کے مفہومیاتی تفاعل کو مدنظر رکھتے ہوئے مصرعوں کو تضمین کے شعر یا مصرعے میں اس طرح پیوست کرنا ہوتا ہے کہ ان میں کوئی فرق اور بعد محسوس نہ ہو۔ تضمین کی روایت بھی فارسی شاعری سے آئی، غلام حسین امیر خانی نے سعدی کی تضمین گل چین سعدی کے نام سے مجموعہ مرتب کیا۔ اردو میں بھی تضمین کی مستحکم روایت رہی ہے، کئی شاعری ہی میں اس کے نمونے ملنے شروع ہوجاتے ہیں اور میر وغالب کے بعد تو یہ عام چلن ہوگیا، صبا اکبرآبادی اور مرزا اسہار نپوری نے تو دیوان غالب کی تضمین کر ڈالی۔

زیر تبصرہ کتاب کا تعلق بھی تضمین سے ہے اس کے مصنف خالد رحیم ہیں، اس کے لئے انہوں نے ہندوپاک کے مشہور شعراء کی غزلوں کا انتخاب کیا ہے اس فہرست میں میر سے لے کر معاصر شعرا شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مشاہیر کے انتخاب میں خالد رحیم کے اپنے ادبی ذوق کا زیادہ دخل ہے۔

خالد رحیم نے جس انداز میں تضمین کی ہے وہ خوب ہے۔ جیسے میر کی ایک غزل پر خالد رحیم کی تضمین دیکھئے:

حسرتوں کے جہاں سے اٹھتا ہے
شوق کے آشیاں سے اٹھتا ہے
کچھ یہاں کچھ وہاں سے اٹھتا ہے

"دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے"

اسی طرح مظہر امام کی غزل پر تضمین ملاحظہ ہو:

سفر میں اکیلا ہے کس واسطے
تلاطم نے گھیرا ہے کس واسطے
انا سر کشیدہ ہے کس واسطے

"غرور سفینہ ہے کس واسطے
خفا موج دریا ہے کس واسطے"

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خالد رحیم نے جس ڈھنگ اور فنی خصائص کو مدنظر رکھتے ہوئے تضمین شاعری کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ خالد رحیم نے تضمین کو اس طرح برتا ہے کہ صنفی تبدیلی ہونے کے باوجود غزلیہ جوہر باقی رہتا ہے، کتابت وطباعت معیاری ہے۔

☆کتاب کا نام: محمد خالد عابدی: ایک مطالعہ، مرتبین: ڈاکٹر رضیہ حامد، رہبر جونپوری، اشاعت: ۲۰۰۷ء، طباعت: بھوپال پرنٹرس اینڈ پبلشر 36 تلیا، بھوپال، قیمت: ۳۰۰روپے، مبصر: محمد جابر زماں، جے این یو نئی دہلی

محمد خالد عابدی پروگرام اگزیکیٹیو کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو، بھوپال سے متعلق ہیں، لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایک تخلیق کار اور فن کار کی ہے۔ انہوں نے ڈرامے، افسانے، طنز و مزاح کے ساتھ تحقیق کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ یوں تو ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا لیکن انہوں نے بہت جلد اپنی ڈگر تبدیل کرلی کیونکہ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے، والا معاملہ تھا جن مسائل پر انہیں اظہار خیال کرنا تھا اس کی لئے نثر ہی مناسب ذریعۂ اظہار تھی۔

محمد خالد عابدی: ایک مطالعہ، در اصل ان کی علمی خدمات کے خراج کی ادنیٰ کوشش ہے۔ اس کتاب میں خالد صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق مختلف اصحاب علم و قلم کی تحریروں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ قسم اول میں نثری مضامین میں ان کی شخصیت اور مشاغل سے متعلق پوشیدہ نکات کو روشن کرنے کی کوشش ملتی ہے، اس حوالے سے ابراہیم یوسف، رفعت سروش، شفیقہ فرحت اور عبدالقوی دسنوی وغیرہ کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ڈھیر سارے مضامین ہیں جو کسی نہ کسی سطح پر ان کی خدمات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ قسم دوم میں منظوم خراج عقیدت شامل ہے۔ جس میں کل نو شعرا کا کلام ہے۔ رہبر جونپوری کی نظم، صنعت توشیح میں لکھی گئی ہے اس کے باوجود اپنے فنی انسلاک میں کسی بھی طرح کم محسوس نہیں ہوتی، لیکن صابر ادیب کی نظم جس میں صنعت شجرہ کا استعمال ہوا ہے صرف اپنی ہیئت کذائی اور صنعت کی بنا پر قابل ذکر ہے۔ قسم سوم میں خالد عابدی کی تخلیقات ونگارشات کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس میں ڈراما، افسانہ، تحقیق اور مزاح نگاری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اس حوالے سے اخلاق اثر، تخلص بھوپالی، رضیہ حامد، رام لعل، یوسف ناظم، سید حامد حسین اور عبدالقوی دسنوی وغیرہ کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ جو ان کے فنی و فکری نقوش کو اجالتے ہیں۔ قسم چہارم میں خالد عابدی کی تصانیف پر جو تبصرے اور تاثرات شائع ہوئے تھے انہیں یکجا کردیا گیا ہے۔ قسم پنجم میں خالد عابدی کے چار انٹرویوز بھی شامل کیے گئے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ فنکار کا اپنے بارے میں کیا رویہ ہے۔ خالد عابدی نے ایک اچھی خاصی ذاتی لائبریری جمع کر لی ہے، قسم ششم کی چاروں تحریریں ان کے شوق مطالعہ اور کتابوں سے شغف کو واضح کرتی ہیں۔ اس کے بعد لائبریری کی visit کرنے والے متعدد اہل علم اور ریسرچ اسکالرز کے تاثرات شامل کیے گئے ہیں۔ آخر میں ان کے فلمی مضامین پر گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب میں خالد عابدی کے سوانحی کوائف سے متعلق ایک خود نوشت مضمون بھی شامل ہے۔ چند ایک ہندی مضامین شامل اشاعت ہیں۔

بنیادی طور پر یہ کتاب ایک سنجیدہ کوشش ہے جو خالد عابدی کو سمجھنے میں قاری کی مدد کرتی ہے۔ ترتیب جو بظاہر آسان کام ہے لیکن یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے، جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ کتاب کے مرتبین میں ڈاکٹر رضیہ حامد اپنے تحقیقی مقالے نواب صدیق حسن خاں، سے ہی اپنی شناخت بنا چکی تھیں، ایسے ہی سنجیدہ افراد سے اس طرح کے کام کی امید بھی ہوتی ہے۔ رہبر جونپوری بھی ادب سے بہ حیثیت تخلیق کار وابستہ ہیں۔

☆کتاب کا نام: وہاب اشرفی کی تنقید نگاری، مصنف: ڈاکٹر نسیم احمد راہی، صفحات: ۲۶۳، اشاعت: ۲۰۰۶ء، قیمت: تین سو روپے، ناشر: کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، دہلی، مبصر: امتیاز سرمد، جے این یو نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر نسیم احمد راہی کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر ونوبھاوے یونیورسٹی (ہزاری باغ) نے انہیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس کتاب میں وہاب اشرفی کی تنقیدی نگارشات کا فنی محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ وہاب اشرفی آج چند

سربرآوردہ اور کثیرالجہات نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کی شخصیت میں شامل عناصر، ان کے ادبی نقطۂ نظر، ان کی تنقید پر پڑنے والے اثرات، ان کے معاصرین اور ان کے اسلوب وغیرہ سے واقفیت حاصل کریں۔ یہ کتاب ان تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔

مصنف نے کتاب کی ابتدا میں وہاب اشرفی کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے حوالے سے اجمالی گفتگو کی ہے۔ ''وہاب اشرفی کی تنقیدی نگارشات'' اس باب کے چار حصے ہیں، پہلے میں وہاب اشرفی کی آٹھ تنقیدی کتابوں پر قدرے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے میں قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ، شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری اور قاضی عبدالودود کے مشمولات کی خصوصیات اجاگر کی گئی ہیں۔ تیسرا حصہ ان کتابوں کے لیے مختص ہے جن کا تعلق تنقید و ترتیب کے ساتھ نصابی کتابوں سے بھی ہے۔ اس ضمن میں 'کہانی کے روپ'، 'تفہیم البلاغت'، 'کاشف الحقائق'، 'بہار میں اردو افسانہ' کے ساتھ نو کتابیں شامل ہیں۔ چوتھا حصہ وہاب اشرفی کی معروف تصنیف، تاریخ ادبیات عالم کے جائزے پر مبنی ہے۔ جس کا رشتہ نہ صرف تاریخ سے ہے بلکہ تحقیق و تنقید سے بھی ہے۔

صاحب کتاب نے وہاب اشرفی کے معاصرین کے حوالے سے بھی کسی قدر گفتگو کی ہے۔ اس کے باوجود منظر نامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ موصوف نے اپنے بزرگوں سے کس طرح استفادہ کیا، کن لوگوں سے چشمک رہی، کن کے تصورات کو قبول اور کن لوگوں کو رد کیا اور اپنے لیے کون سی راہیں نکالیں۔ وہاب اشرفی کے اسلوب کی جو خصوصیات کتاب میں پیش کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی تحریر مختصر اور جامع ہے اور متعلقہ موضوع کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب وہاب اشرفی کی تنقیدی نگارشات کی تفہیم میں معاون ہے۔ ساتھ ہی وہاب اشرفی کی نگارشات کے متنوع پہلو بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ کتاب میں ایک کمی کھٹکتی ہے وہ یہ کہ صاحب کتاب نے وہاب اشرفی کی تنقید کے حوالے سے جو تھیس قائم کی ہے وہ غیر واضح ہے۔ موصوف کے تنقیدی تفاعل، ان کے طریق کار، ان کی تنقیدی شناخت وغیرہ پر مزید تفصیل کی ضرورت تھی۔ بہرکیف مظہر امام اور پروفیسر عتیق اللہ جیسے اہم نقادوں نے اس کتاب پر اپنی قیمتی آرا دی ہیں اور صاحب کتاب کی کاوش کو مستحسن قرار دیا ہے۔

☆☆☆

علاقے کی معروف شخصیت ڈاکٹر **محمد اظہار الحسن عرف بچہ بابو** کا انتقال ۲۶ رنومبر ۲۰۰۹ء کو ہوگیا اور انہیں شکرپور قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم پندرہ برسوں سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ مرحوم بے حد خلیق، خوش گفتار اور خوش اخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں اسلامی تاریخ اور عالمی سیاست سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کی علالت کی وجہ سے ان کے صاحبزادے ظفر انور شکرپوری دوبئی سے واپس آکر ان کی تیمارداری میں لگے رہے۔

کامریڈ جناب **عبدالسلام** کا ۱۶ رجنوری ۲۰۱۰ کو انتقال ہوگیا۔ وہ جالے اسمبلی حلقے سے سی۔ پی۔ آئی کی نشست پر دوبار ایم۔ ایل۔ اے۔ رہے۔ عوام سے بطور خاص اور اپنی پارٹی سے وابستہ افراد کے لئے وہ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ان کا وطن موضع شکرپور بھرواڑہ، دربھنگہ تھا۔

راہ و رسم

☆ **پروفیسر مختار الدین احمد:** (علی گڑھ) تمثیل نو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ مولانا آزاد پر اچھا خاصا مفید مضامین کا گوشہ آپ نے شائع کر دیا ہے۔ نظیر صدیقی کے ۲۶ خطوط آپ نے شائع کر دیے ہیں۔ مناسب ہوگا اگر بقیہ خطوط کے ساتھ انہیں کتابی شکل میں شائع کرائیں۔ اس طرح یہ محفوظ بھی ہو جائیں گے اور ان سے کوئی استفادہ کرنا چاہے تو اس کے لیے آسان ہوگا۔ پروفیسر سید منظر امام سے ان کی سرگزشت تفصیل سے لکھوایئے۔ ش م ماہر آروی کے پاس ان کے عہد کے پرانے ادیبوں اور شاعروں کے متعلق بہت معلومات ہوں گے۔ ان سے صرف مرحومین پر مضامین لکھوایئے۔ پہلے مولانا عبدالمالک آروی اور عبدالقادر سحر آروی پر ان سے مضامین طلب کیجیے۔ آپ کے قارئین کو دلچسپی ہو تو آپ صوبہ بہار اور دوسرے مقامات کے شعراء و مصنفین کے غیر مطبوعہ خطوط حاصل کر کے الگ خاص عنوان کے تحت شائع کرنا شروع کریں یہ بہت مفید علمی و ادبی کوشش ہوگی۔

(ان کا انتقال ۳۰؍ جون ۲۰۱۰ء کو ہو گیا۔)

☆ **ڈاکٹر ایم ہاشم قدوائی** (سابق ممبر راجیہ سبھا)، نئی دہلی: تمثیل نو کا اپریل تا جون ۲۰۰۹ء کا شمارہ موصول ہوا باعث صد مسرت ہوا۔ آپ کا موقر مجلہ حسن طباعت اور کتابت کا مرقع ہے۔ ان ظاہری محاسن اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس شمارے میں نابغۂ عصر یگانۂ دہر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد جو اعلیٰ پائے کے مفکر، مدبر اور ممتاز ترین عالم دین تھے کے عہد ساز کارناموں پر اور ان کی درخشاں اور تابناک زندگی کے گوشوں سے متعلق بڑے ہی گراں قدر مضامین تھے جس سے پوری طرح مستفید ہوا۔

ان مضامین کی اشاعت پر نہ صرف میری طرف سے بلکہ حضرت امام الہند کے بے شمار عقیدت مندوں کی طرف سے دلی تہنیت اور مبارک باد قبول فرمائیں۔

عہد اسلامیہ میں دربھنگہ ایک نئے جہان کی بازیافت، ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ'' اور تبصرے بھی بہت زیادہ پسند آئے۔

☆ **سید احمد شمیم**، جمشید پور: ''تمثیل نو'' شمارہ ۷۔۸ کافی معیاری اور دستاویزی ہے۔ ابوالکلام آزاد پر کئی مضامین اچھے لگے خصوصاً مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر سنبھال کر رکھنے کی چیز ہے کہ مولانا آزاد کے بارے میں جاننے والوں کو آئندہ بھی کام دے گی۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ اشتیاق سے پڑھتا ہوں مجھے کچھ کہنا ہے، ادبی اور ثقافتی خبریں، وفیات یہ سب آپ کی محنتوں کا ثمرہ ہیں ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں عین اسٹریم کا آدمی تو نہیں ہوں ان کے ذریعے واقف ہو جاتا ہوں۔ علاوہ ازیں تبصرے اور خطوط سے بھی میری دلچسپیاں ہیں۔ اپنے دوست (سید منظر امام) کی تحریر یہ سرگزشت ہی ہے ضرور پڑھتا ہوں۔ انہوں نے اپنے سسر (جنہیں میں کچو بھائی کہتا تھا) کا ذکر کر کے تو میری آنکھیں بھی نم کر دیں۔ کیا خوش اخلاق خوش رو آدمی تھے۔ عظیم آباد کے قدیم رکھ رکھاؤ کا چلتا پھرتا نمونہ ان کے خاندان میں ان سے زیادہ دلکش چہرہ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ جب ہم لکھنؤ میں ملازم تھے تو ہم دونوں ایک ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ فساد ۹۷ء سے پہلے کا ایک واقعہ بہت اہم ہے میری زندگی میں، ہوائیں گرم ہو چکی تھیں وہ میرے گھر آزاد نگر روڈ نمبر۔۱ میں تشریف لائے۔ گھریلو باتوں کے ضمن، تردد کے ساتھ کہنے لگے کہ چند ماہ بعد ہی ملازمت سے سبکدوش ہونا ہے۔ کہنے لگے شاہین تو خیر

مزے میں ہے مگر ان تین بچوں کا کیا ہوگا۔ میں نے تسلی دی اللہ مالک ہے۔ منظر امام کا یہ جملہ مجھے تڑپا گیا۔ "وقت اور حالات کی نامہربانیاں کبھی کبھی مہربانیاں بھی بن جاتی ہیں"۔ اور نامہربانیاں مہربانیاں بن گئیں آگے کیا لکھوں؟ البتہ ایک بات عرض کرنی ہے۔ وہ یہ کہ میں زکی انور بھائی کا فین کبھی نہیں رہا۔ ہاں بھائی جان کے دوست تھے، پر ہمارے استاذ ہوئے اور تب کلنگ۔ میرا خاکہ ان پر شائع ہو چکا ہے۔

بڑے بھیا (حسن امام درد) کا کہنا غلط نہیں ہے۔ مجھے لکیروں کی صدا کے لئے دوسرا مضمون لکھنا چاہئے تھا۔ مگر اس کی اشاعت کیسے ہوئی کیا بتاؤں ان کے ایک یار غار تین برسوں تک مسودہ اپنے پاس رکھے رہے۔ پھر بھابی (اہلیہ) شیدا چینی نے مجھے بلوایا اور اس کا بہانہ ایک شعری نشست بنائی گئی۔ میرے ہاتھ پکڑ گلوگیر آواز میں کہنے لگیں تمہارے دوست کا مجموعہ شائع نہیں ہوگا؟ سو میں تیار ہو گیا۔ وقت صرف ایک ماہ ان کے لڑکوں نے مجھے دیا اور مسودے کا عالم از حد ابتر تھا۔ شمس فریدی آدھا مضمون لکھ کر جرمنی چلے گئے۔ آدھا بعد میں مکمل ہوا۔ میرے پاس وقت کہاں تھا کہ نیا مضمون لکھتا۔ یہ بھی کہنا غلط نہیں کہ شیدا چینی امکانات سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ وہ بہت پہلے نکل گئے تھے۔ امکانات تو کہانی ختم ہونے سے پہلے تک رہتے ہیں کوئی ۳۰ برسوں سے انہوں نے لکھا ہی کیا؟ اللہ کا فضل ہے کہ اب تک زندہ ہیں۔ مگر لکھنا کہاں؟ کلیم عاجز کی کہانی ان کی اور میری زبانی ش۔ م۔ ماہر آروی نے بڑی خوبصورتی سے بیان کی ہے۔ کلیم عاجز کا میں قدرداں ہوں اور تلہاڑہ سے آشنا بھی کہ میرے گاؤں شاہو بیگھ سے وہاں رشتہ داریاں ہوا کرتی تھیں۔ وہاں کی آنچ ۴۷ء میں شاہو بیگھ تک پہنچی تھی اور میری ایک خالہ نہایت خوبصورت اور نوعروس شہید ہوئی تھیں۔ اپنی خالہ تو نہیں تھیں مگر بہت قریبی خالہ تھیں۔ شاہو بیگھ کے سادات حضرت عبداللہ بخاری کے خاندان سے تھے اور ہیں، بہت سے بکھر گئے، کچھ ہجرت کی کچھ رخصت ہو گئے۔

☆ **پروفیسر عبدالواسع**، (مظفر پور): "تمثیل نو" کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ سرسری مطالعہ کیا اور اس کے حسن معنوی سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ آپ کو چند سطریں لکھنے پر مجبور ہوا۔ مضامین پر مغز اور عمدہ ہیں۔ خاص طور سے شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا مضمون۔ اس مضمون سے مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی نظریے کو تقویت ملتی ہے۔ واقعتاً مولانا ملک کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے حامی نہ تھے اور آخر آخر تک اپنے موقف پر قائم و دائم رہے۔ اس کے ثبوت میں India Wins Freedom کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو آزادی کے دس برسوں کے بعد منصۂ شہود پر آیا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور پروفیسر مجید بیدار کے مضامین بھی پسند آئے۔ سبھوں نے موضوع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ یہاں یہ عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ مولانا ابوالکلام آزاد خالص ادبی میدان کے شہسوار تھے۔ اس لئے ان کی صحافت تو خالص ادبی تھی ہی پھر بھی پروفیسر مجید بیدار نے ثبوت و شواہد سے اپنے مدعا کو ظاہر کیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے موضوع سے انحراف کرتے ہوئے مولانا کے حسب نسب اور نگارشات کو سمیٹ کر اس کے دائرے کو وسیع تر کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے واقعتاً ایک بہت اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ جس زمانے میں علامہ اقبال کی شاعری کا غلغلہ تھا مولانا آزاد نے اپنے مکاتیب میں ان کا ایک شعر بھی نقل نہیں کیا۔ شاید یہ اس وجہ سے ہے کہ مولانا کے سیاسی نظریات علامہ اقبال کے سیاسی نظریات سے لگا نہیں کھاتے تھے جو بھی ہو یہ بات اپنے میں بہت چونکانے والی ہے۔ دوسرے مضامین بھی پسند آئے، شعری حصہ بھی اچھا ہے۔

☆ **پروفیسر قمر اعظم ہاشمی**، چندوارہ، مظفر پور: "تمثیل نو" کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق نہایت اہم اور معتبر تحریریں شامل شمارہ کی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس عبقری شخصیت کا ہندوستان کے ملی معاشرہ پر احسان عظیم ہے جس

سے سبکدوش ہونا ممکن نہیں ہے۔ دیگر مشتملات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

آپ کی کتاب ''عہد اسلامیہ میں دربھنگہ'' بے حد جامع ہے۔ آپ نے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ اس موضوع کا محاصرہ کیا ہے۔ اس سرزمین کی معاشرتی، علمی، ادبی اور تہذیبی پیش رفت کو کتاب میں جس انہماک و تفصیل سے آپ نے بیان کیا ہے اس نے شمالی بہار کے اس مخصوص باب کو روشن کر دیا ہے۔ مطالعہ کی وسعت نے سماجی سچائیوں اور تبدیلیوں کو زیادہ توجہ طلب بنادیا ہے۔ مبارک باد قبول کیجئے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

☆ **شمیم فاروقی، پٹنہ (مقیم دربھنگہ)**: بیک وقت ''عہد اسلامیہ میں دربھنگہ'' اور ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ عہد اسلامیہ میں دربھنگہ اور دوسرے مضامین، جناب محمد الیاس رحمانی کی کاوشوں کا آپ نے جس خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے جائزہ لیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بطور مرتب آپ نے دربھنگہ، تاریخ، تہذیب اور تخلیق کے عنوان سے طویل مقالہ لکھ کر نہ صرف اضافہ کا کام کیا ہے بلکہ اسے ایک تاریخی شکل دے دی ہے۔ عام طور سے مرتب صرف مضامین کو یکجا کر اپنے منصب سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں مگر یہاں آپ نے صحیح معنوں میں مرتب کا حق ادا کر دیا ہے۔ مرتب کی نگاہ تمام پہلوؤں پر بھی ہونی چاہئے اور جہاں جہاں امکان ہو وہاں تمام پہلوؤں پر بھی ہونی چاہئے اور جہاں جہاں امکان ہو وہاں ضروری اضافہ و ترمیم کی بھی گنجائش ہونی چاہئے۔ آپ نے یہ فرض منصبی پورا ہی نہیں کیا بلکہ حق بھی ادا کر دیا ہے۔ آپ نے دربھنگہ کی تاریخ تہذیب اور تخلیق کے تمام ابواب یکجا کر دئے ہیں اور ماضی سے حال کی ایک واضح اور صحیح تصویر پیش کر دی ہے۔ آپ نے کسی گوشہ کو خالی رہنے نہیں دیا ہے۔ آپ کے بھرپور اور تفصیلی جائزے کے ساتھ اب اس کی حیثیت دستاویزی ہو گئی ہے۔ بلاشبہ آپ کا یہ عظیم کارنامہ ہے اور اسے ہر دور میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے: اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ مدبر، مفکر اور خادم قرآن مولانا ابوالکلام آزاد کی نذر کر کے آپ نے اس عظیم المرتبت شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے: ایں سعادت بہ زور بازو نیست

مولانا آزاد غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی وقت میں تین شخصیتوں سے جداگانہ کام لئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور سرسید احمد خاں۔ تینوں اشخاص اپنے وقت کے گہر آبدار تھے اور ان کے کارہائے نمایاں رہتی دنیا تک باقی رہیں گے اور آئندہ نسلیں ان سے فیضیاب ہوتی رہیں گی۔ سبھی مضمون نگار حضرات نے اپنے اپنے طور پر مولانا آزاد کی شخصیت اور خدمات کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت ہی ایسی تھی کی کتنا کچھ لکھ دیا جائے پھر بھی خانہ دل سے یہی آواز آتی رہے گی:

سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لئے ۔۔۔ کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

صرف ترجمان القرآن ہی مولانا کا ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن فہمی کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ پھر تذکرہ میں مولانا کا انداز بیان، تحریر و تقریر کا ایک ایک لفظ دو دھاری تلوار کی طرح حق و باطل کے درمیان رواں دواں نظر آتا ہے۔ افسوس کہ مولانا پر جتنا اور جس انداز سے کام ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہو سکا۔ مولانا غلام رسول مہر جو مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق کار تھے انہوں نے رسول رحمت اور سرور عالم کے نام سے چند مضامین یکجا کئے۔ ساہتیہ اکادمی نے مالک رام کی ادارت یا نگرانی میں ترجمان القرآن کی چار جلدوں کو ٹائپ حروف میں شائع فرمایا۔ اب معلوم ہوا کہ شاید سورۂ مومنون یا بعض کے مطابق سورۂ نور کی تفسیر جو مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمائی تھی اس میں دوسرے مستند ترجمے شامل کر کے اسے مکمل کر دیا گیا ہے۔

یہ سب تو اللہ کے فضل سے ہو گیا۔ مگر ہم لوگوں نے مولانا آزاد کی منشا کو پورا کرنے میں غفلت و کوتاہی برتی۔ مولانا آزاد کا خواب تھا کہ مشنریوں کی طرح ایک اس طرح کا مسلم ادارہ بھی ہوتا جو صرف اور صرف قرآن فہمی اور قرآنی تعلیمات کو عام کرنے میں اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے اور اشاعت کا کام کرتا رہتا اور سلسلہ چلتا رہتا مگر ہنوز مولانا آزاد کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بقول ظہیر صدیقی:

روشن ورق ورق ہے منور چراغ ہے ہم ہی کھلی کتاب پر سر رکھ کے سو گئے

بہر حال تمثیل نو کے تازہ شمارہ میں ہر تحریر دامنِ دل کھینچتی ہے۔ خاص کر آپ نے علمی ادبی خبروں کی تفصیل پیش کر کے ہم تشنگان ادب کی سیرابی کا کام کیا ہے۔

شعری حصہ بھی خوب ہے مگر ایسا لگتا ہے ہر تخلیق ایک دوسرے میں نبرد آزما ہے۔ ایک ہی صفحہ میں تین چار غزلیں، قدرے گراں گزرتی ہیں مگر آپ کی بھی مجبوری ہے کہ اتنے سارے کلام (غزلیں، نظمیں) کو انہیں صفحات میں سمیٹنا بھی ہے۔ اگر چند تخلیقات کو آئندہ کے لئے روکے رکھئے تو پھر ڈھیر ساری چیزیں جمع ہو جائیں گی اور نکاسی بھی تو ہونی ہے۔ اس سلسلہ میں قدرے، احتیاط سے کام لے سکیں تو شاعر اور قاری بھی حسنِ جمال سے مزید لطف اندوز ہو سکیں۔

رباعیات کے چار مصرعوں کو خط امتیاز کے ساتھ ہی شائع ہونا چاہئے۔ امید اور دعا ہے کہ تمثیل نو خوب سے خوب تر ہو اور ادبی سفر جاری و ساری رہے۔

☆ **ابواللیث جاوید، نئی دہلی:** ''تمثیل نو'' کا اپریل تا دسمبر کا شمارہ اور ''عہد اسلامیہ میں دربھنگہ'' موصول ہوئے۔ بے حد خوشی ہوئی۔ ''عہد اسلامیہ میں دربھنگہ'' کی دریافت تو ادبی اور تحقیقی سمندر میں غوطے لگا کر گوہر تابدار کی کھوج کے مترادف ہے۔ جناب محمد الیاس رحمانی کی ان تحقیقی کاوشوں کے چرچے تو دربھنگہ کے ادبی حلقوں میں مدتوں سے تھے مگر آپ کی ہمت قابل ستائش ہے کہ آپ نے ان پوشیدہ خزانوں کو عوام الناس کے لئے کھول کر رکھ دئے۔ میں اس کتاب پر الگ سے اپنے تاثرات آپ کو بھیجوں گا۔ فی الحال ''تمثیل نو'' کے متعلق چند جملے ارسال خدمت ہیں۔

موجودہ شمارہ اپنے گذشتہ شماروں سے اس لئے مختلف نظر آیا کہ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قد آور ادبی شخصیت کا گوشہ آپ نے شامل کیا ہے۔ مولانا پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ابھی بھی ان کی شخصیت، ان کے فن اور ان کی سیاسی زندگی کے بہت سارے اہم گوشے Untouched ہیں۔ آپ نے مولانا پر جو کچھ بھی مواد حاصل کئے ہیں وہ بہت خوب ہیں اور ان کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔

اس بار آپ کا اداریہ، مجھے کچھ کہنا ہے، اٹھائس صفحوں پر مشتمل ہے۔ میرا خیال ہے اتنا جامع، اتنا معلوماتی اور اتنا جاندار اداریہ اردو کے کسی بھی رسالہ کو نصیب نہیں ہے۔ صرف اداریہ ہی پڑھ کر آج کے اردو ادب کی رفتار کو بخوبی جانا جا سکتا ہے۔ آپ کا اداریہ آج کے اردو ادب کا بیرومیٹر بن گیا ہے۔ اس سے اردو زبان و ادب سے آپ کی بے پناہ محبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ خدا آپ کے اس جذبہ کو سلامت رکھے۔

نثر کے مقابلے میں شعری حصہ زیادہ جاندار ہے۔ محمد سالم کا انگریزی ترجمہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس بار ۴۴ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جو اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ اسی طرح ۴۰ مکتوبات بھی ایک نیا ریکارڈ قائم کرتے ہیں۔ ان مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمثیل نو کتنے بڑے ادبی حلقے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ اردو کی نئی بستیوں کے قلم

گاروں کا بھی تعاون آپ کو حاصل ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔آپ کے رسالہ کو دیکھ کر یہ قطعی گمان نہیں ہوتا کہ یہ ایک مظلوم زبان کا رسالہ ہے۔اللہ آپ کے حوصلے بلند رکھے اور آپ کے تمام ادبی خواب پورے کرے۔آمین۔

☆ **ڈاکٹر عقیل ہاشمی**، حیدر آباد: "تمثیل نو" کا مولانا آزاد خاص نمبر بتوسط پروفیسر وہاب قیصر بمدست ہوا شمولات دیکھ کر حیرت ہوئی اور خوشی بھی جناب نے فی الواقعی خوب کام کیا اس کی جس قدر تحسین و تعریف کی جائے کم ہے۔احقر کے مضمون کی شمولیت قدر افزائی سے جدا نہیں اسی توجہ اور ستائش نے ایک بار پھر اکسایا اور ہاں اس خصوصی شمارہ میں خصوصی شاعر ڈاکٹر محسن جلگانوی کے بارے میں پڑھا یقین جانئے یک گونا نشاط کا احساس ہوا میں نے انہیں ٹیلیفون پر مبارکباد دی جبکہ دیگر شعراء کی تخلیقات ندرت و کمال کا آئینہ ہے۔تمثیل نو کے ابتدائی صفحات مجھے کچھ کہنا ہے اور آخری صفحات نظر اپنی اپنی خاصے کی چیز ہے جب کہ راہ و رسم سے اپنائیت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔بہر حال آپ کے مساعی ہر لحاظ سے قابل قدر ہی نہیں قابل تقلید ہیں، میری جانب سے اس محنت شاقہ، ہمت، تازہ کاری کے لئے آپ کو مبارکباد نہ دینا ادبی خیانت اور سچائی سے انحراف ہوگا۔

☆ **فاطمہ انجم تاج**، امریکہ: آپ کا رسالہ "تمثیل نو" مجھے بے حد خوبصورت لگا۔اللہ کرے اسکا حسن اور بھی بڑھتا جائے۔ آپ اپنا قیمتی وقت لگا کر ایک بہت ہی عمدہ کام انجام دے رہے ہیں۔

☆ **ڈاکٹر لطیف سبحانی**، اورنگ آباد: ۲۲۴ صفحات پر مشتمل "تمثیل نو" کا اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔امام اعظم ادب کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ادبی خدمات پر سیر حاصل اور فکر انگیز گوشے جس اہتمام سے پیش کیے ہیں وہ مدیر تمثیل نو کا ہی خاصہ ہے۔یہ رسالہ دیگر رسائل و جرائد سے منفرد ہے۔دراصل امام اعظم کی محنت ذوق و شوق اور جانفشانی کی وجہ سے یہ رسالہ دنیائے ادب میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کر لیا ہے وہ بڑی محنت سے اضمحلال کا شکار نہ ہوتے ہوئے تازہ دم ہو کر نہایت مستعدی کے ساتھ ادبی جہات سے اپنے قاری کو معیاری تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔رسالہ کے مضامین وقار و معیار میں اضافہ کرتے ہیں۔نظمیں، غزلیں، تبصرے، مضامین اور افسانوں کا انتخاب پر کشش و معیاری ہے معمول کے مطابق بہترین شعری و نثری تخلیقات سے مزین اچھے ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے تمثیل نو کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔اس میں ایک نیا پن اور ایک نئی تازگی بھی آتی جارہی ہے۔

بیسویں صدی کے مدبر و مفکر مولانا ابوالکلام آزاد ایک خصوصی مطالعہ اس درجہ پر ہے کہ نہ صرف پڑھا جائے بلکہ کتابوں کی الماریوں اور درازوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔یہ شمارہ امام اعظم کی اردو نوازی، ادب پروری اور دانشمندانہ ادارت کا ایک حسین نہایت معیاری، معلوماتی اور مفید و کار آمد مضامین کے ساتھ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا ابوالکلام کی یوم پیدائش "یوم تعلیم" کے طور پر ہندوستان میں منایا جانے لگا ہے۔مولانا آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔یونان کا سقراط، تہران کا ابن تیمیہ اور مصر کا محمد عبدہ ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صورت میں پیدا ہوا تھا۔وہ ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔وہ ایک سیاست داں، مدبر، ایک سحر البیان مقرر، ایک مجرب عالم، ایک بے مثال خطیب، ایک پکا اور مستقل مزاج قوم پرست، تحریک آزادی کے انتھک سورما اور ایک بہترین مفسر قرآن تھے وزیر تعلیم کانگریس کے ایک اہم ستون!

۲۳ فروری ۱۹۵۸ء کو راجندر پرشاد کی جانب سے ٹائمز آف انڈیا، میں مولانا کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا جو کچھ اس طرح تھا۔"مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے ہندوستان ایک جید عالم، ایک زبردست خطیب، ایک بزرگ سیاست داں اول سے آخر تک قوم پرست، جنگ آزادی کے ایک ان تھک سپاہی اور سب سے بڑھ کر ایک ایسے رہنما سے محروم ہو گیا۔جس

کے مدبر اور ہمت و جرأت سے ہمیں بہت سے نازک اور پیچیدہ مسائل حل کرنے میں مدد ملتی تھی۔ سارا ملک ان کے غم میں سوگ وار ہے۔ جن لوگوں کو ان کے ساتھ اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے اور پورے ملک کے لئے ان کی وفات ایک نا قابل تلافی نقصان ہے۔ ہم سب ان سے اتنے قریب تھے کہ اس وقت اپنے دلی جذبات کے اظہار سے اپنے آپ کو معذور پاتے ہیں۔ وہ آخر دم تک وطن کی جس سے انہیں بے حد پیار تھا۔ اور جس کے لیے انہوں نے قربانیاں دیں، خدمت کرتے رہے ان کی وفات نے کروڑوں انسانوں کو سوگوار بنادیا ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کی جانب سے "ہندوستان ٹائمز" میں مولانا آزاد کو نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا جس کے الفاظ کچھ اس طرح سے تھے " آج امیر کارواں اٹھ گیا۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا۔ وہ پر نہ ہو سکے گا۔ وہ ان ثقافتوں تہذیبوں، فکروں اور فلسفوں کا جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بے انتہا متاثر کیا ہے۔ حسین مجموعہ تھے۔ وہ قدیم اور جدید کا سنگم تھے۔ بڑھتی ہوئی علاحدگی پسندی کے اس دور میں ان کی زندگی سے سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ ملک کا اتحاد جملہ مفاد سے بالاتر ہے۔ مولانا کی وفات سے جو صدمہ پہنچا ہے اس کی شدت تو رفتہ رفتہ گھٹ جائے گی لیکن ملک کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کیوں کر ہو سکے گی۔ اب ہمیں صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوگی تو ہم کس کے پاس جائیں گے۔"

آج کی سیاست کو مولانا آزاد جیسی سیاسی شخصیتوں کی ضرورت ہے۔ جس وقت آزادی کی تحریک عروج پر تھی مولانا آزاد انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ دانشمندانہ اقدام اور سیاسی جرأت ہی تھی کہ انگریزوں کو طے شدہ وقت سے قبل ہی ہندوستان سے راہ فرار اختیار کرنا پڑا۔

مولانا آزاد انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے۔ لیکن اپنی صدارت سے استعفیٰ دے کر جواہر لعل نہرو کے لئے وزیر اعظم کی کرسی کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ ان کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" ہمارے لئے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا میں ہمت جرأت اور حوصلہ کی کمی تھی وہ اپنے ساتھیوں سے خوف کھاتے تھے۔ ان کے تعلق سے اپنے تاثرات کو قلم بند کر کے رکھ دیا اور ہدایت کی تھی کہ ان کے انتقال کے تیس برس بعد انہیں منظر عام پر لایا جائے۔ جب ان تیس صفحات کو منظر عام پر لایا گیا تو معلوم ہوا کہ تقسیم کے اہم ذمہ دار پنڈت جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل ہیں۔ یہ بات مولانا آزاد اس وقت بھی کہہ سکتے تھے جب کہ یہ حیات تھے۔ لیکن ان میں سچ کہنے کی ہمت و جرات نہ تھی۔ وہ ملک کے وزیر تعلیم تھے۔ اردو کے ادیب و انشا پرداز تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد اردو اچھی طرح جانتے تھے۔ تب بھی وہ اردو کو بچا نہ سکے اور ملک کی سرکاری زبان ہندی بنادی گئی۔ ان تمام گوشوں پر از سر نو روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

مختلف النوع مضامین غزلوں، افسانوں، مضمون کے ساتھ بھر پور مواد سے آراستہ ہے۔ اہل ذوق کے لئے زرخیز مطالعہ سے لبریز ہے۔ یہ خصوصی شمارہ انتخاب مضامین اور معیار و ندرت کے لحاظ سے نہ صرف منفرد اور قابل مطالعہ ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کے لائق ہے۔

☆ رؤف خیر، حیدر آباد: "تمثیل نو" کا مولانا آزاد نمبر بہت جامع ہے۔ آپ نے محض ۲۲۴ صفحات میں تقریباً پانچ سو صفحات کا مواد سمو دیا ہے۔ اور ہر لفظ قابل مطالعہ۔ آپ کے مضمون سے معلوم ہوا کہ مولانا آزاد کی انشا پردازی فرانسیسی طرز کی تھی حالانکہ مولانا آزاد فرانسیسی زبان سے نابلد تھے۔ وہ تو انگریزی بھی واجبی واجبی ہی جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ India Wins Freedom ہمایوں کبیر کو لکھنی پڑی۔ آپ نے بڑے سلیقے سے ان کے طرز تحریر پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے

اپنے اداریہ میں مولانا آزاد کی شخصیت کے گوناں گوں پہلوؤں کا اجمالی ذکر بھی کر دیا ہے ظاہر ہے ہر پہلو ایک مقالہ ہی نہیں ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ بیشتر قلم کاروں نے ایک ایک پہلو کا حق ادا کیا ہے۔

تشنہ اعجاز کی ''بات ایک کتاب'' کی پڑھ کر مزہ آیا۔ انہوں نے بہت ہی دلکش اسلوب میں آپ کی مرتبہ کتاب کا جائزہ لیا ہے۔ ذیل میں کئی معلومات بھی آ گئی ہیں جیسے شیر افگن کی تاریخ وفات ''مظلوم'' سے نکلتی ہے۔ اور یہ کہ رشید احمد صدیقی صاحب کا بلیغ جملہ کہ آخری عمر میں توبہ واستغفار اور دوسری شادی کی خواہش ہوتی ہے۔ محمد علی جناح کی تاریخ وفات مر گیا مردود جس کا فاتحہ نہ درود بھی دلچسپ ہے۔ تشنہ اعجاز صاحب کا مضمون مجھے بہت پسند آیا۔ اس شمارہ کے مخصوص فنکار ڈاکٹر محسن جلگانوی کا تعارف بھرپور ہے۔

آپ نے مختلف کتابوں پر خوب تبصرہ کئے ہیں۔ محترم حسن امام درد کے تبصر بھی بہت جامع ہیں۔

☆ **پروفیسر طلحہ رضوی برق، دانا پور، پٹنہ:** آج کی ڈاک سے ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ یعنی ابوالکلام آزاد نمبر ملا۔ خاص شماروں کی جامعیت کے لئے آپ کتنی محنت کرتے ہیں اور کتنا مواد مہیا کر لیتے ہیں یہ آپ ہی کا کام ہے۔ خفی کمپوزنگ کی شاید یہی وجہ ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ میٹر پیش کر سکیں۔ ابھی ہزاری باغ سے آ رہا ہوں۔ سرسری طور پر دیکھ سکا ہوں۔ مشغولیت بڑھ گئی ہے۔ کل ہی دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ دہلی یونیورسٹی نے مجھے اپنے اردو شعبہ میں ویزیٹنگ پروفیسر بحال کر لیا ہے دعا کرتے رہیں کہ اللہ آبرومند رکھے۔

☆ **رشید انجم، بھوپال:** ''تمثیل نو'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کا گوشہ دراصل ایک دستاویز ہے۔ یہ چھوٹا سا پرچہ جس کے ہر صفحہ پر آپ کی حسین صحافت کی جھلک موجود ہے، ایک جامع اور فکر کو بصیرت دیتا پرچہ ہے۔ میں اسے مکمل طور پر نہیں دیکھ سکا، گاہے گاہے چند مضامین پڑھے ہیں۔ آپ کا اداریہ، آپ کا مضمون ''فرانسیسی طرز کی انشاپردازی اور مولانا آزاد'' اور شکیل احمد سلفی کا مضمون ''عہد اسلامیہ میں دربھنگہ'' ان مضامین اور اداریہ سے آپ کی فکر، آپ کی طرز نگارش اور آپ کی صحافیانہ بردباری اور کاوشوں کا جائزہ ملتا ہے۔ تمثیل نو کی صوری اور معنوی دلکشی اس کے ہر ہر صفحہ اور ہر ہر مضمون سے اس طرح جھلکتی ہے کہ اگر نہ سنبھالو تو نظر خیرہ ہو جائے۔ آپ کی ہمت غضب کی ہے اور ترتیب وتزئین میں آپ کی صحافت کی گہری نظر دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ اس ہجوم میں اتنا خوبصورت اور معیاری پرچہ نکالنا جس میں انفرادیت بھی ہو اور سلیقہ اور وقار آسان نہیں ہے۔ خدا اسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔

☆ **احسان ثاقب، نوادہ، بہار:** تمثیل نو کا شمارہ نمبر 8-7 نگاہوں سے گذرا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بلند و بالا شخصیت کے پیش منظر جو بھی مضامین شائع ہوئے ہیں وہ نہایت اہم اور معلوماتی ہیں۔ یہ خصوصی گوشہ قارئین اور طلباء طالبات کے لئے اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ مولانا آزاد کی ستر سالہ زندگی کے کم وبیش تمام خد وخال اس میں واضح ہیں۔ آپ کے رسالے کا ہر انداز منفرد ہوتا ہے ان مستند رسالوں کی اشاعت نے آپ کو اس مقام پر فائز کر دیا ہے جہاں تک پہنچنا خوش قسمت لوگوں کا ہی کام ہے۔ اللہ آپ کو اور آپ کے قلمی جوش کو سلامت رکھے۔

آپ کی کھوجی طبیعت کی باریک بینی کو داد دینی پڑے گی کہ آپ نے شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے ترجمے ''مولانا آزاد اور تقسیم ہند'' کو خوب خوب چھاپا ہے۔ آسنسول میں کئی بار محرک ہفتہ روزہ کے دفتر اور انجمن ترقی اردو ہند کی خصوصی نشستوں میں ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دیکھنے میں مکمل بنگالی مگر جب گفتگو کرتے تو بابو موشائے کا لہجہ اور تلفظ اتنا درست اور

رواں دواں ہوتا کہ اردو والے حیران رہ جاتے۔

ایک واقعہ سناتا ہوں۔ مشہور شاعرہ مینا قاضی اور فلمی شاعر کیف بھوپالی کے اعزاز میں نشست جمی ہوئی تھی۔ ایک صاحب دھوتی کرتا میں ملبوس اور بغل میں کھادی کا جھولا لٹکائے اپنی کرسی سے بار بار اٹھ بیٹھ رہے تھے۔ میں ان سے واقف نہیں تھا اس لئے میں نے پوچھا۔ ''کوئی خدمت'' انہوں نے ایک کاغذ کا ٹکڑا بڑھا دیا اور کہا کہ قیام انیس تک پہنچا دیں۔ کاغذ کے ٹکڑے پر ایک شعر لکھا ہوا تھا:

سفر کا سلسلہ آخر کہاں تمام کروں۔ کہاں چراغ جلاؤں کہاں قیام کروں۔ (شانتی رنجن بھٹا چاریہ) میں نے قیام انیس کو وہ کاغذ دے دیا۔ قیام انیس کو پان کھانے کی بے طرح عادت تھی۔ کاغذ پر ان کی نظر گئی تو بے ساختہ اٹھے اور نہایت احترام کے ساتھ بابو موشائے کو اپنے قریب کی ایک کرسی پر بٹھایا۔

بھٹا چاریہ بابو اور ناگ بابو دو ایسے ہندو بنگالی ادیب ہیں جن کی اردو شناسی کو اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ مجھے کچھ کہنا ہے! کے تحت دنیا بھر کی علمی اور ادبی اور خود آپ کی اپنی سرگرمیوں اور دیگر تیاریوں کی پوری معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ایسی افسوسناک آگاہی بھی ملتی ہے کہ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے؟ ''راہ و رسم'' وہ دوسرا عظیم خاکہ ہے جس میں اردو بیداری کی جھلک ملتی ہے اور مختلف الجہات شعری و ادبی کارناموں کا سلیقہ رکھتا ہے۔ 'رات گئی بات گئی' کی آخری قسطیوں دل و دماغ کو جھنجھوڑ گئی کہ میں پہروں اس بدنصیب کردار پر غور کرتا رہ گیا۔ ایک پولس افسر کی ڈائری فکشن یا پھر ماورائی حقائق کی خوب تر مثال ہے۔ میں ہاشمی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنی پرانی ڈائری کے کھنڈروں میں چھپے عکس کو اسی طرح نمایاں کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔

''یہ سرگذشت ہی ہے'' محترم سید منظر امام صاحب کے ماضی کا وہ رخ ہے جس میں کئی طرح کے زاویے ہوتے ہیں پڑھنے والا کبھی مسکراتا ہے تو کبھی روتا ہے۔ کبھی طمانیت محسوس کرتا ہے تو کبھی گھبراہٹ۔ ۱۹۷۹ء کا خونی فساد واقعی بڑا وحشیانہ تھا اور منصوبہ بند بھی۔ سرگذشت میں شہر آہن جمشید پور کے فساد کی روداد پڑھ کر یقیناً میری طرح اور بھی کئی آنکھیں نم ہو گئی ہوں گی۔ زیر نظر شمارہ ایسا گلدستہ ہے جس میں سجے پھول اپنی خوشبو اور دل کش رنگ سے ادب کے آنگن کو مہکا اور چہکا رہے ہیں۔

مخصوص شاعر ڈاکٹر محسن جلگانوی کی مخصوص شاعری کو پیش کر کے آپ نے ان کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی دونوں غزلیں اسلوب فن اور اسلوب حیات کی حامل ہیں۔ محسن جلگانوی بے شک کھلی آنکھ کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل کا یہ شعر تو دل کو چھو لیتا ہے:

جس شخص کی دہلیز پہ بچے نہیں آتے　　سنتے ہیں کہ اس گھر میں فرشتے نہیں آتے

ابراہیم اشک نے ''زندہ تصویر'' لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اچھا شاعر بھی ہے اور ایک اچھا فکشن نگار بھی۔

☆ **محمد خالد عابدی، بھوپال:** آپ کی جانب سے ادبی تحائف ملتے رہے ہیں۔ ''تمثیل نو'' کے خصوصی شمارے بھی ملتے رہے ہیں۔ ماشاءاللہ آپ خوب کام کر رہے ہیں۔ اچھے اور اہم موضوعات پر تمثیل نو کی خصوصی اشاعتیں اور کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی ہمت، توفیق دے کہ آپ اردو زبان و ادب کی خدمت کر سکیں۔

''تمثیل نو'' پہلی نظر میں پسند آنے والا رسالہ ہے۔ میں نے گزشتہ شماروں پر اظہار خیال کیا تھا۔ غالباً وہ خطوط آپ تک پہنچے نہیں۔

☆ **پروفیسر راحت حسین بزمی، کٹیہار:** تمثیل نو میں میری آزاد نظم "اس لئے تو" شایع کرکے آپ نے مجھ پر احسان کیا اور وہ بھی ایسا کہ جہاں کہیں بھی اور جس کسی نے بھی اسے پڑھا اس کی اتنی تعریف کی کہ میں اپنے تازہ ترین زخم دل، گو جو آپکی چچی جان کی وفات سے لگا تھا مندمل ہوتا ہوا محسوس کیا۔ خالق کائنات کا حکم آیا اور آپ کی چچی جان ۵۵ سالہ رفاقت ۵۵ منٹ سے بھی کم وقفہ میں تو ذکر مالک حقیقی سے جا ملیں۔ یہ حادثہ ۱۲؍ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی منحوس دو پہر کو پیش آیا۔ اس کے بعد موسم نے پھر ایسی بے رخی دکھائی کہ ٹھنڈک کی وجہ سے گھر سے نکلنا دو بھر ہو گیا۔ اور فروری ۱۰ء کو میں خود بھی ادھ مراسا ہو گیا۔ جب فضا میں تھوڑی تمازت آئی تو اپنے داماد کی گاڑی سے پورنیہ بغرض علاج آیا۔ ابھی علاج شروع ہوئے پندرہ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ میرے چھوٹے صاحبزادہ جو پٹنہ ہائی کورٹ میں وکیل ہیں اور بہو جو بہار قانون ساز کونسل میں شعبہ ہندی سے منسلک ہیں، میرا اکلوتا پوتا، جو پٹنہ ہی میں زیر تعلیم ہے، سب لوگ چار دنوں کی فرصت لے کر مجھ سے ملنے کٹیہار آ گئے۔ میں بھی پورنیہ سے کٹیہار گیا اور چار دنوں کے بعد ان لوگوں کو رخصت کرکے دوبارہ پورنیہ آ گیا اور تب سے یہیں ہوں۔ ڈاکٹر الحاج زیڈ، بی۔ رضا کے زیر علاج ہوں اور اللہ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہو رہا ہوں۔ علاج کی غرض سے جب آیا تھا تو اس وقت میرا وزن محض ۳۰ کیلو تھا آج پندرہ بیس دن کے اندر ۳۵ کیلو ہو گیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا، فضا اور دوا راس آ رہی ہے اس لئے ڈاکٹر کی صلاح ہے کہ آپ یہاں کچھ دنوں تک اور رہ کر اپنی روٹھی ہوئی صحت کو منانے کی کوشش کیجئے۔

میں بھی کتنا مطلب پرست ہوں کہ بس اپنی رام کہانی سنانے بیٹھ گیا۔ زندگی ایک حقیقت ہے لیکن اس سے بھی بڑی حقیقت موت ہے۔ اس سے گھبرانا کیسا؟

اس بار کے تمثیل نو میں (جو علم و دانش کے پیکر ابوالکلام آزاد نمبر ہے) اس شمارہ کے مخصوص شاعر ڈاکٹر محسن جلگانوی کی دونوں غزلیں تازیانہ ہیں۔ پہلی غزل ڈھونگی اردو ہمدردوں کے لئے اور دوسری خود اپنی قوم کے افراد کے لئے:

دیمک چاٹ رہی ہے محسن اردو کی بنیادوں کو	سارا تماشہ ایک چھلاوا خدمت ودمت کا ہے کی
اردو کا میں شاعر ہوں زباں کا میں محافظ	بچوں کو مرے اردو کے ہجے نہیں آتے

افسانوں میں ابراہیم اشک (ممبئی) افسانہ "زندہ تصویر" کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسے افسانوں کی آج پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ "راشٹریہ سہارا" سے معلوم ہوا کہ "تمثیل نو" کا اگلا شمارہ آپ اردو کے حوالے سے فلمی دنیا کا نمبر نکال رہے ہیں۔

میری ایک کتاب "مضامین رنگ رنگ" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس کا اجراء پٹنہ میں مقیم ہمارے ایک عزیز شاگرد دیرینہ ڈاکٹر خورشید انور مظہری بڑے پیمانے پر ۱۰؍ اپریل کو کرا رہے ہیں۔ میں خود تو وہاں جانے سے قاصر ہوں لیکن میرے چھوٹے صاحبزادے خاتم رضا (ایڈوکیٹ) پٹنہ ہائی کوٹ میری جانشینی کریں گے۔ ہو سکے تو آپ بھی شریک ہوں۔ خدا نے آپ جیسے شاگردوں کو عطا کرکے جو عزت بخشی ہے اس کا میں تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

☆ **حماد انجم، ایڈوکیٹ، سنت کبیر نگر:** تازہ شمارہ تو گویا "تمثیل نو" کا ابوالکلام آزاد نمبر ہے۔ امام الہند کی بارعب اور پرکشش تصویر ٹائٹل کو اجال رہی ہے۔ چار مصرعوں میں آپ نے ابوالکلام کا تعارف کیا سمو دیا گویا کوزے میں سمندر کو اتار دیا ہے۔ آپ ہر شمارے میں ہی کمال کرتے رہے ہیں۔ سو دو سو صفحات پر مشتمل رسالہ نکالنا کوئی معمولی کام نہیں بلکہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے کے حوالے سے آپ بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ مختلف قسم کے لوازمات کو اکٹھا کرکے ایڈٹ کرنا آپ ہی

کے بوتے کی بات ہے۔ مجھے تو آپ غضب کے مدیر لگتے ہیں۔ یہ شمارہ بہت پہلے ملا ہے لیکن آج بھی زیر مطالعہ ہے۔ یہ آپ کا اعجاز ہی تو ہے۔ نثر و نظم دونوں حصے پر کشش، جاذب طبیعت دلچسپ اور رنگا رنگ ہیں۔

ادب کے ادنیٰ خادم کو بھی آپ رسالہ بھیجنا نہیں بھول پاتے نہ کسی سے زر تعاون کا تقاضہ کرتے ہیں ایسا ظرف کم کم دیکھنے کو ملا ہے۔ اس معاملے میں آپ بالکل منفرد ہیں۔ فی البدیہہ نذرانہ خلوص رقم ہے۔

ترے "تمثیل نو" کی اک نئی تمثیل لکھ دوں تو — اسے میں مجمع الاجمال کی تفصیل لکھ دوں تو
میں پھر یہ سوچتا ہوں اور بھی کیا کیا رقم کر دوں — ادب کے مسئلے کی میں اسے تاویل لکھ دوں تو
خیال آتا ہے دل میں یہ امام اعظم کا پرچہ ہے — میں اس تمثیل نو کو مصحف جبریل لکھ دوں تو

☆ حباب ہاشمی، الہٰ آباد: "تمثیل نو" شمارہ ۷۔۸ پوری آب و تاب اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ شکریہ۔

ادبی و ثقافتی خبریں کے تحت انجمن روح ادب الہ آباد کے زیر اہتمام میرے دوسرے مجموعہ "کلام نقد جاں" کے اجراء کی خبر آپ نے شائع کی ہے۔ یہ آپ کے تعلق خاطر کی دلیل ہے۔ وفیات کے کالم میں احمد فراز، رفعت سروش، فضا ابن فیضی، پروفیسر قمر رئیس، کاوش بدری، حبیب تنویر، سید عبداللہ بخاری، یوسف ناظم، شہر رضوی، محمد بدیع الزماں، خالد یوسف، عادل منصوری وغیرہ کے انتقال پر ملال نے بے حد رنجیدہ کیا۔ اللہ پاک انہیں غریق رحمت فرمائے (آمین)

عظیم عالم دین، مفکر اور دانشور مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر سے مزین سرورق انتہائی خوبصورت اور پرکشش ہے۔ ان کی شخصیت (مرحوم) اور فن سے متعلق سبھی مضامین بیحد گرانقدر اور بصیرت افروز ہیں۔ دیگر مضامین نظم و نثر کا انتخاب بھی آپ کی خوش سلیقگی کا ضامن ہے۔ سوا دو سو صفحات پر مشتمل یہ خاص نمبر محفوظ رکھنے کے لائق ہے۔

☆ ڈاکٹر پریمی رومانی، جموں: یہ شمارہ علم و ادب کے گوناں گوں پہلوؤں پر دال ہے۔ فکر انگیز مقالات، قابل مطالعہ افسانوں، خوبصورت غزلوں اور نظموں، تبصروں اور طنزیہ تحریروں سے بھرپور یہ شمارہ اپنے اندر ایک مکمل ادبی صحیفہ ہے۔

بیسویں صدی کے مدبر و مفکر: مولانا ابوالکلام آزاد۔ خصوصی مطالعہ کے ذیل میں آنے والے تمام مقالات قابل مطالعہ ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر مجید بیدار کی تحریروں کی داد نہ دینا کور ذوقی ہوگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال ڈاکٹر عقیل ہاشمی کا مقالہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ "پرویز شاہدی: ایک فراموش شدہ شاعر" عبدالرحمٰن عبد کا مقالہ شائع کر کے آپ نے اردو نوازی کا حق ادا کیا ہے۔ ابراہیم اشک کا افسانہ زندہ تصویر ایک جذباتی افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ڈرامائی انداز میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ جو ذہن و دل کو آسودگی عطا کرتا ہے۔

شعری حصہ بھی بڑا خوبصورت ہے۔ نقشبند قمر نقوی، علیم صبا نویدی، سوہن راہی، رؤف خیر کی نظمیں دل کو چھو لینے والی ہیں۔ وویا ساگر آنند، شباب للت، دیپک قمر، ساحر شیوی، رئیس الدین رئیس، غلام مرتضیٰ راہی، قطب سرشار، اور کرشن پرویز کی غزلیں تمثیل نو کے اس شمارے کی جان ہیں۔ کتابوں پر تبصرے بھی قابل مطالعہ ہیں۔

آپ کی مدیرانہ اور ادبی صلاحیتوں سے کون واقف نہیں۔ آپ جس چیز کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں بڑی عرق ریزی، محنت اور صلاحیت سے اس پر کام کرتے ہیں اور یہی ایک اچھے ادیب کی پہچان ہے۔

☆ محمد صدیق رونق، جے پور: ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی اہم شخصیت کے ہر پہلوؤں پر مکمل طور پر روشنی ڈالی ہے جو قابل تحسین ہے۔ پڑھتے وقت ایسا احساس ہوا جیسے آپ نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہو۔ ان کی صحافتی، ادبی اور سیاسی خصوصیات کو ایک صفحہ میں بخوبی تمام تحریر کر دیا۔ یہ واقعی آپ کی ادبی صلاحیت کا بہترین نمونہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر دوسرے مضامین بھی جو اس شمارہ میں شامل کئے گئے ہیں وہ بھی ہمارے آج کے نوجوان طالب علموں کو ان کی عظیم شخصیت سے واقفیت پورے طور پر کروائیں گی۔ میری دلی خواہش ہے کہ اسکولی نصاب میں بھی ان کی عظیم شخصیت کا ایک حصہ شامل کیا جائے۔ اور ان کو ملک کے دوسرے عظیم رہنماؤں کی صف میں جگہ ملے۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا آزاد کی یوم پیدائش یوم تعلیم کے طور پر ہندوستان میں منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

''یہ سرگذشت ہی ہے'' میں پروفیسر سید منظر امام نے جو مذہبی فرقہ وارانہ فساد کی خوفناک اور دردناک تصویر پیش کی ہے وہ قابل عبرت ہے۔ ہم سب خدا سے دعائیں کریں کے مذہب کے نام پر ایسا خونی فساد دیکھنے کو نصیب نہ ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۱۹۹۰ء کا جے پور فرقہ وارانہ فساد کچھ اسی طرز پر تھا۔ خدا ہم سب کو اس سے محفوظ رکھیں۔ آمین۔

دو ''نظمیں'' ''ہم محبت کے پیمبر ہیں'' اور ''وقت'' کے انگریزی ترجمے محمد سالم کے کئے ہوئے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ بہت پسند آئے۔ ان کا یہ ذوق قابل ستائش ہے۔ آخر میں یہ کہنے سے گریز نہیں کرونگا کہ دربھنگہ میں بیٹھ کر جو آپ اردو ادب کے فروغ اور فلاح و بہبود کے لئے کام انجام دے رہے ہیں وہ بلاشبہ ہم بھی اردو والوں کے لئے قابل فخر ہے۔

☆ ہما مظفر، نئی دہلی: ''تمثیل نو'' پر چند سطر جو حق ہے۔ مگر یہ بھی ادا نہ ہوا۔ بہر کیف گذشتہ ماہ 'ادب میں طنز و مزاح' ساہتیہ اکیڈمی میں لحاتی گفتگو و ملاقات یاد ہے اور پھر جس کے پاس تمثیل نو ہو تو پھر کیا کہنے۔ یہ کہنا بالکل غلط نہ ہوگا کہ آپ اردو کو زندگی بخشنے میں اپنی طرف سے پوری طرح سرگرداں ہیں اور آپ کی کوششیں رائیگاں نہیں جا رہی ہیں، ایک بہترین کوشش سب کے سامنے زندہ ہے میں اگر اردو کے لئے کچھ آپ کی مدد کرنے کی اہل ہوں تو مجھے ضرور یاد رکھیے۔ تمثیل نو کچھ ذہن جدید، جیسا محسوس ہوا، ورق گردانی کے بعد سب سے پہلے ادبی و ثقافتی خبروں پہ نظر ڈالی، ان میں پورا ہندوستان ہے اور یہ اچھی کوشش ہے کہ عام اردو والوں تک خاص اردو والوں کے پیغام پہنچ رہے ہیں، دوسرے وفیات بھی بہت بہتر طور پر قارئین تک پہنچا، جو کہ بے حد ضروری ہے، پھر باری آئی تبصرہ (نظر اپنی اپنی) پر تو جناب آپ نے کمال اعزاز بخشا ہے کہ اردو کی نئی نویلی تصنیفات بھی عاشقان اردو تک آسانی سے پہنچنے میں کامیاب ہو رہی ہیں، اس میں ایک اضافہ کرنے کی زحمت گوارا کریں، مہربانی ہوگی تمثیل نو کی محفل چمن زار ہو جائے کہ، اردو پڑھنے والوں میں انگلش اور دوسری ہندوستانی اور جہاں تک ممکن ہو دنیا کی سب زبانوں کی نئی کتابوں کے بارے میں کچھ معلومات ہوں تو دلچسپی بڑھے گی۔ ایک دو غزلوں میں حسن چھلکا کچھ اور خاص نہیں، ہاں بیسویں صدی کے مدبر و مفکر مولانا آزاد کا خصوصی مطالعہ واقعی خاص ہے، مضامین میں کلیم عاجز کی کہانی.... اچھی لگی مگر تفصیل میں کمی محسوس ہوئی کی ان کی اولادوں کا کہیں کچھ خاص ذکر نہیں۔ بقیہ مضامین دلچسپ ہیں۔ طنز و مزاح میں بھی بہترین پیش کش نہیں لگی۔ مخصوص شاعر محسن جلگانوی، خاکہ اچھا لگا۔ بہر کیف بخشش کی پیشکش اور بہتر ہوتی تو مزہ آتا۔ رات گئی... خواب ناک اور دیومالائی کہانیوں جیسی ہے مگر اچھی لگی ''سوہا الجھی ہے'' اور ''زندہ تصویر'' میں جان ہے۔

اردو کو اگر دہلی یا کسی بھی میٹرو میڈیا میں دیکھیں تو اب تک اردو کا مستقبل دھندلا نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ ہندی کو اردو اسکرپٹ میں لکھ کر آج کہاں پڑھا جاتا ہے، یا انگلش کو اردو اسکرپٹ میں لکھ کر پڑھوایا جائے تو آج ہر اردو پڑھنے والا بہت بہترین انگلش وآئس اور نریشن اور نیوز پڑھ ڈالے۔ آخر اردو اور اردو واں کے ساتھ یہ بدتمیزیاں کب ختم ہوں گی؟ ہے کچھ علاج آپ کے پاس اعظم صاحب۔ اب حال تو یہ ہے کہ اردو زبان و بیان میں اگر تحقیق کریں تو یہی ملے گا کہ اُردو پر کام کر رہے لوگوں نے ہی اردو کی Script کو ختم کرنے میں جان لگائی ہوئی ہے۔ اردو کے لئے اگر کام ہو ہی رہا ہے تو اردو کو اردو اسکرپٹ کے ساتھ ہی زندہ رکھا جائے۔ آخر مشکل کہاں ہے؟ اردو والے تو پی ایچ۔ ڈی تک کر کے بے کار و بے روزگار گھوم رہے ہیں، کام ڈھونڈ رہے ہیں، انہیں کام دیں اور اردو کی صحیح خدمت کریں ورنہ تو نہ جانے کہاں کہاں سے پکڑ کر خاص کر الیکٹرونک میڈیا میں لوگوں کو بٹھا دیا جاتا ہے اور اگر اردو کو ہندی اسکرپٹ میں لکھ رہے ہیں انہیں اردو اسکرپٹ نہیں آتی تو کم از کم غلط سلط اردو لکھ کر، صحیح اردو پڑھنے والوں کی زبان خراب کرنے کی زحمت نہ کریں۔ دوسری اور مفلوک الحال، صحیح اردو جاننے والوں کے ساتھ بھی یہ بدتمیزیاں کہ اردو کے کام کی قیمت سب زبانوں سے کم کیوں؟ جب کہ دنیا کے ہر خطے میں اردو کے نغمے، غزلیں اور فلمیں پسندیدہ رہی ہیں اور آج بھی چین و عرب، یوروپ، یونان، مصر، روم، سب جگہ اردو پسند کی جاتی ہے پھر اردو کا مختنانہ خود ESD اردو سروس آل انڈیا ریڈیو میں تین شفٹ میں، آٹھ گھنٹے ڈیوٹی کرنے والوں کو کم سے کم ۴۰۵ روپے اور زیادہ سے زیادہ ۸۰۰ روپے روز ملتے ہیں۔ جب کہ ہندی اور دوسری زبانوں میں ۴۰۰ اروپے روز کے ملتے ہیں، یہ انصاف ہے؟ ان موضوعات پر بھی اچھی روشنی ڈالیں تا کہ اردو کا حال و مستقبل روشن ہو۔ آمین اس طرح آپ بتائیں کہ جب آل انڈیا ریڈیو کی ESD اردو سروس میں روزگار صحیح نہیں ملے گا تو لوگ کیوں کام کریں گے؟ اور پھر اردو کا اکلوتا اسٹیشن بھی بند ہو جائے گا۔ آپ سنیں تو تحقیق ہو کہ گلف اور بحرین میں تامل تیلگو کس طرح اردو کی زبان کا سانجھر بنا کر پیش کرتے ہیں کہ کسی کو بھی ابکائی آئے۔ اور اس طرح روز بروز اردو کی تبلیغ ہونے پر بھی اردو زندہ نہ رہ سکے گی۔ کیونکہ ہر زبان اپنی اسکرپٹ کے ساتھ زندہ ہے، جب اردو سے اس کی اسکرپٹ خود مٹا رہا ہے تو میڈیا کیسے اسے زندہ رکھے گا؟ اس پر نظر رکھ کر اسے صحیح اور غلط کی ملکی تدریس تو ممکن ہے؟ آخر اردو کی باگ ڈور جس کے ہاتھ میں ہو وہ تو عہد زبان وادب کا استاد ہے، کسی بھی اردو چینل کا پروگرام ہو اسے اردو کے اسٹیٹ اور عالمی ادارے سے ان کی جانچ کی اجازت ملے تبھی وہ پروگرام براڈ کاسٹ یا ٹیلی کاسٹ ہو۔ کیونکہ جان بوجھ کر یہ چھوٹی غلطی لگنے والی بہت بڑی غلط بات ہے۔ تمثیل نو اس کے لئے پورا ایک شمارہ نکالے بلکہ اس پر ملکی قانونی ترمیم ہو اور انٹرنیشنل سیمینار تک محدود نہ رہ جائے اردو کا کھانا پینا۔ گوشت تک، معاف کریں یہ جذباتی بات نہیں بلکہ اردو کا روز روز ہر جگہ قتل عام اور بے لباسی مجھ سے برداشت نہیں۔ چونکہ اردو نہ ہماری صرف مادری زبان ہے بلکہ روحانی زبان بھی ہے۔

☆ افضل بیگ، بنگلور: ماہنامہ تمثیل نو کا شمارہ ۸۔۷ بعنوان بیسویں صدی کے مدبر، مفکر، مولانا ابوالکلام آزاد۔ بذریعہ جناب محمد ہارون سیٹھ سلیم صاحب کے ہمیں ملا۔

اس شمارہ کا ہمیں اور ہمارے قارئین کو بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ظاہری و باطنی اعتبار سے اتنا حسین و خوبصورت رسالہ ملنے پر ساری بیزارگی دور ہوئی۔ مختلف عنوانات پر فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین، نظمیں پیاری پیاری غزلیں۔ یہ رسالہ اردو دنیا کا ایک گہر ریز و درافشاں جریدہ کہلانے کا مستحق بنا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو سلامت رکھے۔ آپ

کے درجات بلند فرمائے۔

☆ڈاکٹر رضوانہ پروین ارم، جمشید پور: بیسویں صدی کے مدبر و مفکر۔ مولانا ابوالکلام آزاد جن کی عالمانہ شخصیت پر یہ شعر حرف بہ حرف صادق آتا ہے کہ۔

تیرے علم ومحبت کی نہیں ہے انتہا کوئی نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز ہستی میں نوا کوئی

ایسی دانائے راز ہستی کے فکر و فن پر اتنا مبسوط و جامع تمثیل نو عنایت کرکے آپ نے وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور معلومات میں اضافے کئے ہیں۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح علمی و ادبی سرگرمیوں کا آئینہ ہے۔ تمام مشمولات عمدہ اور نہایت معیاری ہیں۔ رسالے کی مجموعی صحت و جسامت اردو کے روشن مستقبل کا اشاریہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آپ کا یہ رسالہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھا اور لاجواب ہے۔

☆ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچ: سہ ماہی تمثیل نو اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء کا نظر نواز ہوا۔ شمارہ بے حد اہم اور معلوماتی ہونے کے ساتھ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر تمام گراں قدر معلومات اور بصیرت افروز مقالات اور مضامین کی وجہ سے اس شمارے نے امتیازی شان حاصل کی ہے۔ گوشۂ آزاد کے علاوہ زیر نظر شمارہ میں تمام نظمیں، غزلیں افسانے اور اچھی کتابوں پر اچھے تبصرے اس کے معیار کو بلند کرتے ہیں۔ آپ کو تمام اچھے قلمکاروں کا تعاون حاصل ہے۔ یہ آپ کے علم وفن آپ کے بلند اخلاق کا ثمرہ ہے۔ میری جانب سے مبارکباد پیش ہے قبول فرمائیں۔ اسی شمارہ سے معلوم ہوا کہ آپ کو عمرہ کا شرف حاصل ہوا۔ ہم سب کی جانب سے مبارکباد، اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین صحت عطا فرمائے اور تمثیل نو کا معیار مزید بلند کرے۔ آمین

☆محمد فرحت حسین خوشدل، ہزاری باغ: تمثیل نو کا تازہ شمارہ (اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء) اپنے تمام سابقہ شماروں کی طرح دستاویزی صورت میں موصول ہوا۔ اس شمارے میں بھی آپ نے گزشتہ معیار کو قائم رکھا ہے۔ اس شمارے میں کئی اہم تحریر کا میں نے بنظر غائر مطالعہ کیا۔ جن کو پڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کے کئی اہم گوشے روشن ہوئے۔ سب سے اہم تحریر ڈاکٹر عقیل ہاشمی کی ہے۔ جس میں مولانا آزاد اور علامہ اقبال کی معاصرانہ چشمک پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے نزدیک علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کی شخصیتیں مہتم بالشان اور قابل احترام ہیں لیکن ابوالکلام آزاد کی علامہ اقبال سے بے اعتنائی مبنی بر انصاف نہیں کہی جاسکتی۔

دوسرا اہم مضمون پروفیسر عبدالواسع کا ہے جس میں مولانا آزاد کو ایک عظیم نثار کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن مبالغہ کی تمام حدوں کو پار کرتے ہوئے موصوف نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر بالغ النظر قاری کی نظر رک کر اس کا محاسبہ ضرور کرے گی۔

پروفیسر مجید بیدار، ایم اے ضیاء، ڈاکٹر ارشد جمیل، ڈاکٹر محمد ظفر الدین اور ڈاکٹر امام اعظم کے جامع مضامین کو پڑھ کر راقم الحروف کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا ہے۔ اس کا اعتراف میں کرتا ہوں۔ موخر الذکر مضمون کی جدت آفرینی دل خوشدل کو بھائی۔ مختصر یہ کہ مولانا آزاد پر یہ خصوصی شمارہ ایسا ہے جس کے تمام مضامین کو کئی بار پڑھا اور رسالہ کے بقائے دوام کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔

''مجھے کچھ کہنا'' کے تحت آپ اتنی معلومات فراہم کرادیتے ہیں کہ روداد دوستاں کی مکمل لفظی ویڈیو گرافی سے محظوظ ہوجاتا ہوں۔ ڈاکٹر مسلم شہزاد کی حمد پڑھ کر روحانی کیف و سرور سے دوچار ہوا۔ البتہ ڈاکٹر مسعود جعفری کی نعت کی ردیف

''اس نے'' پر نظر رک سی گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ''اس'' ''جس'' ''تم'' ''تیرا'' ''تمہارا'' وغیرہ ضمائر سے مخاطب کرنا میری دانست میں آپؐ کی ذات اقدس کے شایان شان نہیں۔ باخدا دیوانہ باشد، با محمد ہوشیار

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کے تمام تبصرے تجزیاتی نوعیت کے ہیں۔ گزشتہ شمارہ پر ان کا طویل مگر جامع تبصرہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت پسند آیا۔ مرزا رفیق شاکر کی نثری تخلیق پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ دور حاضر میں اکثر یہی ہوتا ہے جو رفیق شاکر نے لکھا ہے۔ شعری حصہ بھی خوب ہے۔ رفیق شاکر نے ''تمثیل نو'' اور آپ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ محمد سالم نے پروفیسر ایم۔ ضیا اور پروفیسر منصور عمر صاحبان کی نظموں کا انگریزی میں خوب خوب ترجمہ کر کے اس کا حق ادا کیا ہے۔

☆ **گلشن کھنہ، لندن:** ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ بڑا دیدہ زیب اور معیاری ہے۔ اس میں شامل مولانا ابوالکلام سے متعلق تمام مضامین علمی، ادبی اور معلوماتی ہیں۔ مولانا آزاد واقعی علم و دانش کے پیکر تھے۔ اتنا خوبصورت پرچہ شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ اس شمارہ میں محترم رفیق شاہین نے لندن کے مجاہد اردو ڈاکٹر ودیا ساگر آنند پر بڑا جامع مضمون تحریر کیا ہے۔

☆ **تشنہ اعجاز، خیر آباد، بگہا، مغربی چمپارن:** اس بار کا شمارہ ۷۔ ۸ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر تھا۔ آپ نے ایک نئے انداز سے ان پر مضمون لکھوا کر کمال کر دیا۔ مولانا آزاد، غالب، اقبال پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ پڑھنے کو ملتا رہا ہے۔ جس سے طبیعت ایک طرح سے بھر گئی ہے۔ مگر اس جہت پر جو نئی طرح کی فکر انگیز باتیں پڑھنے کو ملی ہیں۔ یہ آپ کی مدیرانہ صلاحیت کی دین ہے۔ شروع میں حمد باری کے تحت ڈاکٹر مسلم شہزاد نے جو نذرانہ عقیدت بارگاہ الٰہی میں پیش کیا ہے یہ ان کا ہی فن کمال ہے۔ باری تعالیٰ سے جو ان کی عقیدت ہے اس کا ہر ہر شعر اس کا ثبوت ہے۔ خصوصی طور پر اس حمد کو پڑھنے کے بعد ایک سکون اور راحت کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اس بار کے شمارے میں میری چھپی تخلیق 'باتیں ان کی یاد رہیں گی' پر ملک کے بیشتر حصوں سے پسندیدگی کے لئے خط موصول ہوئے اس سے تمثیل نو کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سید منظر امام صاحب کی سرگزشت پڑھنے کے بعد امیر منزل کو دیکھنے کو دل بار بار چاہتا ہے دیکھئے یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے۔ آنجہانی ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ کا مولانا آزاد اور تقسیم ہند۔ ایک تاریخی اور مستند ریکارڈ ہے۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی کا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال پڑھنے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ابوالکلام آزاد اور زلیخا بیگم پر جو عالمانہ مضمون لکھا ہے اور خاندانی شجرے کے حوالے سے قاری کو ایک بیش بہا اور انمول تحفہ دیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص صلاحیت ودیعت کی ہے۔ خدائے کریم نے انہیں ایسی صلاحیت سے بطور خاص نوازا ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھائیں اس کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ اگر ان سے تاریخ اسلام۔ تاریخ ہند، تاریخ ادب اردو پر لکھوایا جائے تو یقین جانئے کہ یہ معجزہ بھی ان کے قلم سے ظہور پذیر ہو جائے گا۔ آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد پر فرانسیسی طرز کی انشاپردازی سے جو افکار پیش کئے ہیں وہ غور سے پڑھنے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے سات سمندر پار کا ہم عصر اردو ادب۔ تمثیل نو پر بھرپور اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ناقدانہ انداز کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے قاری کو اس شمارے کو بار بار پڑھنے اور دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ خدا معلوم کیوں؟ انہوں نے اس شمارے میں ناچیز کی چھپی تخلیق 'باتیں ان کی یاد رہیں گی' کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کے قلم

سے نکلا ایک ایک لفظ ہمارے لئے حرزِ جاں ہوتا ہے۔ اس بار بطور مخصوص شاعر ڈاکٹر محسن جلگانوی کو آپ نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے غزل میں اپنا ایک الگ اور مخصوص انداز قائم رکھا ہے۔ اس شمارے میں ان کی چھپی دونوں غزلیں اچھی ہیں۔ خاص طور پر یہ شعر : جس شخص کی دہلیز پر بچے نہیں آتے ، سنتے ہیں اس کے گھر میں فرشتے نہیں آتے ۔ پوری غزل متاثر کرتی ہے۔ اس طرح کی شاعری ہمیشہ پسند کی جائے گی۔

سنا ہے کہ اس شمارے میں فیض الحسن صاحب بھی شامل ہیں آپ نے ان سے لکھوا ہی لیا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے نثر و نظم دونوں کی بھرپور صلاحیت عطا کی ہے ان کا اسلوب ستھرا ستھرا اور نکھرا نکھرا سا ہے۔ یہ خوبی بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جیسے احمد ندیم قاسمی، ندا فاضلی، زبیر رضوی وغیرہ۔ اس بار کے شمارے میں کچھ مضامین فلم پر بھی ہیں۔ شاید آپ نے فلم کے لئے بھی کچھ لکھوائے ہیں۔ فلمی دنیا میں جن لوگوں نے عشق کیا اس میں دلیپ کمار کا عشق کافی مہنگا رہا ہے۔ جس زمانے میں ان کا عشق فلم اداکارہ کامنی کوشل سے چلا وہ بڑا یادگار رہا۔ کامنی کوشل کے اس عشق سے عاجز آ کر گھر والوں نے ان کے بہنوئی مسٹر سود جو کہ بحریہ میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے، بہن کے مر جانے کے بعد ان سے منسوب کر دیا۔ مگر اس کے باوجود کامنی کوشل دلیپ کمار سے اپنی محبت بھلا نہ سکیں۔ وہ بے خطر آتش عشق میں کود پڑیں۔ بمبئی میں گھر سے چپکے سے غائب تمام شب آتش عشق کو سرد کرتیں۔ آخر گھر والوں نے انہیں دلی مسٹر سود کے پاس بھجوا دیا۔ خاں صاحب نے اس کا بھی حل نکال لیا اگرچہ وہ حل بڑا مہنگا رہا ۔ روزانہ ایک جہاز چارٹر کرا کر ایک صحافی سے اپنے عشقیہ مراسلے بھجواتے ۔ وہ صحافی دلی جاتے اور پھر خط پہنچا کر جواب خط لے کر اسی جہاز سے واپس بمبئی آتے یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلا۔ ہزاروں روپے روزانہ خرچ ہوتے۔ آخر عاجز آ کر ایک دن مسٹر سود نے قسم کھا کر گولی مار دینے کو خاں صاحب کے لئے کہا تب خاں صاحب کی محبت کی خاطر اور ان کی جاں بخشی کے عوض یہ آتش عشق سرد ہوا۔ ویسے لگتا ہے کافی دنوں تک یہ لوگ موقع ملنے پر فیضیاب بھی ہو لیتے تھے۔ جب عطاءاللہ خان نے جو مدھوبالا کے والد تھے خاں صاحب پر مقدمہ دائر کیا تو کورٹ میں دلیپ کمار نے اجلاس میں سرِعام کہا کہ جج صاحب میں اپنی محبت کا اقرار کرتا ہوں۔ اگر محبت کرنا جرم ہے تو میں سزا کے لئے حاضر ہوں۔ دلیپ صاحب کے بارے میں ایک مضمون میں مشہور گیت کار گلزار نے لکھا ہے کہ جب فلم سنگھرش بن رہی تھی اس فلم کے مکالمے اور کہانی گلزار صاحب کے ہی تھے۔ ایک مکالمے کے ریہرسل کے وقت میں گھبرا سا گیا۔ جب خاں صاحب نے ایک مکالمے کے ریہرسل کے وقت میرے دونوں کاندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا دیکھو میں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے تمہیں لیلا آسمان بنا دیا۔ میری اس محبت کو دیکھو۔ تو میں سمپورن سنگھ گلزار باہوش و حواس اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ اس وقت میری عصمت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ آپ جس لگن اور محنت سے تمثیل نو نکال رہے ہیں اس سے تمثیل نو عالم گیر شہرت کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔

☆ **رشید حسین منظر**، چیئرمین اردو کمیٹی، لندن: ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ایک طویل مدت کے بعد موصول ہوا۔ شکریہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا گوشہ اور صوبہ کے بہت سے لکھنے والوں کی تحریریں دیکھ کر بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں۔ شمارہ دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت تحریروں سے پر ہے۔

☆☆☆

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

Maulana Azad National Urdu University

(A Central University Established by an Act of the Parliament in 1998)

Gachibowli, Hyderabad 500 032,

نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیشن کونسل سے بحیثیت "اے گریڈ" تصدیق شدہ

اعلان برائے داخلہ

مراسلہ نمبر: MANUU/Acad/F.158/2010-11 (v.3) مورخہ: 4/مئی 2010ء

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے تعلیمی سال 11-2010 کے لیے درج ذیل اردو میڈیم کورسس (روایتی طرز تعلیم) میں داخلوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

کورسس	
ایم اے: i. اردو، ii. پرشین، iii. عربک، iv. ہندی، v. انگریزی، vi. ٹرانسلیشن اسٹڈیز ☆ vii. پبلک ایڈمنسٹریشن، viii. ویمن اسٹڈیز، ix. ماس کمیونیکیشن اینڈ جرنلزم ☆ ماسٹر آف سوشیل ورک ماسٹر آف بزنس اڈمنسٹریشن ☆ ماسٹر آف ایجوکیشن ☆ بیچلر آف ایجوکیشن ☆ ڈپلوما ان ایجوکیشن ☆ پی۔جی ڈپلوما پروگرامس: i. انفارمیشن ٹکنالوجی ☆ ii. فنکشنل اردو ڈپلومہ پروگرامس: i. عربک ii. عربک ٹرانسلیشن iii. پرشین	ایم فل ☆: i. اردو، ii. ہندی iii. انگریزی، iv. پبلک ایڈمنسٹریشن، v. ویمن اسٹڈیز vi. سوشیل ایکسکلوژن اینڈ انکلوزیو پالیسی، vii. عربک پی ایچ ڈی ☆: i. اردو، ii. انگریزی، iii. ہندی iv. ویمن اسٹڈیز v. پبلک ایڈمنسٹریشن، vi ایجوکیشن پالی ٹکنیک پروگرامس ☆: (i. سیول انجینئرنگ، ii. کمپیوٹر انجینئرنگ، iii. الکٹرانک اینڈ کمیونیکیشن انجینئرنگ، iv. انفارمیشن ٹکنالوجی) سرٹیفکیٹ پروگرامس: i. خوش خطی ii. تحسین غزل
☆ داخلہ بذریعہ انٹرنس ٹسٹ	

پراسپکٹس اور درخواست فارم یونیورسٹی کیمپس، گچی باؤلی حیدرآباد 032 500 یا یونیورسٹی کے ریجنل وسب ریجنل سنٹرس اور کالج آف ٹیچر ایجوکیشن پر 10/مئی 2010ء سے دستیاب رہیں گے۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر بعوض -/100 روپے ڈیمانڈ ڈرافٹ یا بذریعہ ڈاک 150 روپے کے ڈیمانڈ ڈرافٹ کی ادائیگی کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ڈیمانڈ ڈرافٹ کسی قومیائے ہوئے بینک سے "مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی" کے حق میں حاصل کردہ ہو اور حیدرآباد میں ادا شدنی ہو۔ پراسپکٹس اور درخواست فارم یونیورسٹی کے ویب سائٹ http://www.manuu.ac.in سے بھی ڈاؤن لوڈ کیے جاسکتے ہیں۔ ایس سی/ایس ٹی اور دیگر پسماندہ طبقات کے لیے تحفظات حکومت ہند کے اصول وضوابط کے مطابق ہوں گے۔ درخواست فارم اور پراسپکٹس کی اجرائی اور پُر کردہ درخواستوں کے ادخال کی آخری تاریخ 18/جون 2010ء مقرر ہے۔ پروگرامس کی تفصیلات پراسپکٹس میں موجود ہیں۔ حسب گنجائش ہاسٹل کی سہولت بھی مہیا کی جائے گی۔ پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو فنڈس کی دستیابی کی صورت میں ماہانہ 1000 روپئے کی اسکالرشپ دی جائے گا۔ مزید تفصیلات جیسے داخلے کے لیے درکار اہلیت، علاقائی مراکز/ذیلی علاقائی مراکز اور کالجس آف ٹیچر ایجوکیشن کے پتے یونیورسٹی کے ویب سائٹ سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

مورخہ: 4/مئی 2010

رجسٹرار انچارج

ساہتیہ اکیڈمی کی ایک یادگار تصویر
(دائیں سے) ڈاکٹر سیفی سرونجی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر امام اعظم اور نظام صدیقی

۱۸ر فروری ۲۰۱۰ء کو ریجنل سنٹر، دربھنگہ کی ایک یادگار تصویر: (دائیں سے) حیدر وارثی، ڈاکٹر امام اعظم، پی ایس منور حسین، پروفیسر وہاب قیصر، ڈاکٹر ارشد جمیل، ڈاکٹر منصور عمر، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، شمیم فاروقی، شکیل احمد سلفی

۷ر فروری ۲۰۱۰ء کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتہ میں منعقدہ سیمنار میں مقالہ پڑھتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم

BIHURD00640/04/1/2005-T.C.
Monthly **TAMSEEL-E-NAU**
Vol-10, issue:0910

Rs.50/-
Jan -Sept 2010
Tel:06272-258755
Cell: 09431085816

Hony Editor: **Dr.Imam Azam**
Qilaghat, Darbhanga-846004 (Bihar)
E-mail: imamazam@webdunia.com

'مبارک ہو مانو کے وی سی بنے'۔۔۔۔۔ پروفیسر محمد میاں

(نامور ماہر تعلیم پروفیسر محمد میاں جو ملک کی معروف دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبۂ مطالعات تعلیمات میں پروفیسر، مرکز برائے پیشہ ورانہ فروغ اردو اساتذہ کے ڈائرکٹر اور ارجن سنگھ سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ اوپن لرننگ کے اعزازی ڈائرکٹر کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں۔ آپ ۱۴رمئی ۲۰۱۰ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے تیسرے وائس چانسلر کے عہدہ پر متمکن ہوئے ہیں۔ موصوف کی دانشورانہ شخصیت، تعلیمی و انتظامی مہارت اور عالمی شہرت اس یونیورسٹی کے لئے یقیناً ایک تناور درخت بنے گی جس کے سایہ میں اردو زبان کے فروغ کو ایک نئی سمت ملے گی۔ یہ خبر بھی خوش آئند ہے کہ انہوں نے ۱۵/ جون ۲۰۱۰ء کو ایفلو کے انچارج وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا ہے۔)

بڑے علم داں ہیں محمد میاں — بہت خوش بیاں ہیں محمد میاں
جہاں بارشِ علم ہوتی ہے وہ — کھلے آسماں ہیں محمد میاں
ہیں یو پی کے شہر بدایون کے — وہ اہل زباں ہیں محمد میاں
مبارک ہو 'مانو' کے وی سی بنے — اس عہدہ کی جاں ہیں محمد میاں
بڑی تیز رفتار ہے اُن کی سوچ — اک سیلِ رواں ہیں محمد میاں
بدل دیں گے مانو کی تصویر کو — وہ مردِ جواں ہیں محمد میاں
علی گڑھ کی تعلیم رنگ لائے گی — وہاں کے نشاں ہیں محمد میاں
فضا میں بھی فصلِ بہاراں رہے — غضب باغباں ہیں محمد میاں

جہاں پر گماں کا سفر ہو تمام
اے اعظم وہاں ہیں محمد میاں

........ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ (بہار)